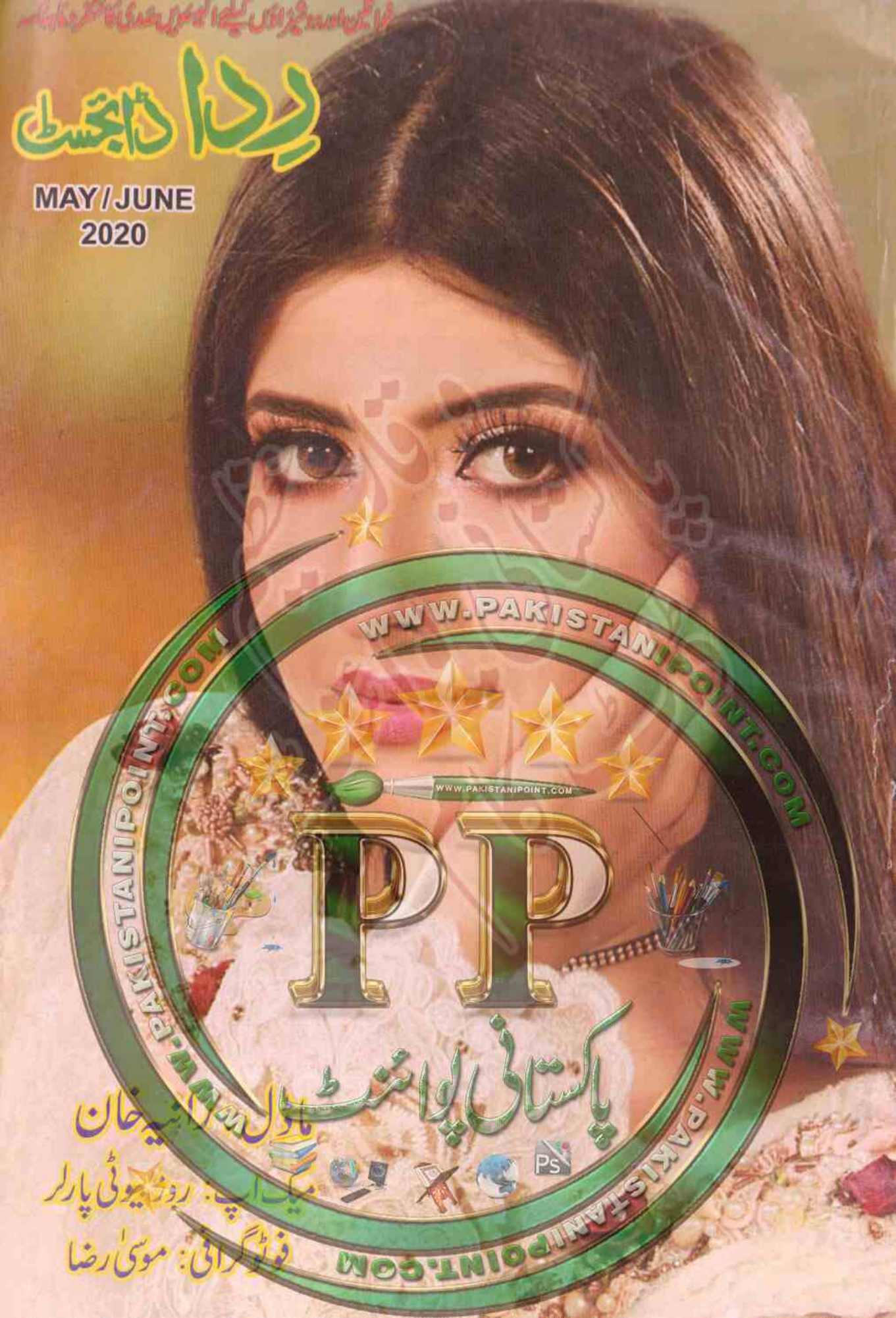

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

رِدا ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ
رِدا ڈائجسٹ
۱۲۹-ڈی-بلاک ۲
پی-ای-سی-ایچ-ایس
کراچی

چیف ایڈیٹر
صالحہ محمود

ایڈیٹرز
سعدی محمود جعفری، بلال جعفری
نمائندہ امریکہ، فراز جعفری
E-Mail : frazjafri@aol.com
نمائندہ UAE، عمیر علی جعفری
E-Mail : searchit@emirates.net.ae
نمائندہ لندن، شبانہ آصف خان
: جنید انصار

گوشہ آگہی — صالحہ محمود — ۶

سلسلے وار ناول

بانہوں کے حصار میں	قمروش شہک	۱۰
میں مسیحا	ایقان علی	۷۶
دل ہے آوارہ	عائشہ ذوالفقار	۹۴
ہم ہار گئے جاناں	سیما شاہد	۱۴۴
خوشبو ہے کہ تم ہو	سباس گل	۱۷۶

مکمل ناول

تیری محبتوں میں رہنا ہے	عائشہ ذوالفقار	۴۲
تیرے نام لکھ دی زندگی	امبر فاطمہ	۱۱۶

افسانے

جنشن وائلٹ	لبنیٰ جمشید	۳۸
مات	سدرہ چودھری	۶۷
حرف شکایت تمام شد	کنیز زہرا	۸۹
ڈھلتی شام	ستارہ احمد	۱۰۸
سیاہ معاشرہ	زرقا بھٹی	۱۴۲
پتھر کی لڑکی	فرح انیس	۱۹۰

مئی، جون 2020ء
جلد نمبر 25 شمارہ نمبر 6
قیمت 100 روپے

E-mail: monthlyreda0325@gmail.com

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
1200 روپے

پبلشر و ایڈیٹر صالحہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۲۹/ڈی بلاک۔2۔پی-ای-سی-ایچ-سوسائٹی، کراچی

34535726

انتباہ:-
ماہنامہ "ردا" ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل یا ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کرادے گا اس لیے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "ردا پبلیکیشن"۔

مستقل سلسلے

ردائے جنت	صالحہ محمود	۷
ردا کی ڈائری	صدف سعد	۲۰۲
ذرا پھر سے کہنا	نورین ملک	۲۰۹
خوشبو	تسنیم شریف	۱۹۸
اس ماہ میں	تسنیم شریف	۲۰۵
کچن	ثریا اقبال	۲۲۱
سنگھار	شہلا مشائق	۲۲۵
اشعار	حورینہ	۲۱۸
سندیسے	صالحہ محمود	۲۱۳

WWW.PAKISTANIPOINT.COM

گوشۂ آپی

صالحہ محمود

عید سے دو روز قبل یعنی 22 مئی کو پی آئی اے طیارے کا المناک حادثہ اس عید کو سوگوار کر گیا اگرچہ چھ ماہ سے موجود کرونا کی وبا نے پہلے ہی دنیا بھر کو بری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ کاروبار زندگی معطل ہے۔ کچھ لوگ اسے خدا کا عذاب اور کچھ حیاتیاتی ہتھیار قرار دے رہے ہیں مگر اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ چاہے یہ خدا کا عذاب ہو یا انسان کے ہاتھوں لائی ہوئی مصیبت، اس نے ہماری معاشی اور سماجی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اس پر مستزاد فضائی حادثے نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اللہ کی رضا کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ المناک حالات و واقعات بھی منافع خور مافیا کے ذہن و قلب کو متاثر نہ کر سکے۔

لاک ڈاؤن کے باعث صرف دیہاڑی دار افراد ہی نہیں بلکہ سفید پوش طبقہ بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔ بہت سے لوگوں کی نوکریاں چلی گئیں۔ اداروں کی بندش کے باعث بے روزگاری اور غربت میں اضافہ ہوا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس نازک وقت میں مل جل کر اس اجتماعی مصیبت سے نمٹنے کی کوئی تدبیر کی جاتی مگر ناجائز منافع خوروں کے دل سے شاید خوف خدا بالکل ہی نکل گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عید پر مہنگائی کا جن بالکل ہی بے قابو ہو گیا۔ تمام روزمرہ کی اشیائے ضروریہ کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ کہا جا رہا ہے کہ اس وبا کے بعد دنیا بالکل بدل جائے گی۔ ہو سکتا ہے بدل جائے مگر پاکستان میں منافع خور مافیا نہ بدلی ہے نہ بدلے گی کیوں کہ وائرس کو شکست دی جا سکتی ہے مگر انسانی ہوس اور لالچ کو نہیں۔

اس کی ایک مثال تو چینی اسکینڈل ہے۔ اب یہ بات کوئی راز نہیں رہی کہ اس بہتی گنگا میں کس کس نے ہاتھ دھوئے اور کس کس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ اگرچہ حکومت نے چینی اسکینڈل کی رپورٹ شائع کر کے ایک جرأت مند قدم اٹھایا ہے، جس کی تعریف و تحسین میں وزراء دل و جان سے مصروف ہیں مگر صرف اسے شائع کرنا کافی نہیں۔ حکومت کا اصل امتحان تو یہ ہے کہ تمام ذمہ داروں کو انصاف کے کٹہرے میں لائے اور بلا امتیاز تمام مجرموں کے ساتھ قانون کے مطابق معاملہ کرے۔ چاہے چینی اسکینڈل ہو، آٹے کا بحران ہو، قومی خزانے پر ہاتھ صاف کرنے والوں کا گریبان پکڑنا ہو یا فضائی حادثات کے اصل ذمہ داروں کا تعین ہو، حکومت اس وقت قابل ستائش ٹھہرے گی جب وہ غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے انصاف کا پرچم تھامے گی۔ حقائق سامنے لانا اچھی بات ہے مگر یہ نتیجہ خیز اس وقت ثابت ہوں گے جب تمام منفی کردار اپنے انجام کو پہنچیں گے۔

ہماری رائٹر گیتی آراء کے شوہر کا رضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

لاک ڈاؤن کے باعث اگر قارئین کو پرچے کے حصول میں مشکلات پیش آ رہی ہیں تو آپ فی شمارہ 80 روپے کے حساب سے جون تا دسمبر ادارے کے پتے پر 560 روپے بھیج دیں۔ شمارہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

لاک ڈاؤن کے باعث اپریل کا پرچہ شائع نہ ہو سکا تھا اب اس پرچے کو اپریل، مئی اور جون کا مشترکہ شمارہ سمجھ لیں۔ دعا کریں کہ جلد حالات سازگار ہوں تاکہ ہمارا اور آپ کا یہ رابطہ برقرار رہے۔

قارئین بانہوں کے حصار میں اختتام پذیر ہوا ہے ردا کی روایت کے مطابق دوسرے سلسلہ وار ناول شروع کر دیے ہیں۔ اس بار آپ سباس گل اور سیما شاہد کو پڑھیے اور رائے دیجیے۔ امید ہے یہ دونوں بھی آپ کے معیار پر پورے اتریں گے۔

آپی

ردائے سنّت

صالحہ محمود

اسلام دین کامل اور ابدی ضابطہ حیات ہے۔ اس کی تعلیمات ہر شعبۂ زندگی میں انسان کی راہ نمائی کرتی ہیں۔ ''دیانت و امانت'' اسلامی طرز معاشرت میں ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق ''اس کا ایمان نہیں جسے امانت کا پاس و لحاظ نہیں۔'' چنانچہ دیانت و امانت کا پاس و لحاظ اور امانت داری ایمان کا حصہ ہے جو شخص اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اگر میں نے کسی کا حق دبا لیا یا اس کی ادائیگی میں کمی اور کوتاہی کی تو میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔ وہ یقیناً اس کا حساب لے گا اور اس دن جب کہ ہر شخص ایک ایک نیکی کا محتاج ہو گا، حق تلفی کے عوض میری نیکیاں دوسروں کو تقسیم کر دی جائیں گی۔ میری نیکیاں دوسروں کو تقسیم کر دی جائیں گی۔ پھر میری مفلسی پر وہاں کون رحم کرے گا؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت داری کو ایمان کی علامت اور پہچان قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ ''جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدے کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔ (سنن بیہقی)

اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم کے متعدد مقامات پر امانت داری کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ترجمہ: ''تو جو امین بنایا گیا اسے چاہیے کہ اپنی امانت ادا کرے اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔ (سورۃ البقرۃ 283) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں امانت داری کو تقویٰ سے جوڑ دیا ہے یعنی جسے موت کے بعد کی زندگی، حساب و کتاب اور عدالت الٰہی پر یقین ہو۔ جس کے دل میں خوف خدا اور اس کی گرفت کا احساس ہو اسے چاہیے کہ امانت میں خیانت نہ کرے۔ جس کا جو حق ہے پورا پورا ادا کر دے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی ہے کہ زمانہ قیامت سے جیسے جیسے قریب ہو گا ایمانی قوت کم ہوتی چلی جائے گی۔ اس کے نتیجے میں امانت داری بھی اٹھ جائے گی اور حال یہ ہو گا کہ مسلمانوں کی بڑی آبادی ہو گی مگر امانت دار بندہ پوری آبادی میں ایک آدھ بڑی مشکل سے دستیاب ہو گا اور وہ بھی حقیقت میں امین نہ ہو گا۔ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے آدمی کی تعریف ہو گی کہ کیسا عقل مند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے۔ حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان داری نہ ہو گی۔'' (صحیح بخاری، کتاب الفتن)

امانت داری کی اس قدر اہمیت کے باوجود آج کے معاشرے میں اسے کوئی وزن نہیں دیا جاتا، اچھے اچھے لوگ بھی جو عرف میں دین دار سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی امانت اور حق کی ادائیگی کا پاس و لحاظ نہیں رکھتے، انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ امانت کی حفاظت اور اس کا مکمل طور پر ادا کرنا دینی و شرعی فریضہ ہے۔ بعض لوگوں میں امانت داری کا جذبہ ہوتا بھی ہے تو وہ صرف مال کی حد تک محدود رہتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کسی کا مال رکھا ہو تو وہ اسے ادا کر دیتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کا ذہن اسی مالی امانت کی

طرف جاتا ہے حالانکہ امانت کی اور بھی مختلف قسمیں ہیں جن کی اہمیت بعض صورتوں میں مالی امانت سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کی حفاظت بھی ایک مسلمان کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی مالی امانت کی ہوتی ہے، اسی لیے فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ کی کنجی جب عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کو دینے اور ان کی امانت انہیں واپس کرنے کی تاکید کی گئی تو امانت کو جمع کے صیغے کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ ارشاد باری ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچا دیا کرو۔'' (سورۃ النساء: 58) قابل غور بات یہ ہے کہ کنجی کوئی اہم مال نہیں، بلکہ یہ خانہ کعبہ کی خدمت کی نشانی ہے جس کا تعلق مال سے نہیں، عہدے سے ہے پھر بھی اسے امانت سے تعبیر کیا گیا اور پھر جمع کا صیغہ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ امانت کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جن کی ادائیگی تمام مسلمانوں پر لازم ہے۔

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ جس عہدے اور منصب کا جو اہل ہو، اس کے سپرد وہی عہدہ کیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے غور کرنا چاہیے کہ اس کے ماتحتوں میں کون ایسا شخص ہے جس میں پیش نظر ملازمت یا عہدے کی مکمل شرطیں پائی جا رہی ہیں۔ ایسا کوئی شخص مل جائے تو وہی اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے لہٰذا کسی پس و پیش کے بغیر وہ عہدہ اور ملازمت اس کے سپرد کر دی جائے اور اگر مطلوب صلاحیت کا حامل کوئی شخص دستیاب نہ ہو تو موجودہ لوگوں میں جو سب سے زیادہ لائق و فائق ہو، اسے منتخب کیا جائے۔ غرض یہ کہ حکومت کے ماتحت جتنے بھی عہدے اور مناصب ہوتے ہیں وہ امانت ہیں اور ارباب حکومت اس کے امین ہیں۔ اگر حکومت نے اپنے ماتحت کسی شخص کو اس کا مجاز بنایا ہے تو وہ بھی امین ہے، ان سب کو چاہیے کہ عہدے اور منصب پوری دیانت داری سے تقسیم کریں۔ صلاحیت اور شرائط کو اس کے لیے معیار بنایا جائے نہ کہ قرابت اور تعلق کو۔ اگر کسی شخص کو ذاتی تعلق یا سفارش کی بنیاد پر یا رشوت لے کر کوئی عہدہ اور منصب سپرد کیا جاتا ہے تو یہ خیانت ہے اور تمام ذمے دار اس خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ ایک موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمے داری سپرد کی گئی ہو، پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کے پیش نظر دے دیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔'' (مجمع الفوائد: ص 335)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب دیکھو کہ کاموں کی ذمے داری اپنے لوگوں کو سپرد کر دی گئی جو ان کے اہل اور قابل نہیں تو قیامت کا انتظار کرو۔'' (صحیح بخاری) یعنی جب نااہل افراد کو کوئی ذمے داری یا عہدہ اور منصب سپرد کیا جائے تو فساد یقینی ہے اور اب دنیوی نظام کو فساد سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اس لیے اب قیامت کا انتظار کرو۔ اس میں خلافت سے لے کر ایک ادنیٰ ملازمت بھی شامل ہے۔ اس خیانت کا تعلق صرف حکومت اور سرکاری عہدوں سے ہی نہیں بلکہ نجی کمپنی، انجمن اور عوامی اداروں سے بھی ہے۔

جو شخص کسی کا مزدور یا ملازم ہو اسے چاہیے کہ مالک اور ذمہ دار سامنے ہو یا نہ ہو مکمل دیانت داری کے ساتھ کام کرے، نہ تو وقت میں کمی کرے اور نہ کام میں سستی اور نہ ہی اپنی صلاحیت کو استعمال کرنے سے گریز کرے۔ ان تینوں میں سے کچھ پایا گیا تو خیانت شمار ہو گی۔ اسی طرح اگر مزدور و ملازم سے پانچ چھ گھنٹے کام کرنے کا وقت طے ہو جائے اور پھر کام کرنے والا وقت میں چوری کرے، وقت کے بعد آئے یا متعین وقت سے پہلے چلا جائے تو یہ بھی خیانت ہے۔ ☆☆ (بشکریہ: مفتی محمد نعیم صاحب)

قمروش شہک

بانہوں کے حصار میں

''بیٹا! ابھی سائیں صرف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' رحمت اس کے ڈر کو سمجھتی تھی کہ وہ اگر خوف زدہ ہے تو اس کی بھی وجہ ہے۔ اس نے سالار شاہ کے ظلم برداشت کیے ہیں۔ وہ سالار شاہ جو غرور اور ظلم کا دوسرا نام تھا۔ وہ سالار شاہ جس نے فرعونیت اور بربریت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ مگر کل کے اور آج کے سالار شاہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کوئی اور کہتا کہ سالار شاہ بدل چکا ہے۔ اس کا غرور گھمنڈ سب مٹی میں مل چکا ہے تو وہ کبھی یقین نہیں کرتی

کیونکہ رحمت جانتی تھی کہ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے تو نکل سکتا ہے مگر سالار شاہ کبھی نہیں بدل سکتا۔ مگر یہ سوچ غلط ثابت ہوئی۔

سالار شاہ اب وہ نہیں رہا تھا اور جب رحمت نے سالار شاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اپنے کانوں سے سنا تو یقین بھی آ گیا اور یہی بات کب سے اربش کو رحمت اور انشراح سمجھا رہی تھیں مگر وہ کسی صورت ماننے کو راضی نہیں تھی۔ اس کا خوف اس کی آنکھوں اور چہرے سے ہی نہیں اس کے ہر ہر عضو سے ٹپک رہا تھا۔ وہ آج بھی اپنی ذات کے خول میں قید تھی۔

''رحمت بوا!'' بھیگی آنکھیں کانپتے لبوں سے ایک ہی التجا، ایک ہی فریاد رحمت کو اس پر ترس ہی نہیں بہت پیار بھی آیا۔ اس نے اربش کو اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔

آخری قسط

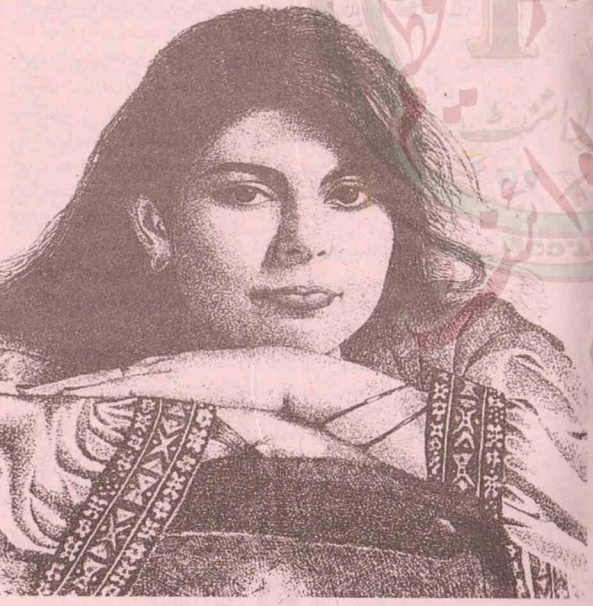

”اربش! میں نے سالار بھائی کی آنکھوں میں تمہارے لیے پیار دیکھا ہے۔ چاہت دیکھی ہے۔“ انشراح اس کے دوسرے سائیڈ آکر بیٹھ گئی۔

”میں ان سب کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ بس میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ مجھے...... مجھے...... ان کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ ان کی آہٹ سے میرا دل بند ہو جائے گا۔“ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

”اربش! تھوڑی سی ہمت کرو اور سنبھالو خود کو۔ سالار بھائی تم سے اور گڑیا سے ملنے آئے ہیں۔ بلکہ وہ تو......“ انشراح بے قراری سے مزید آگے کو کھسکی اور اربش کے لرزتے کپکپاتے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”گڑیا!“ اربش نے چونک کر رحمت کے سینے سے سر اٹھا کے انشراح کو دیکھا۔

”انشی!“ اربش نے انشراح کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ان کو بولو وہ گڑیا کو لے جائیں۔“

”مگر مجھے اپنی گڑیا کے ساتھ ساتھ اس کی ماں بھی چاہیے۔“

اچانک ہی بھاری اور گھمبیر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور بھلا اس آواز کو اربش کیسے نہیں پہچانتی، اس آواز نے تو اسے خوابوں خیالوں میں بھی خوف زدہ رکھا تھا۔ ہر ہر قدم وہ یوں سوچ کے رکھتی کہ اب اس کی نئی آزمائش، نئی سزا شروع ہونے والی ہے۔ اربش نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں دروازے پر ہی وہ روح کو فنا کرنے والا انسان ایستادہ تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اربش کی آنکھوں اور چہرے پر دہشت سی بڑھنے لگی۔ اس کے جسم پر ہی نہیں اس کی روح پر بھی لرزہ طاری ہونے لگا۔ اس کی سانسوں کی رفتار تھمنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔

انشراح نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو پریشان ہو گئی بلکہ ڈر گئی کہ اس کو کچھ ہو نہ جائے۔ انشراح نے سہمی سہمی نظروں سے سالار شاہ کو دیکھا...... سالار شاہ نے اشارے سے انشراح کو کہا کہ اس کی گود سے گڑیا کو لے کر خود باہر چلی جائے روم سے، وہ آج خود بات کرے گا۔ ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس سے ڈرتے چھپتے مگر اب وہ اربش کا ڈر خود اس کے سامنے آکر نکالے گا۔

انشراح نے ایک بار پھر اربش کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھی۔ سالار شاہ سے گلابی بستر میں سوتی گڑیا کو لیا اور روم سے باہر نکل گئی۔

سالار شاہ نے اب رحمت کو دیکھا۔ رحمت اس کی آنکھوں کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتی، اربش نے تیزی سے رحمت کا ہاتھ تھاما اور بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔

”نہیں رحمت بوا تم مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔“ سرگوشی میں کی گئی ڈری سہمی آواز سالار شاہ کی سماعت سے محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

”سائیں کا حکم ہے اربش بیٹی!“ رحمت نے آہستگی سے اس کو سمجھانا چاہا مگر وہ بس روتے ہوئے نفی میں اِدھر اُدھر گردن ہلا رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں بس یہی تھا کہ سالار شاہ اس کے لیے کوئی نئی سزا چن کے لایا ہے۔

بالآخر سالار شاہ کو ہی آگے بڑھنا پڑا۔ رحمت کا بھی اربش کے ساتھ ساتھ حلق خشک ہونے لگا تھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آنے لگا اربش کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ سی بڑھنے لگی تھی۔ اس کی انگلیوں کی گرفت رحمت کے بازو پر مزید سخت ہونے لگی تھی۔ سیاہ نینوں پر پہرا دیتی وہ سیاہ گھنیری پلکوں کی باڑ رخسار پر سجدہ ریز لرز رہی تھیں۔ سالار شاہ اس کی سوچوں کو پڑھتا اس کے مقابل آٹھہرا۔

وہ گرے کانچ اس معصوم چہرے سے ہوتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں پر جا ٹھہرے جن کی قید میں رحمت کا

بازو تھا۔

”رحمت کا بازو چھوڑو اربش۔“ اس حکم میں جو سختی تھی وہ اربش کو اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی۔ رحمت کی بھی سانسیں تھمنے لگی تھیں۔ کہیں ایسا نہ ہو سالار شاہ کو غصہ آجائے اور پھر وہ......

رحمت کے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں۔ اس نے کوشش کر کے آہستگی سے اربش کے ہاتھوں سے اپنا بازو چھڑایا اور تیزی سے نکلتی چلی گئی۔ اربش بھی اس کے پیچھے جانے لگی تھی کہ سامنے سالار شاہ کا پہاڑ جیسا وجود حائل ہو گیا۔

پیازی کلر کے کلف لگے کاٹن کے سوٹ میں دونوں ہاتھوں کو پشت پر باندھے وہ ایک انچ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ پرپل اینڈ پنک امتزاج کے سوٹ میں وہ پوری جان سے کپکپا رہی تھی جیسے ابھی زمین بوس ہو جائے گی۔ سالار شاہ کے سامنے آتے ہی اربش نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ سالار شاہ نے بغور اس کی کانپتی لرزتی انگلیاں دیکھی تھیں بلکہ جس طرح اس کا پورا وجود ہلکے ہلکے ہچکیوں کی زد میں کانپ رہا تھا سالار شاہ کو محسوس ہوا کوئی نقصان نہ ہو جائے اور سالار شاہ اب مزید کوئی نقصان نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ مزید اس نازک سے وجود کے قریب ہوا اور اپنی دونوں مضبوط آہنی بانہوں کا حصار اس کے اردگرد کھینچ دیا اور کتنے ہی لمحوں تک اس کو اپنے ہونے کا احساس دلایا تھا۔

”ادھر بیٹھو۔“ اربش اس کی نرم سی گرمائش پا کر بھی مطمئن اور پرسکون نہیں ہوئی تھی۔ اس کے اندر کا ڈر اور خوف ختم نہیں ہو پا رہا تھا۔

سالار شاہ نے اس کو بیڈ پر بٹھایا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی چوڑی ہتھیلیوں میں قید کر کے ہلکے ہلکے سہلانے لگا جس سے اربش کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنا اٹھی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ برف کی طرح ٹھنڈی پڑنے لگی ہو۔ یہاں تک اس کو ہلکی ہلکی سی سردی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ یہ سارے احساسات سالار شاہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکے تھے۔ سالار شاہ کو اپنے بیتے گزرے دنوں پر پچھتاوا ہونے لگا تھا۔ شرمندگی ہونے لگی تھی۔ اس کے غرور اور تکبر کی وجہ سے ایک نازک سی لڑکی اپنی ذات کے خول میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے اپنی انا اپنا اعتماد سب کھو دیا تھا۔ اپنے جذبات و احساسات کو جلتے مرتے دیکھا تھا۔ سامنے بیٹھا یہ نازک وجود اندر سے کسی لاش کی مانند ہے اور اس کو اس حال تک پہنچانے والا بھی تو وہ خود تھا۔

سالار شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور اس کا پیالہ بنا کر اس کے چہرے پر دھر دیا آہستگی سے اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا۔ کتنی مشکل سے وہ سیاہ گھنیری پلکیں اوپر کو اٹھی تھیں۔

آج ان گرے کانچ کا انداز بدلا تھا۔ آج احساس کچھ الگ ہی سے تھے، آج ان میں پیار کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ اس کل کائنات کا پیار تھا جو وہ اربش کو دینا چاہتا تھا۔ اپنی بانہوں کے حصار میں قید کر کے اس کو لیے بہت دور ایک ایسے جہاں میں لے جانا چاہتا تھا جہاں وہ اس کو اپنے پیار کا یقین دلا سکے۔ اپنا پیار نچھاور کر سکے۔

مگر ان سیاہ نینوں میں شرم کے، کوئی حیا کے رنگ نہیں تھے۔ سالار شاہ کے اس طرح چاہت لٹاتی نظروں سے دیکھنے پر وہ شرم سے نہیں بلکہ خوف سے سمٹنے لگی تھی۔ وہ سہمی سہمی خوفزدہ نگاہیں بار بار پلکیں جھپک کر سالار شاہ سے آزادی چاہتی تھیں۔ ان پیار لٹاتی نگاہوں سے چھپ جانا چاہتی تھیں۔

اربش پر اس وقت جو مشکل گھڑی تھی وہ سالار شاہ کی نرماہٹ کو محسوس ہی نہیں کر پا رہی تھی اور کرتی بھی کیسے اس

نے کبھی ایسا کوئی لمحہ اس کی جھولی میں ڈالا ہی کب تھا۔ کب کسی خوب صورت لمحے کی گرفت میں اس کو قید کیا تھا۔ کب اپنی نرم وگرم بانہوں کے گھیرے میں اس کو لیے خوابوں کے جہاں میں دور تک گیا تھا۔ کب اس کے دامن سے کوئی پرشوخ یا شریر سا جملہ باندھا تھا۔ کب اپنی نگاہوں کی گرمی سے اس کو کسمسانے یا لجھانے پر مجبور کیا تھا اور کب ایسی بے ساختہ بھری جسارتیں کی تھیں کہ شرم سے اس کی رنگت گلنار پڑنے لگتی۔

اس وقت تو اربش ان گرم نگاہوں سے خوف کے مارے سہمی جارہی تھی خود میں سمٹی جارہی تھی۔ مگر سالار شاہ مزید اس کے خوف وڈر کا امتحان نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ اس کا یہ ڈر یہ خوف نکالنا چاہتا تھا۔

''اربش!'' دھیمے سے مگر چاہت سے پکارا تھا۔ اربش بس سمندر بھری نگاہوں سے اس کے پکارنے پر دیکھ کر رہ گئی۔ سالار شاہ کا یہ انداز، یہ لمس، یہ قربت، اربش کی جان ہی تو نکال رہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے اب یہ دونوں ہاتھ جو اس کے چہرے پر دھرے ہوئے ہیں، وہ آہستہ آہستہ سے گردن پر جارکیں گے۔

''کب تک خوف زدہ رہوگی مجھ سے۔ میں جانتا ہوں غلط فہمی اور نفرتوں کے بھینٹ تم کو چڑھا دیا ہے میں نے اور اب تم وہی دیکھتی ہو جو میں نے تم کو کل دیا جس میں سوائے اذیت اور درد کے کچھ نہیں تھا۔ مگر اس آج میں، میں اپنے بیتے کل کا مداوا چاہتا ہوں۔ تم کو اتنا پیار اتنی چاہت دینا چاہتا ہوں کہ ان اذیتوں اور تکلیفوں کا ہر لمحہ بھول جاؤ۔''

سالار شاہ نے اپنی دائیں ہتھیلی کی پشت ہلکے سے اس کے ٹھنڈے یخ رخسار پر پھیری تھی اور پھر بس اربش کی اسکرین پر اندھیرا اپنا گھر بنانے لگا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر دھند چھانے لگی۔ عقل وخرد کھونے لگے اور پھر وہ انہی مضبوط بازوؤں میں جھولتی چلی گئی۔

☆......☆

علی شاہ کچھ ہی گھنٹے کی ڈرائیو پر ''آغا ولا'' میں موجود تھا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، بے صبری سے ٹہلتا سبریز خان جیسے کسی چیل کی مانند اس پر جھپٹا تھا۔ پہلے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا اور پھر اس کو گریبان سے پکڑ کے بری طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ علی شاہ کہاں اس افتاد کے لیے تیار تھا۔ گھبرا کے ہی تو رہ گیا تھا۔ سبریز خان کا جاہ وجلال اس کا یہ جارحانہ سلوک یہ غصہ...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''بول کیوں کیا تو نے ایسا...... آخر کیا دشمنی تھی تیری میرے بھائی سے۔ کیوں اس کو مارا تو نے۔'' سبریز خان نے ایک زوردار تھپڑ ایک بار پھر اس کے منہ پر رسید کیا۔ گریبان اس کا ابھی بھی سبریز خان کے ہاتھوں میں تھا۔

''سبریز لالہ...... چھوڑیں۔'' دائم خان آگے بڑھا اور علی شاہ کو چھڑانے کی کوشش کی اور وہ کامیاب بھی ہوگیا۔ علی شاہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے ہٹا۔

''چھوڑو مجھے دائم! میں اس رذیل انسان کو جان سے ماردوں گا۔'' سبریز خان، دائم خان کے بازوؤں میں مچل اٹھا تھا۔ پوری جان سے وہ دائم خان کی گرفت توڑنے کی کوشش کررہا تھا مگر ناکام ثابت ہوا۔

''سزا تو اس کو ملے گی مگر ایسے نہیں۔ قانون دے گا اس کو سزا۔'' انگارے علی شاہ پر اچھالتے ہوئے نہایت تیز مگر غصے بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

علی شاہ صحیح معنوں میں الجھ کر رہ گیا تھا اور نظر دوسری سمت گئی جہاں صوفے پر بازغہ بری طرح رورہی تھی۔ اس کے ساتھ انابیہ بیٹھی اس کو چپ کرانے کی کوشش کررہی تھی۔ جب کہ صوفے کے پیچھے کشمالہ نگاہیں اور سر کو جھکائے کسی مجرم کی طرح کھڑی تھی جیسے اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہوگیا ہو۔

ایک لمحے کو علی شاہ چکرا کے رہ گیا تھا سب کچھ اس کی سمجھ اس کی سوچ سے بالاتر تھا۔

''نہیں دائم اس بے رحم آدمی کو قانون نہیں میں سزا دوں گا۔ جبھی مجھے سکون ملے گا۔'' سبریز خان آپے سے باہر ہو رہا تھا اور وہ اس قدر غصے میں تھا کہ شاید علی شاہ کو مار ہی دے گا۔ جبھی تو دائم خان نے اس پر اپنے بازوؤں کی گرفت مضبوط رکھی تھی۔

''آخر میں نے کیا کیا ہے؟'' علی شاہ نے روتی ہوئی بازغہ کو دیکھنے کے بعد دائم خان کے بازوؤں میں جکڑے سبریز خان کو دیکھا۔

''یہ تو مجھ سے پوچھ رہا ہے بے غیرت...... تجھے کیا لگا تو گناہ کرے گا، میرے تبریز کو ماردے گا اور تیرا یہ گناہ چھپ جائے گا...... تو یہ تیری بھول تھی۔'' آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ جس میں اگر سبریز خان کا بس چلتا تو علی شاہ کو بھسم کردیتا۔

''واٹ!'' اب وہ صحیح سے سمجھا بھی تھا اور چونک بھی گیا تھا۔ یہ وہ اس پر کیسا الزام لگا رہے ہیں۔ سبریز خان کا بپھرنا، دائم خان کا سرد اور کاٹ دار لب ولہجہ وانداز، بازغہ کا یوں تڑپ تڑپ کے رونا اور کشمالہ کا یوں شرمندہ و ندامت میں گھرے رہنا۔ سب کچھ اس کے سامنے آگیا تھا۔

مگر اس الزام اور ان لوگوں کی ایسی سوچ پر وہ صرف افسوس کر کے ہی رہ گیا اور سب سے بڑا دھچکا جو اس کو لگا تھا وہ بازغہ کے یوں رونے پر تھا جس کا مطلب اس کو یقین تھا کہ وہ ایسا کچھ کرسکتا ہے۔ اس کی نفرت شدید نفرت علی شاہ نے اس کی ادا سمجھ کر سہی، اس کی بے رخی اس کی بے اعتنائی ہنس کے نظرانداز کی مگر اس الزام کو جو اس نے کیا ہی نہیں کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ اتنا گھٹیا اور گرا ہوا انسان سمجھ لیا تھا اس کو بازغہ نے۔

''دو جواب علی شاہ! کیوں کیا تم نے ایسا'' دائم خان کا لہجہ ہی نہیں اس کا انداز بھی نہایت سرد سا تھا۔

علی شاہ نے اپنے الجھے بکھرے ذہن کو بہت مشکل سے سنبھالا تھا۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ ان لوگوں نے اس پر ایسا گھٹیا الزام کیوں لگایا ہے مگر اس الزام نے اس کو اندر سے توڑ ضرور دیا تھا۔ اس کو خود اپنی نظروں میں گرا دیا تھا۔

''مجھے افسوس ہو رہا ہے آپ لوگوں کی سوچ پر۔''

''اچھا تو پھر یہ کیا ہے، اس کے بارے میں کیا کہو گے۔'' دائم خان نے اپنی چوڑی ہتھیلی آگے کی جس پر تبریز خان کا فون اور آکسیجن پمپ رکھا تھا۔

''تو ان چیزوں سے آپ لوگوں نے اخذ کرلیا کہ تبریز خان کو میں نے مارا ہے۔'' ان سبز کانچ میں طنز کے سرخ ڈورے ہلکورے لینے لگے۔

''تو ان چیزوں کا تمہارے پاس ہونے کا کیا مقصد ہے۔'' دائم خان کی سرد نگاہوں میں بھی طنز کے رنگ تھے۔

''ضروری نہیں ہے ہر چیز کا کوئی مقصد ہو۔ تبریز خان سے چند گھنٹوں کی اس ملاقات نے مجھے اس سے بہت قریب کردیا تھا مگر مجھے آپ لوگوں نے میری نظروں میں ہی گرا دیا۔'' علی شاہ نے دائم خان اور سبریز خان کو دیکھا مگر ان سبز کانچ میں تاسف کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

''یہ ساری جذباتی باتیں اپنے پاس ہی رکھو، اصل حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے میرے بھائی کو مارا ہے اور اس کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔ میں تم کو پھانسی کے پھندے تک ہی پہنچا کے دم لوں گا۔''

سبریز خان کی نگاہوں سے آگ نکل رہی تھی مگر علی شاہ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سچ

اور حق پر ہے۔

''ٹھیک ہے آپ اپنا یہ شوق اور خواہش بھی پوری کر کے دیکھ لیجیے مگر یہ بھی یاد رکھیے گا کہ آج جو کچھ آپ نے میرے ساتھ کیا ہے وہ غلط کیا ہے۔''

''تم لوگوں کو صحیح غلط کی پہچان کب سے ہونے لگی۔ سب جانتا ہوں ایک تم اور دوسرا تمہارا بھائی سالار شاہ۔ جو خود کو بہت اونچی چیز سمجھتا ہے۔ جس نے ایک معصوم بے قصور لڑکی پر ظلم کر کے اپنی مردانگی دکھائی ہے۔'' سبریز خان کے طنز اور استہزا میں اضافے نے علی شاہ کی رگوں میں جیسے چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔

''بس سبریز بھائی!'' علی شاہ نے تیزی سے ہاتھ اٹھا کے سبریز خان کو ٹوک دیا۔ ''مجھے جو کہا میں نے نہ صرف سنا بلکہ برداشت بھی کیا مگر سالار لالہ کے لیے میں کچھ نہیں سنوں گا۔ ورنہ مجھ سے آپ کی شان میں کوئی بھی گستاخی ہو جائے گی جو کہ میں کبھی نہیں چاہوں گا۔'' علی شاہ کے لہجے میں کچھ ایسی سختی تھی کہ سبریز خان جو سالار شاہ کے لیے بولنا چاہ رہا تھا خاموش ہو گیا۔

''اور رہا ان چیزوں کا سوال تو جائیے پولیس اسٹیشن اور انکوائری کرائیں اگر آپ کو لگتا ہے کہ میں نے تبریز خان کو قتل کیا ہے تو اپنی تسلی کریں اور انویسٹی گیشن پوری کریں۔ اور آخری بات......'' علی شاہ کچھ لمحے کو رکا۔ اور پھر روتی ہوئی بازغہ کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''ایک قاتل کے ساتھ آپ کی بہن رہے یہ آپ لوگوں کو گوارہ نہیں ہو گا، اس لیے اپنی بہن کو اپنے پاس رکھیے۔'' مضبوط لہجے میں بہت کچھ جتایا تھا۔ بازغہ نے اس کا مضبوط لہجہ ہی نوٹ کر کے بے ساختہ چہرہ اوپر اٹھا کے ان سبز نگاہوں میں دیکھا تھا۔ جانے ان سبز کانچ میں کیا تھا کہ انہی بے ساختہ نگاہوں کو چرا بھی گئی تھی۔

اس کا یہ برہم، انداز دائم کو کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کر گیا۔

''کہیں ان لوگوں سے غلطی تو نہیں ہو گئی۔''

''ہونہہ......! تجھے کیا لگتا ہے تجھ جیسے قاتل کے پاس میں اپنی بہن کو چھوڑ دوں گا۔'' سبریز خان زہریلے انداز میں پھنکارا تھا۔ جس پر علی شاہ نے خاموش مگر چبھتی نظروں سے سبریز خان کو دیکھا اور پھر وہاں رکا نہیں، الٹے قدموں مڑا اور تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکلتا چلا گیا۔

''روکو اس کو دائم...... اس کو جانے مت دو اور پولیس کو بلاؤ۔'' سبریز خان طیش میں اس کی طرف جانے لگا تھا مگر دائم خان نے ایک بار پھر اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔

سبریز خان اس وقت صرف تبریز خان کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر دائم خان بازغہ کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ علی شاہ کے پراعتماد اور مطمئن انداز نے دائم خان کی سوچوں کو بدل دیا تھا۔

''آپ ادھر آئیں میرے ساتھ۔'' دائم خان، سبریز خان کی طرح جذباتی ہو کر نہیں سوچ رہا تھا۔ اس طرح شاید پچھتاوے ہی ہاتھ آتے۔ ہو سکتا ہے کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو جس نے ان لوگوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہو اور اس سے پہلے کہ یہ شکنجہ اپنی گرفت مضبوط کرتا انہیں اس شکنجے کو توڑنا ہو گا۔

''دائم...... سبریز......'' آغا اکبر خان کی فکرمند و پریشان زور کی آواز نے دائم خان اور سبریز خان کو متوجہ کیا۔ وہ اندر داخل ہو رہے تھے مگر ان کے چہرے پر پریشانی و فکر کے ساتھ ساتھ الجھے سوالات بھی تھے۔

''بابا جان!'' سب سے پہلے بازغہ ہی روتی سسکتی انابیہ کے پاس سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی آغا اکبر خان کے سینے سے لگی تھی۔

ادھر علی شاہ کا یوں غصے میں نکلنا، ادھر بازغہ کا اس طرح بلک بلک کر رونا، آغا اکبر خان صحیح معنوں میں چکرا کے رہ گئے تھے۔ دائم خان کو شدت سے آغا اکبر خان کی کیفیت کا احساس ہوا تھا وہ آگے بڑھا۔

''دائم کیا ہوا ہے؟ علی اتنے غصے میں کیوں گیا ہے اور بازغہ...... میرے بچے اس طرح کیوں رو رہی ہو۔ بتاؤ مجھے ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔'' انہوں نے بازغہ کو روتے دیکھا پھر دائم خان کو...... سبریز خان بھی پاس آیا اور دونوں چیزیں ان کے سامنے کر دیں۔

''یہ دیکھیں بابا جان۔''

''یہ کیا ہے؟''

''یہ ہمارے تبریز خان کا موبائل فون اور آکسیجن پمپ ہے اور یہ دونوں چیزیں علی شاہ کے پاس سے برآمد ہوئی ہیں جس کا مطلب کہ ہمارے تبریز کو علی شاہ نے مارا ہے۔ بابا جان میں علی شاہ کو چھوڑوں گا نہیں۔''

نرم خو، ٹھہرا ہوا مزاج والا سبریز خان آج اس قدر بپھرا ہوا جاہ و جلال میں تھا۔ اتنا زیادہ جذباتی ہو رہا تھا کہ اس کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ آج تک جس نے آغا اکبر کے سامنے کبھی بھول کر بھی تیز آواز میں بھی بات نہ کی ہو اس کی آواز بے حد اونچی ہو گئی تھی۔

علی شاہ کا یوں غصہ میں جانا، بازغہ کا ہچکیوں سے رونا اب وجہ سمجھ میں آئی تھی اور سبریز خان نے یقیناً علی شاہ سے بدکلامی اور بدتمیزی کی ہو گی۔ اتنا تو وہ وثوق سے کہہ سکتے تھے۔

''تم نے علی شاہ کے ساتھ بدتمیزی کی ہے۔'' آغا اکبر خان کے چہرے اور آنکھوں میں خطرناک حد تک سنجیدگی تھی۔ دائم خان کا ماتھا ٹھنکا۔

''ابھی تو صرف ایک تھپڑ مارا ہے مگر وہ بزدل بھاگ گیا لیکن میں اس کو چھوڑوں گا نہیں، پھانسی کے پھندے......''

''خاموش...... بالکل چپ......'' آغا اکبر خان نے دھاڑتے ہوئے سبریز خان کو تیز نظروں سے دیکھا۔ ''مجھے تم سے ایسی کم عقلی اور بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔''

سبریز خان کے سارے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے مگر آغا اکبر خان کا یوں جلال اور طیش میں آنا بھی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''انکل یہ تبریز کی امانت جو آخری وقت میں میرے پاس ہی رہ گئی تھی۔'' علی شاہ نے قبرستان میں ہی وہ موبائل فون اور آکسیجن پمپ آغا اکبر خان کی طرف بڑھایا۔

آغا اکبر خان نے وہ دونوں چیزیں بھیگی آنکھوں سے دیکھیں۔ چند ہی گھنٹوں میں وہ کتنے بوڑھے ہو گئے تھے۔ کیا کچھ نہیں تھا ان کے چہرے، ان کی بوڑھی نگاہوں میں۔ رنج، غم، ملال...... صدیوں کا دکھ و درد...... اپنی سب سے قیمتی شے کھو جانے کا دکھ...... وہ بالکل ڈھل چکے تھے۔ ان کے شانے ڈھے گئے تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا وہ اپنی زندگی ہار گئے تھے۔

''بیٹا! جس کی یہ چیزیں تھیں وہ تو منوں مٹی تلے دفن ہو گیا۔ ابدی نیند جا سویا اور یہ غم میرے گھر والوں کے لیے بہت بڑا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔'' چند موتی ٹوٹ کر گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔

''تم ایک کام کرو، یہ چیزیں تبریز کے ساتھ ہی قبر میں دفنا دو۔ اگر گھر لے کر گیا تو بازغہ سنبھل نہیں پائے گی۔'' انہوں نے اپنی بھیگی آنکھیں اپنی کمزور و کپکپاتی انگلیوں سے صاف کیں۔

"انکل اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا یہ چیزیں میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔" ایک چھوٹی سی التجا تھی۔ ایک معصومانہ ریکوئسٹ۔

آغا اکبر خان نے علی شاہ کا چہرہ دیکھا۔ جہاں ان کو تبریز خان کے کھونے کا درد واضح نظر آرہا تھا۔ تبریز خان اس کے آخری لمحات کا ساتھی تھا۔ یقیناً تبریز خان میں کچھ تو بات تھی جو علی شاہ اس کے لیے دکھی تھا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" بس انہوں نے اتنی سی بات کہی تھی اور وہ بھاری قدموں سے قبرستان سے باہر جانے لگے۔

اب انہیں یہ اندازہ کب تھا کہ ان چیزوں کے لیے انہیں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔ ایک ذرا سی غلط فہمی کتنی بڑی نفرت اور دوری کا سبب بن رہی تھی۔

"مگر بابا جان آپ نے اس بات کا ذکر کبھی کیا نہیں۔" دائم خان نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ تم لوگ اس قدر ناسمجھی کا مظاہرہ کرو گے۔" انہوں نے طنز میں بھیگا جملہ اس پر اچھالا تھا۔ دائم خان نظریں چرا گیا۔

"اور اگر پھر بھی یقین نہ آئے تو علی شاہ نے آسٹریلیا کے سی سی ٹی وی سے جو ویڈیو کلپ منگوا کے مجھے دکھائی تھی وہ دیکھ کر ہی یقین کرلو کہ تبریز خان کی موت حادثاتی تھی۔"

آغا اکبر خان نے سلگتی نگاہوں سے سبریز خان کو دیکھا۔ سبریز خان شرمندہ ہوگیا۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ نظریں اٹھا کے آغا اکبر خان سے نظریں ملا سکے۔ اس سے واقعی بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ علی شاہ سے بہت زیادہ ناانصافی کر گیا تھا۔ بازغہ بھی گم صم سی آغا اکبر خان کو دیکھے جا رہی تھی۔

آغا اکبر خان نے دائم خان اور سبریز خان پر شکایتی نظریں ڈالنے کے بعد بازغہ کو نرم نگاہوں سے دیکھا۔

"بچے، میرے جگر کے ٹکڑے...... تبریز کی موت ایک ناگہانی موت تھی ایک سانحہ تھا اور آج مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ تم اب تک تبریز کی موت کو قبول نہیں کر پائی ہو۔ آج بھی اس کی یادوں سے تم نے اپنا جہان آباد کر رکھا ہے مگر میرا بیٹا ہم اپنے بیتے کل میں جی کر اپنے آج کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تم تو میری بہت سمجھدار اور عقلمند بیٹی ہونا۔"

انہوں نے بازغہ کی خاموش آنکھوں میں دیکھا۔ وہ جو بنا پلک جھپکائے یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ چپکے سے آنکھیں بند کرلیں اور واپس ان کے سینے میں سر چھپا لیا تھا۔ آغا اکبر نے انابیہ کو دیکھا۔ انابیہ سمجھ گئی تھی ان کی آنکھوں کا اشارہ، وہ آگے بڑھی اور بازغہ کو آہستگی سے ان سے الگ کر کے دوسرے روم میں لے جانے لگی۔ آغا اکبر خان کی آنکھوں سے دو موتی ٹوٹ کر گالوں پر پھسلے تھے اور ان آنسوؤں نے جیسے دائم خان اور سبریز خان کا دل چیر کے رکھ دیا تھا۔

آغا اکبر خان نے بے رحمی سے اپنے آنسو صاف کیے اور ان دونوں کو تیز نظروں سے دیکھا۔ "اب اپنی بے وقوفی اور بد عقلی پر ماتم کرنے کے بجائے علی شاہ کے پاس چلو۔ میں خود علی شاہ سے معافی مانگوں گا۔" آغا اکبر خان کے اس آخری جملے نے جیسے ان دونوں کے جسم سے جان کھینچ لی۔ ان دونوں نے تڑپ کے اپنے بابا جان کو دیکھا تھا۔ وہ تو ویسے ہی بہت دکھی تھے۔ اپنے سینے میں پہاڑ جیسا غم لیے جی رہے تھے ان دونوں کی ذرا سی غلطی نے ان کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"بابا جان! مجھے معاف کر دیجیے۔ میں تبریز کی محبت میں بالکل اندھا ہو چکا تھا۔" سبریز خان تڑپتا ہوا تیزی سے آغا اکبر خان کے قریب آیا اور ان کے قدموں میں گر گیا۔

دائم خان بھی نادم نادم سا وہیں کھڑا رہا تھا۔ اچھا تو اس نے بھی نہیں کیا تھا علی شاہ کے ساتھ، مگر وہ علی شاہ سے معافی مانگ لے گا۔

☆......☆

"میں آپ سے کہہ رہی تھی نا، اربش آپ سے بہت خوفزدہ ہے۔ وہ آپ سے بہت ڈری ہوئی ہے۔"

انشراح کا گلوگیر لب و لہجہ، گلابی آنکھوں میں آنسو...... سالار شاہ کچھ شرمندہ سا تھا۔ وہ اب تک صرف سن ہی رہا تھا مگر آج دیکھ بھی لیا تھا لیکن اگر یہی حالات رہے وہ اسی طرح اس سے خوفزدہ رہی تو سالار شاہ کیسے اس کو اپنے ہونے کا یقین دلائے گا۔ کیسے اپنے پیار اپنی بے پناہ چاہت کا یقین دلائے گا۔ اپنے ساتھ کا یقین دلائے گا۔ ماضی میں جو غلطیاں جو بھی ناانصافی ہوئی وہ ان سب کی تلافی چاہتا تھا اور یہ جبھی ممکن تھا جب اربش کا ڈر اس کا یہ خوف ختم ہوتا۔

"کوئی بات نہیں۔ ابھی کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔"

بی بی جان نے سالار شاہ کی شرمندگی نوٹ کر لی تھی۔ محسوس تو انہیں پہلے ہی ہو گیا تھا کہ سالار شاہ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہے اور اس سے بڑھ کر انسان کے ظرف کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ وہ گناہ کرتا ہے مگر اللہ کے حضور گڑگڑا کے معافیاں بھی مانگتا ہے توبہ بھی کرتا ہے اور جب اللہ رب العزت اپنے گناہ گار بندے کو معاف کر سکتا ہے اس کی خطائیں، نادانیاں، بھلا کے توبہ استغفار قبول کر سکتا ہے تو ہم تو بہت ادنیٰ سے اس کے بندے ہیں۔ ہم کیوں اپنا ظرف اپنا دل بڑا کر کے سامنے والے کی غلطیوں سے درگزر نہ کریں۔

"سالار بیٹا! پریشان مت ہو...... ان شاء اللہ سب بہتر ہو جائے گا، اربش کے ڈر کو اس کے خوف کو کمزور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم بار بار اربش کے سامنے آؤ، اس کی سوچوں کو طاقت ور بنانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے ساتھ کا اپنے ہونے کا یقین دلاؤ۔" بی بی جان نہایت آہستگی سے نرم لہجے میں اس کو ہی نہیں انشراح کو بھی سمجھا رہی تھیں، جس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپک رہے تھے۔ رافعہ ملک اس کے پاس آکر بیٹھیں۔

"بی بی جان بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں انشراح! ہم سب نے مل کر اربش کو بہت سمجھایا ہے۔ اس کا خیال رکھا ہے اور آگے بھی رکھیں گے، مگر جو بات خود سالار میں ہے اس سے اربش کی بکھری شخصیت میں بہت فرق آئے گا۔"

انہوں نے انشراح کے رخسار پر پھیلے بکھرے آنسوؤں کو اپنی انگلی سے صاف کیا۔

"اربش ٹھیک ہو جائے گی نا؟" بھیگی آنکھوں سے اس کا بس یہ ہی سوال تھا۔

"ہاں ان شاء اللہ! اچھا اب تم یہاں سے اٹھو، دیکھو رائب نے گڑیا کو نہیں سلایا ہو تو گڑیا کو یہاں ہمارے پاس لے آؤ جاؤ۔ اٹھو شاباش۔" رافعہ ملک کو صرف اربش کی ہی نہیں انشراح کی بھی فکر تھی، وہ خود بھی تو ابھی بہت بڑے صدمے سے باہر آئی تھی۔

انشراح کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا اربش کو چھوڑ کے جانے کا مگر رافعہ ملک کا کہنا بھی ماننا ضروری تھا، وہ اربش پر ایک بے بسی کی نظر ڈالتی اس کے پاس سے کھڑی ہوگئی۔

"زخم گہرا ضرور ہے جس میں سے شاید ابھی بھی لہو رستا ہے، مگر تمہاری توجہ تمہارا خیال، تمہارا بے پناہ پیار ہی ان زخموں کو مندمل کر سکتے ہیں۔" بی بی جان کی اس گہری بات کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

"اربش بیٹا!" بی بی جان نے بے ہوش سی اربش کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں سہلائی تھیں اور یہ ان کی ممتا

بھری نرماہٹ تھی جس کی وجہ سے وہ دھیرے دھیرے آنکھیں وا کرنے لگی۔ اس کا سویا شعور بیدار ہونے لگا، آنکھوں کی پتلیوں اور ذہن کے پردے پر ایک چہرہ بہت واضح ہونے لگا تھا، اس نے خوف سے آنکھیں زور سے بند کرلیں۔

بی بی جان نے اس کی سرد پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ''کیا ہوا میری جان!'' ان کا پرشفقت لہجہ، ان کا نرم وملائم انداز جس سے اربش کو حوصلہ ملا اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے سر پر رکھا ان کا ہاتھ تھام کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔

''بی بی جان! وہ یہاں آئے تھے۔ بی بی جان مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' کانپتے لہجے میں وہ اپنا ڈر ظاہر کر رہی تھی اور وہ جس کی بات کر رہی تھی وہ سامنے ہی بیٹھا اس کو دیکھ رہا تھا، اس کی تو جیسے جان میں جان آ گئی تھی اربش کو ہوش میں آتا دیکھ کر۔

وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی مگر بی بی جان کی نظریں صرف اس وقت سالار شاہ کے چہرے پر تھیں جس کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اس کو جیسے جینے کی امید مل گئی ہو، ان گہرے کانچ میں روشنیاں سی پھوٹنے لگی تھیں۔

''اچھا بس اب بالکل نہیں رونا تم کو۔'' بی بی جان نے اس کو اپنی آغوش میں بھر لیا، رافعہ ملک اس کی کمر تو کبھی اس کا سر ہلکے ہلکے سہلانے لگی تھیں۔

☆......☆

صبح کے سات بج رہے تھے مگر ابھی تک بازغہ ان کے پاس نہیں آئی تھی ورنہ وہ صبح فجر کی نماز پڑھ کر اپنے اور زبیدہ جہاں کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے میں آجایا کرتی تھی۔ زبیدہ جہاں کو بازغہ کی اس قدر عادت ہو چکی تھی کہ انہیں اس کے بغیر ہر شے ادھوری اور نامکمل لگتی تھی، انہیں فکر سی ہونے لگی۔ وہ تسبیح لیے اپنے بیڈروم سے باہر نکلیں۔ حویلی کے سارے ملازمین اپنے اپنے کاموں میں جتے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو ان کو اربش کی بھی بہت کمی سی محسوس ہوتی تھی۔ نفرت سے ہی سہی مگر اس پر نظر ضرور پڑتی تھی اور وہ بے ضرر سی معصوم سی لڑکی سر کو جھکائے مؤدب کھڑی ہر حکم کے لیے تیار رہتی تھی لیکن وہ بھی اربش کے ساتھ کی گئی ہر زیادتی کا ازالہ کر دیں گی بس اس کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ اگر عدت میں نہیں ہوتیں تو خود جا کر اربش کو لے آتیں، سالار شاہ کو گئے ہوئے بھی ہفتے سے زیادہ ہونے والا تھا مگر ابھی تک اربش اور گڑیا کو لے کر واپس نہیں آیا تھا، ان کا تو دل چاہ رہا تھا کہ خود جا کر اربش اور گڑیا کو لے آئیں، خیر اس میں کوئی عار بھی نہیں۔ وہ چلی جائیں گی تھوڑے سے ہی تو دن رہ گئے تھے ان کی عدت ختم ہونے میں مگر ابھی تو وہ بازغہ کو دیکھیں۔ وہ ابھی تک اٹھی کیوں نہیں اور علی شاہ رات میں کب لوٹا تھا۔

''سکینہ!'' انہوں نے سکینہ کو آواز دی۔

''جی بڑی سرکار!'' وہ اپنا کام چھوڑ کے تیزی سے ان کے پاس آئی تھی۔

''بازغہ نہیں اٹھی ابھی تک، طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی۔''

''بڑی سرکار وہ تو کل دوپہر کو آپ کو سلانے کے بعد ہی چلی گئی تھیں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہے، دماغ تو ٹھیک ہے تیرا، کہاں چلی گئی۔'' زبیدہ جہاں کی کرخت آواز پر سکینہ سہم کر رہ گئی۔ اس کو لگا اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ وہ یہاں نئی آئی تھی اس لیے یہاں کے طور طریقے زیادہ نہیں جانتی تھی بس سب سے یہ ضرور سنا تھا کہ زبیدہ جہاں غصے کی بہت تیز ہیں۔ ان کو غصہ دلانے کا مطلب اپنی شامت کو بلانا ہے۔

''اب بولتی کیوں نہیں، چپ کیوں کھڑی ہے۔''

''جی......وہ۔'' وہ پوری جان سے کانپ کے ہی تو رہ گئی، زبیدہ جہاں کی تیز غصیلی آواز پر سکینہ کی ماں جنت بی بی بھاگتی ہوئی آئی۔

''بڑی سرکار اس سے کوئی غلطی ہو گئی، معاف کر دیں اس کو، یہ جھلی ہے اس کو میں سب سکھا رہی ہوں۔''

''بازغہ کہاں ہے؟''

''بڑی سرکار!...... خان کو پتا ہے۔ بازغہ بی بی کل روتی ہوئی ا... کے ساتھ گاڑی میں گئی تھیں۔'' زبیدہ جہاں کے خوف سے اس نے فرفر سب بولنا شروع کر دیا تھا ورنہ علی شاہ نے انہیں کچھ بھی بتانے کو منع کر دیا تھا۔

اب وہ صحیح معنوں میں الجھ کے رہ گئی تھیں، انہیں شدت سے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

''بلا جلدی سے ...... خان کو۔'' ایک منٹ کے اندر اندر ڈرائیور دوڑا چلا آیا تھا اور جو کچھ کل ہوا تھا وہ اس نے زبیدہ جہاں کے گوش گزار کر دیا تھا، اس کو بھی علی شاہ کی طرف سے یہ ہی حکم ملا تھا کہ بڑی سرکار کو کچھ بھی نہ بتایا جائے۔

زبیدہ جہاں کے دھیان کے سارے دھاگے ایک دوسرے سے الجھنے لگے تھے۔ یقیناً کوئی تو بہت بڑی بات ہوئی ہے جو ان کے علم میں نہیں ہے اور اب یہ گتھی علی شاہ ہی سلجھا سکتا ہے، وہ وہاں سے ہٹ کر علی شاہ کے بیڈ روم کی جانب بڑھی تھیں۔

علی شاہ کے بیڈروم کا دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹایا تھا مگر اندر سے جواب ندارد۔ انہوں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتا چلا گیا، کمرے میں گہری خاموشی کے ساتھ گھپ اندھیرا بھی تھا، زبیدہ جہاں نے ساری لائٹس آن کر دیں، پورے کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی، زبیدہ جہاں کی نظر پورے کمرے پر پڑی۔ ہر شے قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ بازغہ کی نفاست اور سگھڑپن ہر شے سے جھلک رہا تھا۔

آخر کیا وجہ ہے جو بازغہ اس طرح اچانک سے اپنے گھر چلی گئی زبیدہ جہاں سے ملے بغیر اور بقول ...... خان کہ وہ پورے راستے روتی رہی تھی کیا بات ہوئی ہوگی، انہوں نے بیڈ پر نظر ڈالی جہاں بلینکٹ میں علی شاہ سو رہا تھا، وہ اس کی طرف بڑھیں۔

''علی!'' وہ آہستگی سے اس کے پاس بیٹھ گئیں، اور کمبل اس کے چہرے سے ہٹایا۔ زبیدہ جہاں کی پکار پر بھی علی شاہ نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ ان کے چہرے پر ممتا سے بھری مسکراہٹ رینگ گئی۔ انہوں نے اپنی ہر اولاد سے ٹوٹ کے محبت کی تھی۔ علی شاہ تو زیادہ تر ان سے ...... حویلی سے دور ہی رہا تھا، کبھی پڑھائی کے سلسلے میں تو کبھی بزنس کے سلسلے میں شاید یہ ہی وجہ تھی کہ وہ عالم شاہ اور سالار شاہ سے مزاج میں قدرے مختلف تھا۔ اس کی عادتیں بھلے ہی سالار شاہ سے الگ تھیں مگر دونوں بھائی ایک دوسرے کو حد سے زیادہ چاہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا بازو تھے۔

زبیدہ جہاں کے چہرے اور آنکھوں میں نرم سا تاثر تھا، انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو اوپر کیا تو جیسے ان کو سو والٹ کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ علی شاہ کا ماتھا دہک رہا تھا، اس کو بہت تیز بخار تھا، زبیدہ جہاں کی فکر اور پریشانی مزید بڑھنے لگی۔

''علی، علی پتر ...... علی۔'' وہ اس کو زور زور سے آوازیں دینے لگیں، اس کا شانہ ہلایا انہوں نے اس پر سے کمبل ہٹا دیا، اس کے چہرے کو تھپتھپانے لگی تھیں، مگر وہ ہوش میں ہوتا تو کچھ بولتا۔

''ڈرائیور ...... سکینہ!'' وہ اپنے ملازمین کو پکارنے لگیں، جنت بی بی جو سکینہ کو کچھ سمجھا رہی تھی زبیدہ جہاں کی پر

زور آواز سے چونک کر رہ گئی اور تیزی سے علی شاہ کے کمرے کی جانب بھاگی اس کے ساتھ سکینہ بھی آئی۔
"حکم بڑی سرکار!"
"جنت! ڈاکٹر کو فون کر، بلا جلدی سے اور...... خان کو بول حکیم صاحب کو لے کر آئے، رب جانے میرے علی پتر کو کیا ہو گیا ہے۔" انہوں نے علی شاہ کی ہتھیلی اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سہلانی شروع کر دی تھی، اس دوران متواتر علی شاہ کا فون بج رہا تھا مگر زبیدہ جہاں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ انہیں اس وقت سب سے زیادہ پرواہ اپنے علی شاہ کی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر اور حکیم بھی آ گئے، دونوں نے اپنے اپنے طریقے سے چیک کیا، بخار کی حدت بڑھنے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ جلدی جلدی اس کے سر پر برف کی پٹیاں رکھی گئیں تو بخار کچھ معمول پر آیا۔
"زیادہ پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا ڈاکٹر صاحب؟"
نہیں اب کوئی پریشانی یا خطرے کی بات نہیں ہے، بخار یا تو موسم کے بدلنے کی وجہ سے شدت پکڑ گیا ہے یا پھر ذہنی دباؤ کو لے کر۔"
"ذہنی دباؤ؟" زبیدہ جہاں نے سوالیہ نگاہوں سے ڈاکٹر اور حکیم کو دیکھا تھا۔ دونوں ایک ہی بات کر رہے تھے۔
"جی بڑی سرکار! کوئی اسٹریس یا کسی بات کو لے کر انسان ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے، مگر ابھی یہ بہتر ہیں۔ میں نے انجکشن دے دیا ہے، کچھ دیر میں ہوش میں آ جائیں گے۔" وہ لوگ چلے گئے مگر زبیدہ جہاں کو بہت سی گہری سوچوں میں ڈال گئے۔
انہیں یاد آیا، کل شام وہ ان کے پاس آیا تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں کی تھی یہاں تک کے لہجے و انداز سے بھی معمولی سی پریشانی کی بات کا تاثر نہیں جھلک رہا تھا تو پھر یکا یک اچانک کیا بات ہو سکتی ہے جو نوبت ا[illegible] حد تک بڑھ گئی۔
بازغہ کا حویلی سے روتے ہوئے اپنے گھر جانا، علی شاہ کا رات دیر سے گھر آنا۔ یہ سب ان کو مزید الجھا رہا تھا۔
"فون" ان کا دھیان اس کے فون پر گیا جو متواتر بج رہا تھا۔ انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے علی شاہ کا فون اٹھا لیا۔
کوئی پچاس ساٹھ سے زائد کالز تھیں۔ جس پر "آغا بابا جان" لکھا ہوا تھا اور اس سے پہلے وہ ان سے جاننے کے لیے ان کو فون کرتیں ایک بار پھر فون بج اٹھا۔
زبیدہ جہاں نے کال ریسو کر لی تھی اور علی شاہ کی جو کنڈیشن ان کو بتائی تھی "آغا ولا" میں کھلبلی کے ساتھ غصے و ناراضی کا ایک بار پھر دائم خان اور سبریز خان نشانہ بنے تھے۔

☆......☆

اربش کی آنکھ صبح کے کوئی نو اور دس بجے کے درمیان کھلی تھی۔ اس کو محسوس ہوا جیسے کچھ عجیب ہے جیسے کچھ الگ، بیڈ روم کی مدھم روشنی میں واضح تو نہیں ہوا مگر شعور اور عقل نے جب پوری طرح کام کرنا شروع کیا تو خود کو کسی کی مضبوط بانہوں میں مقید پایا تھا۔ اس کا سر کسی کے مضبوط سینے پر دھرا تھا اور ہاتھ کسی کے ہاتھ میں قید تھا، اس نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں سالار شاہ ہی ہو سکتا ہے، اربش کے اندر تک کپکپی سی دوڑ گئی۔ وہ سالار شاہ کی اتنی قربت سے خوفزدہ ہی تو ہو گئی تھی۔ اسے یاد تھا سالار شاہ ہر رات اس کو بے رحمی اور بے دردی سے استعمال کر کے کسی بدبودار کچرے کے ڈھیر کی طرح خود سے دور پھینک دیا کرتا تھا۔ جیسے وہ کسی موذی بیماری میں مبتلا ہو مگر [illegible] ہی بھی اس طرح وہ اس کے قریب نہیں آئی تھی، اس کا ذہن جب پچھلی گزری باتوں کو سوچنے لگا تو ڈر

اور خوف پہلے سے زیادہ اس کے وجود پر حاوی ہونے لگے۔
وہ ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہوئی تھی۔ اس کے اس طرح سے الگ ہونے پر سالار شاہ کی آنکھ کھلی تھی۔ اربش کا دل بری طرح دھڑکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بیڈ سے نیچے اترتی، سالار شاہ نے اس کی نازک کلائی تھامی اور اس کو اسی جھٹکے سے واپس اپنی جانب کھینچا۔ وہ سیدھا اس کے چوڑے سینے پر آ گری، سالار شاہ نے اس کی نازک کمر پر اپنی بانہوں کا حصار باندھ دیا کہ اس کے نکلنے کا راستہ مسدود ہو کر رہ گیا۔
"لیٹی رہو کہاں جا رہی ہو؟" گرے کانچ میں جہاں بھر کا پیار سمیٹے وہ ان سیاہ نینوں میں جھانک رہا تھا۔ اربش کی لرزتی پلکیں رخسار پر سجدہ ریز ہو گئیں۔ جہاں اب لالی سی بکھرنے لگی تھی، وہ آرام آرام سے یہ تو تسلیم کرنے لگی تھی کہ یہ کوئی خواب نہیں۔ سالار شاہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، اس کے انداز میں تبدیلی آ گئی ہے پہلے جیسی گرفتگی اور تختی بالکل مفقود تھی مگر وہ کیا کرے اس دل کا جس میں ڈر پھر بھی کنڈلی مار کے بیٹھا تھا۔
"اربش!" جانے اس پکار میں کیا فسوں تھا جو اربش نے لرزتی پلکیں اوپر کو اٹھا کے اس چہرے پر نظریں ٹکا دی تھیں۔ کتنی ہی دیر تک سالار شاہ ان سیاہ نینوں میں دیکھتا رہا تھا۔ اربش ان نرم و گرم نگاہوں کی زیادہ دیر تک تاب نہیں لا سکتی تھی اس لیے چہرے کے ساتھ ساتھ نگاہوں کو بھی جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر بہت خوب صورت سے رنگ کھلنے لگے تھے۔ جنہیں سالار شاہ نے نہایت دلچسپی سے دیکھا تھا بلکہ ہاتھ بڑھا کے اس کی ٹھوڑی پکڑ کے اس کا چہرہ اوپر کو اٹھایا تھا۔
"کیا ہوا؟" ہلکے سے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔" نگاہیں واپس جھکا کر وہ ایک بار پھر اس کے حصار کو توڑنے کی ہلکی سی مزاحمت کرنے لگی تھی جو ناکام ثابت ہوئی۔
"یہ کوئی خواب نہیں ہے اربش! میں کوئی خواب نہیں ہوں، میں زندگی ہوں تمہاری، تم زندگی ہو میری، میری آتی جاتی سانسوں میں زندگی بن کے دوڑنے لگی ہو، میرے دل کی دھڑکتی دھڑکنوں میں دھڑکنے لگی ہو، بھروسہ اور اعتبار کر کے دیکھو، وعدہ کرتا ہوں نہ تمہارا بھروسہ ٹوٹنے دوں گا اور نہ تم کو۔" کہنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کے دہکتے رخسار پر اپنی ہتھیلی اور انگلیوں کی پشت کو دھیرے دھیرے پھیر رہا تھا، یہ جانے اور محسوس کیے بنا کہ اس کے اس لمس سے اربش کے اندر ایک تلاطم سا برپا ہو رہا ہے۔ دل کچھ اور چاہتا تھا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ کبھی وہ شرم و حیا سے خود میں سمٹنے لگتی تو کبھی خوفزدہ ہو کر سہمنے لگتی، اور اس کی یہ کیفیت سالار شاہ کی زیرک نگاہوں سے بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ حالات کیسے بھی رہے ہوں مگر یہ حقیقت بھی تو وہ نہیں جھٹلا سکتا تھا کہ وہ کتنے عرصے راتوں کی تنہائی میں اس کے ساتھ رہی ہے۔ دن کے اجالے میں بھی وہ اس کی نظروں کے سامنے رہی ہے، پھر کیسے نہ وہ اس کے چہرے اور آنکھوں کے آتے جاتے رنگوں کو پہچانتا۔
اربش نے دھیرے سے آنکھیں موند لیں، وہ ابھی بھی یقین اور بے یقین کے سفر میں تھی، آنکھوں کے گوشے سے چند موتی ٹوٹ کر سالار شاہ کا سینہ بھگوتے چلے گئے تھے۔ سالار شاہ نے بانہوں کا گھیرا مزید تنگ کر دیا اور اس کی پیشانی پر اپنے یقین کی اپنی چاہت کی مہر ثبت کر دی، اور اربش حیا سے مزید اس کے اندر سمٹ گئی۔

☆......☆

"آغا اکبر خان اپنے ساتھ دائم خان اور سبریز خان کے ساتھ بازغہ کو حویلی لے آئے تھے۔ جب سے سنا تھا سبریز خان اور دائم خان شرمندگی اور ندامت کے مارے آغا اکبر خان کے آگے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کر

رہے تھے، اور سبریز خان کا تو مرنے کا دل چاہ رہا تھا کیونکہ سب سے خراب سلوک اس کا تھا، اس نے علی شاہ پر صرف ہاتھ ہی نہیں اٹھایا تھا بلکہ اس کو گالی بھی دی تھی۔ آج اس کے جذباتی غصے کی وجہ سے کسی کو بہت تکلیف پہنچی تھی۔ کسی کا دل دکھا تھا۔

زبیدہ جہاں کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو فوراً ہال میں پہنچیں۔

''السلام علیکم بھائی صاحب!''

''وعلیکم السلام بہن کیسی ہیں آپ؟'' آغا اکبر خان کی نگاہیں نیچی تھیں۔ ان کے انداز میں نہایت عزت تھی۔

''الحمدللہ! آپ سنایئے علی نے ابھی بتایا تھا کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ جبھی بازغہ تیزی سے بھاگی تھی، میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔'' نہایت سادگی سے انہوں نے کہا تھا، انداز اور لب و لہجے میں کہیں سے بھی خفگی یا ناراضگی ظاہر نہیں ہو رہی تھی جس کا مطلب تھا علی شاہ نے ان کو کچھ بھی نہیں بتایا۔

''بہتر ہے اب علی بیٹے کیسے ہیں۔'' ان کے دل میں علی شاہ کے لیے مزید پیار بڑھا، کتنا بڑا دل تھا اس کا، چاہتا تو زبیدہ جہاں کو بتا سکتا تھا مگر کچھ نہیں کہا۔ سبریز خان اور بازغہ نے کوئی معمولی بات تو نہیں کی تھی۔ قتل کا الزام لگایا تھا۔

بازغہ تو اپنی جگہ چور سی بنی ہوئی تھی یہ سب اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔ رو رو کر اپنی آنکھیں سجالی تھیں، ملگجے کپڑے، بکھرے بال، اجڑا سا حلیہ، جیسے پتا نہیں کتنے دن ہوگئے خود کو سنوارے ہوئے یا پھر کتنے برسوں کی بیمار ہو۔ زبیدہ جہاں کو بازغہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت افسوس اور دکھ ہوا تھا، انہوں نے شادی کے بعد کبھی اس کو ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہوئی ہے بازغہ پتر! حویلی کی بہو ہو۔ علی شاہ کی بیوی۔ نہ کوئی روپ نہ بناؤ سنگھار۔'' زبیدہ جہاں ٹوکے بنا نہیں رہ سکیں، ان کی آنکھوں اور چہرے پر ہلکا سا گلہ بھی تھا جو آغا اکبر خان نے نوٹ کر لیا تھا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ جب سے علی بیٹے کا پتا چلا ہے تب سے ہی رو رو کر ہلکان ہوگئی ہے میری بچی۔'' آغا اکبر خان نے ہی بات سنبھالی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ بازغہ کے لیے ان کے دل و دماغ میں کوئی شک آئے، کوئی وسوسہ جگہ بنائے۔

زبیدہ جہاں مطمئن ہوئیں یا نہیں یہ تو وہ نہیں جانتے تھے مگر بازغہ کے لیے ان کے چہرے پر نرم تاثر ابھرنے لگے۔

''زبیدہ بہن ہم لوگ علی سے مل سکتے ہیں۔'' آغا اکبر خان کب سے علی شاہ سے ملنے کے لیے بے چین و بے تاب ہو رہے تھے۔

''ارے کیوں نہیں بھائی صاحب! خان۔'' زبیدہ جہاں نے مودب کھڑے خان کو آواز دی اور اس کو حکم دیا کہ مہمانوں کو علی شاہ کے بیڈروم میں لے کر جائے، اور ساتھ جنت بی بی کو حکم بھی دیا کہ چائے کا انتظام کرے اور دوپہر کا کھانا لاجواب ہونا چاہیے کسی شے کی کمی نہ ہو۔'' ان تینوں کے ساتھ وہ بھی اپنے ہی بیڈروم میں مہمانوں کی طرح داخل ہوئی تھی، یا یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اجنبی۔ اپنا ہی وجود کسی بوجھ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

علی شاہ بیڈ پر آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ اس کو بازغہ کی نفرت شدید نفرت نے نہیں توڑا تھا بلکہ تبریز خان کے قتل کے الزام نے اندر سے توڑ دیا تھا، اس کا دل کانچ کی کرچیوں کی طرح بکھر گیا تھا مگر اس کے باوجود بھی وہ اس

دشمن جاناں سے نفرت نہیں کر سکتا تھا اس سے ناراض اور خفا نہیں ہو سکتا تھا۔ بس اس کو خود سے الگ کر آیا تھا۔ اس کی خوشی کے خاطر اس کو اس کے گھر چھوڑ آیا تھا۔ اور غصہ اور جذبات میں وہ چھوڑ تو آیا تھا مگر اس سوچ نے اس کو بکھیر دیا تھا کہ وہ کیسے بازغہ کے بغیر رہ سکے گا۔ ان آنکھوں کو اس چہرے اس وجود کو دیکھنے کی عادت ہو چکی ہے، اب کیسے زندگی گزارے گا، کیسے جیے گا اس کے بنا، اس تکلیف دہ سوچ کی وجہ سے تو وہ بیمار پڑ گیا تھا اور ابھی تو یہ شروعات ہے، ابھی تو چوبیس گھنٹے بھی پورے نہیں گزرے تو یہ حال ہوا ہے۔

''علی بیٹا!'' آغا اکبر نے ہلکے سے پکارا تھا۔ علی شاہ جو اپنی ان تکلیف دہ سوچوں میں اس قدر منہمک تھا تصور جاناں میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ اکبر خان کی آواز نہیں سنائی دی ساتھ نہ ان لوگوں کی آہٹ۔'' آغا اکبر خان مزید کچھ قدم آگے بڑھے تھے اور ایک بار پھر نرمی سے پکارا تھا۔ علی شاہ نے ہلکے سے بازو آنکھوں پر سے ہٹایا تھا اور جو چہرہ سامنے تھا وہ اس کی سوچ کے برعکس تھا۔

''ارے بابا جان آپ!'' وہ تیزی سے ان کی تعظیم میں بیڈ سے کھڑا ہوا تھا اور آغا اکبر خان کی طرف بڑھا۔ ان کے دونوں ہاتھ پکڑے ان پر بوسہ لیا، بلاشبہ وہ ان کی بہت عزت کرتا نہایت احترام سے پیش آتا تھا۔

''آپ نے مجھے بلا لیا ہوتا۔'' ان کی طبیعت آج کل اچھی نہیں تھی اس لیے علی شاہ نے کہا۔

''بیٹا ضرورت ہماری ہے۔ خطا ہم سے سرزد ہوئی ہے تو چل کر بھی تو ہمیں آنا چاہیے تھا نا۔'' آغا اکبر خان کے لہجے میں شرمندگی بول رہی تھی اور اسی لہجہ اور شرمندگی نے علی شاہ کے دل پر چوٹ پہنچائی تھی۔

''پلیز بابا جان! آپ میرے لیے بہت قابل احترام ہستی ہیں۔ ایسی بات کہہ کر مجھے شرمندہ مت کریں نہ میری محبت کو شک کے ترازو میں تولیں۔'' علی شاہ کی آنکھیں بخار کی شدت سے سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کا پورا جسم بھٹی کے مانند دہک رہا تھا۔ آغا اکبر خان کو شدت سے احساس ہوا تھا۔ پیچھے کھڑے دائم خان اور سبریز خان آگے بڑھے، غلطی ان لوگوں سے سرزد ہوئی تھی تو ان کا فرض تھا کہ وہ معافی مانگیں۔

''آئی ایم سوری علی! مجھے بہت بڑی غلط فہمی ہوگئی تھی بنا سوچے جانے تم سے برا سلوک کیا۔'' سبریز خان نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

''ارے سبریز بھائی! کیا کر رہے ہیں۔ کیوں مجھے میری ہی نظروں میں گرا رہے ہیں۔'' علی شاہ نے سبریز خان کے دونوں جڑے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''میں نے آپ میں اور سالار لالہ میں کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا جیسے سالار لالہ میرے لیے معزز ہستی ہیں ایسے ہی آپ کو سمجھتا ہوں، اور غلطیاں تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں، کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔''

دائم خان کے دل میں کئی گنا علی شاہ کے لیے عزت و توقیر بڑھی تھی، بازغہ کے لیے علی شاہ سے بڑھ کر بہترین جیون ساتھی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے علی!'' سبریز خان ہلکے سے مسکرا دیا اور اس کے گلے سے لگا تھا مگر اس کے گلے سے لگتے ہی زوردار جھٹکا اس کو لگا تھا۔

''تمہارا تو پورا جسم آگ کی طرح دہک رہا ہے علی۔''

''ارے نہیں سبریز بھائی بس معمولی سا بخار ہے ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر چیک اپ کر کے گیا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بشاش لہجے میں بولا۔

''نہیں یہ معمولی نہیں ہے، اچھا تم لیٹو یہاں۔'' سبریز خان نے اس کو بیڈ پر زبردستی کر کے لٹا دیا تھا۔

"اوران سب ڈاکٹروں کو چھوڑو ہماری بازغہ خود کسی ڈاکٹر سے کم نہیں ہے۔"

"ویسے بازغہ کے بنائے ہوئے جڑی بوٹیوں کے قہوے سے رات تک تم بالکل پرفیکٹ نہ ہو جاؤ تو کہنا۔" دائم خان نے پرمزاح انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

علی شاہ کی نظر اب اس دشمن جاناں پر پڑی تھی اور اس کو ایسے بکھرے حلیے میں دیکھ کر جیسے اس کا دل تڑپ اٹھا تھا، کسی تیز دھاری تلوار سے اس کے جسم کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے تھے۔ وہ کب چاہتا تھا اس کو ایسی اجڑی وبکھری حالت میں دیکھنا، بنا سنگھار کے وہ صرف اس کا دل ہی دکھا رہی ہے۔ یہ بات شاید وہ نہیں جانتی، ان کے درمیان کچھ بھی ہو مگر علی شاہ نے تصور میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کے سامنے ایسی حالت میں بھی آسکتی ہے۔

کل والے سوٹ میں وہ ابھی بھی تھی، جس پر لاتعداد شکنیں تھیں۔ بنا چوڑیوں کی وہ کلائیاں کس قدر سونی سونی لگ رہی تھیں۔ بنا کاجل کے وہ جھکی اور بھیگی آنکھیں اس کی روح کو چیر رہی تھیں۔

دائم خان کی پرمزاح بات پر بھی اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

"ہوں۔"

بس "ہوں" پر ہی اکتفا کیا تھا جس کا مطلب ان لوگوں نے یہ ہی اخذ کیا کہ علی شاہ بازغہ سے سخت ناراض ہے۔ فی الحال وہ لوگ خاموش ہی رہے۔ ابھی علی شاہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی، اور دائم خان کی بات سچ ثابت ہوئی، بازغہ کا کڑوا جڑی بوٹی قہوہ پی کر وہ رات تک بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔

کچھ ہی دن میں علی شاہ بالکل صحت یاب ہو گیا تھا، اور یہ سارا کمال صرف بازغہ کے خیال اس کی دیکھ بھال کا نتیجہ تھا اور اس سے بھی بڑھ کر وہ جو اس کو ہر دو گھنٹے بعد جڑی بوٹیوں کے قہوے تو کبھی سوپ بنا کر دے رہی تھی اور وہ بچارا کسی میٹھے امرت کی طرح حلق میں اتار رہا تھا۔ صرف بازغہ کے لیے اس کی ایک نظر کے لیے۔

"یہ لیجیے۔"

بازغہ نے علی شاہ کے مگ میں قہوہ لا کر دیا، علی شاہ جو اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ کام کر رہا تھا اس کو آف کیا اور بازغہ کے ہاتھ میں بلیک کلر کا مگ دیکھا، اور جس طرح برا سا منہ بنایا تھا بازغہ نے بمشکل اپنی اچانک سے امڈتی مسکراہٹ ضبط کی تھی، اس کو یکدم سے تبریز خان کی یاد ضرور آئی تھی۔ وہ بھی اس کے بنائے قہوے کو دیکھ برے برے منہ بنایا کرتا تھا، مگر وہ بھی اس کے برے منہ کی پرواہ کے بنا زبردستی اس کو پلا دیا کرتی تھی۔

علی شاہ نے اس کی پرسوچ آنکھیں اور چہرہ پڑھ لیا تھا، مگر خاموش رہا اور اسی خاموشی سے وہ بلیک کلر کا مگ تھام لیا۔ بازغہ نگاہیں جھکائے وہاں سے جانے لگی، جبھی علی شاہ نے ہلکے سے پکارا۔ بازغہ نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہو چکا ہوں، اور میرا نہیں خیال کے ایسے قہوے پی کر اب بیمار پڑنے کا بھی ارادہ کر سکتا ہوں۔" اس کے بے ساختگی سے کہنے پر بازغہ کے خاموش لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

اسکائی بلیو کے ایزی شلوار سوٹ میں وہ نہایت وجیہہ لگ رہا تھا۔ بازغہ کو اس سے محبت تو نہیں ہوئی تھی مگر اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ اس کی اچھائی سے ضرور متاثر ہوئی تھی۔ علی شاہ سے اس نے بے شک بہت نفرت کی شدید نفرت، صرف اس وجہ سے کہ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے تبریز خان کی جگہ لے لی مگر وہ غلط تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ علی شاہ اس سے تبریز خان کی یادیں چھین لے گا اس کے وجود پر قابض ہو جائے گا، مگر وہ غلط تھی۔ اس کی سوچ غلط تھی۔ علی شاہ نے کبھی بھی اس پر اس کے جسم پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی، ورنہ وہ مرد تھا اس کا شوہر تھا، ان کے

درمیان قانونی وشرعی رشتہ تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا، اس سے اپنا حق لے سکتا تھا مگر علی شاہ نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ ہمیشہ اس کی ذات کو معتبر جانا اور شاید اسی لیے وہ بازغہ کے دل میں گھر کر پایا تھا اپنی ایک خاص جگہ بنا سکا تھا۔

"اگر میری ذات کا مکمل طور پر جائزہ لے لیا ہو تو کیا اجازت ہے اس کڑوے قہوے کو پینے کی۔" سبز نگاہوں میں جہاں بھر کی شوخی وشرارت لیے وہ بغور اسکو دیکھ رہا تھا، پیازی کلر کے خوب صورت سوٹ میں اس کے چہرے کی رنگت بھی ہم رنگ ہو رہی تھی۔ بازغہ نے حیا سے نگاہ جھکا لی۔

"میرا خیال ہے اب آپ واقعی بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں۔" بازغہ نے سنجیدگی بھرے لہجے میں اس کی شوخی پر طنز کیا تھا۔ پہلے وہ اس کی شریر نگاہوں اور شریر جملوں سے بہت چڑتی تھی مگر اب یہ ہی سب اچھا بھی لگنے لگا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے علی پتر۔" زبیدہ جہاں عصر کی نماز پڑھ کر یہیں چلی آئی تھیں اور ساتھ والے صوفے پر آرام سے براجمان ہو گئیں۔ بازغہ جو ان کے آنے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ کچن میں جنت بی بی کو کہا کہ ناشتے کی ٹرالی لے آئے اور واپس زبیدہ جہاں کے پاس آ بیٹھی تھی۔

"بے بے! تین دن سے یہ کڑوا قہوہ پی رہا ہوں کہ میرے اندر کے اعضاء بھی کہہ رہے ہیں علی بس کر دو خدارا، اب اور برداشت نہیں ہے۔" علی شاہ کے اتنی معصومیت اور بچارگی سے کہنے پر زبیدہ جہاں بھی ہلکے سے ہنس دیں۔

"میرے چاند یہ تمہاری صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔"

"بالکل، اب پلیز اپنی بہو کو کہیے رات کے ڈنر میں میری فیورٹ کچھ بہت چٹ پٹی سی ڈشز بنا دے۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنی ناک دو انگلیوں سے بند کی اور ایک سانس میں وہ کڑوا جڑی بوٹی والا قہوہ حلق میں اتار لیا۔ بازغہ کو صحیح معنوں میں بہت ہنسی آ رہی تھی مگر اس نے اپنے چہرے پر آتی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے جنت بی بی سے ٹرالی تھام لی اور پلیٹ میں کباب سرو کرنے لگی۔

"اچھا میں ایک بات سوچ رہی ہوں۔"

انہوں نے بازغہ کے ہاتھ سے پلیٹ تھام لی اور کباب کا ایک بائٹ منہ میں ڈالا اس دوران علی شاہ بھی فرمائش کر چکا تھا۔

بازغہ نے ترس کھا کر اس کی پلیٹ میں دو کباب کے ساتھ چلی سوس رکھا اور اس کی جانب پلیٹ بڑھائی۔

"تھینک یو۔" اس نے مسکراتے ہوئے پلیٹ تھام لی۔

"جی بے بے بتائیے کیا سوچ رہی ہیں آپ۔"

"مجھے کراچی جانا ہوگا، اربش اور اپنی ضویا کو لینے۔ عدت تو ویسے بھی میری ختم ہو چکی ہے تو بس یہ ہی سوچا کہ سب سے پہلے یہ ہی نیک کام کروں۔" علی شاہ نے کچھ نہیں کہا۔ چاہتا تو وہ خود بھی یہ ہی تھا مگر مجبور تھا۔

"میں جانتی ہوں سالار نے پوری جان لگا دی ہو گی اربش کو منانے میں۔ ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا دیا ہو گا اس کو یہاں لانے میں، مگر سالار کی چاہت پر اربش کا خوف بھاری ہو گیا ہے، ہم سے بہت سی زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوئی ہیں جن کا ازالہ کرنا بے حد ضروری ہے اور اگر میں اس بچی کے آگے جھک جاؤں گی اس سے معافی مانگ لوں گی تو مجھے کوئی شرم نہیں، کوئی ندامت نہیں۔" زبیدہ جہاں نرم لہجے میں بولیں۔

"اور پھر حویلی میں اپنی دونوں بہوؤں کے اعزاز میں ایک شاندار وعمدہ دعوت کا اہتمام کرواؤں گی۔" انہوں

نے جانثار نگاہوں سے اپنے ساتھ بیٹھی بازغہ کو دیکھا۔
''تو ٹھیک ہے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' بالکل چلو بلکہ بازغہ بھی چلے گی ہمارے ساتھ، وہاں کے سب سے مہنگے بوتیک سے میں اپنی دونوں بہوؤں کے لیے خوب صورت سا سوٹ خریدوں گی۔''
علی شاہ نے محبت سے بازغہ کو دیکھا تھا، شاید وہ اپنی محبت میں سرخرو ہو جائے، اس کی محبت و چاہت سے بھری سبز نگاہوں کی تپش وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

☆......☆

زبیدہ جہاں دوسرے ہی دن علی شاہ اور بازغہ کے ہمراہ ''ملک ولا'' پہنچ چکی تھیں۔
''ماشاءاللہ! پوری بنی بنائی میری ضویا ہے۔ وہی آنکھیں وہی ناک ویسے ہی ہونٹ اور ایسی ہی کھلتی گلابی رنگت۔'' زبیدہ جہاں نے گود میں لی گڑیا کو نظر بھر کے دیکھا تھا بلکہ کبھی اس کی آنکھوں پر تو کبھی ناک ہونٹ پر بوسہ لے رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ضویا شاہ ان کی گود میں واپس آ گئی ہو، ویسے ہی ان سے لاڈ اٹھوا رہی ہو، زبیدہ جہاں کی آنکھوں میں پانی سا بھر گیا، گڑیا کو گود میں لے کر جہاں ان کا دل ضویا شاہ کے لیے اس کی یاد کے لیے تڑپا تھا وہیں ان کے دل کو سکون ملا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ٹھنڈک کا احساس پیدا ہوا تھا۔
سب ان کی اس محبت کو دیکھ رہے تھے ان کے جذبے کو دیکھ رہے تھے، ان کی بھیگی آنکھوں کو دیکھ رہے تھے......اس ماں کی ممتا کو دیکھ رہے تھے جو وہ گڑیا پر نچھاور کر رہی تھیں۔
سالار شاہ زبیدہ جہاں کے برابر میں بیٹھا تھا۔
''بے بے!'' سالار شاہ نے ان کے شانے پر نرمی سے اپنا آہنی بازو پھیلا دیا تھا، زبیدہ جہاں نے سالار شاہ کو رخ گھما کے دیکھا۔
''سالار۔'' گلوگیر لہجہ بھیگی آنکھوں سے وہ سالار شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔
''سالار ضویا ہے نا یہ۔''
''جی بے بے!'' اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلایا۔
''گھر لے کر چلیں گے ہم اپنی بیٹی کو۔''
''بالکل بے بے!''
''مگر یہ تو بتاؤ ہماری بہو کہاں ہے؟'' انہوں نے متلاشی نگاہیں اپنے اطراف میں دوڑائیں مگر ناکام ہو گئیں کیونکہ اربش ان کو کہیں نہیں دکھائی دی، سالار شاہ نے بھی ادھر ادھر نظر ڈالی مگر وہ کہیں نہیں تھی، اس کو کچھ شرمندگی کا احساس ہوا وہ کیونکہ محسوس نہیں کر سکا کہ وہاں اربش موجود نہیں ہے۔
''میرا خیال ہے وہ اپنے روم میں ہے۔ میں لے کر آتی ہوں۔''
انشراح جس کے دل میں کچھ خفگی سی آ گئی تھی زبیدہ جہاں کو لے کر کہ انہوں نے نہ تو اربش کا پوچھا نہ اس کا خیال آیا، وہ شاید یہاں صرف اپنی پوتی سے ملنے آئی ہیں۔
جبھی سالار شاہ کی نگاہ روم کے دوسرے دروازے کے پردے پر پڑی جہاں اربش کا بلیو جارجٹ کا دوپٹا جھانک رہا تھا۔
''ایک منٹ انشراح۔'' سالار شاہ نے اٹھتی ہوئی انشراح کو ٹوکا، اور خود کھڑا ہو گیا۔
''بے بے مجھے دیں۔'' بازغہ نے دونوں ہاتھ پھیلائے گڑیا کو لینے کے لیے تو زبیدہ جہاں نے احتیاط سے کسی

کانچ کی گڑیا کی طرح ضویا کو بازغہ کو دیا۔
''یہاں کیوں کھڑی ہو اندر آؤ بے بے بلا رہی ہیں تم کو۔'' سالار شاہ کی قریب سے آتی بھاری آواز پر وہ بری طرح چونک کر رہ گئی۔
''ن، نہیں۔'' اس نے تیزی سے نفی میں ادھر ادھر گردن ہلائی، سالار نے بغور اس کے چہرے کا خوف دیکھا تھا۔
''مگر کیوں؟''
''مجھے بڑی سرکار سے بہت ڈر لگتا ہے۔''
وہ سمجھ سکتا تھا اس کے ڈر کو، اور جس طرح وہ کانپ رہی تھی یہ بھی محسوس کر سکتا تھا، مگر اب اربش کو سمجھنا ہوگا، اس کو جاننا ہوگا کہ وہ ہمارے لیے بہت اہم ہے۔
''کچھ نہیں ہوگا تم آؤ میرے ساتھ، میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔'' سالار شاہ نے اس کے کپکپاتے سہمے وجود کو اپنے حصار میں لیا اور ڈرائنگ روم میں آنے لگا، مگر اربش نے اس کی قمیص زور سے مٹھی میں دبوچ لی تھی، بہت مشکل سے وہ سالار شاہ پر اعتبار کر پائی تھی، اس پر بھروسہ کر پائی تھی۔
زبیدہ جہاں نے گردن موڑ کے دیکھا جہاں سالار شاہ اس کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیے چلا آ رہا تھا، اربش کی ڈری سہمی کیفیت وہ دور سے بھی محسوس کر سکتی تھیں، وہ خود ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئیں۔
''یہاں آؤ۔'' زبیدہ جہاں نے شفقت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے نرم و ملائم آنکھوں سے اس کو دیکھا تھا، مگر اربش نے مزید مضبوطی سے سالار شاہ کی قمیص پر گرفت سخت کر دی۔ زبیدہ جہاں خود آگے بڑھیں، اربش کے ڈر و خوف کا انہیں اندازہ تھا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور ایک قدم مزید آگے بڑھیں۔
''ہم جانتے ہیں ہم سے بہت ناانصافیاں بہت سی زیادتیاں ہوئی ہیں۔ میری ذات سے تمہیں بہت نقصان پہنچا ہے، بہت ایذا دی ہے تمہیں، تکلیف، دکھ، غم ملے ہیں۔ تمہارا دل بھی دکھایا ہے۔''
پورے ہال میں خاموشی کا راج تھا جس کو صرف زبیدہ جہاں کی سنجیدہ اور شرمندہ آواز چیر رہی تھی، ان کے بھیگے لب و لہجے سے ان کے پشیمان انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ان کو حالات نے بہت بدل دیا ہے۔
رحمت جو دور کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی وہ تو زبیدہ جہاں کو جانتی تھی اچھی طرح ان کی عادت و اطوار سے واقف تھی، ایک سخت دل غرور سے بھری ہوئی عورت آج اگر ٹوٹی ہوئی ہے تو اس کی بھی بڑی وجہ ہے، ورنہ زبیدہ جہاں کی سرشت میں کہاں تھا جھکنا معافی مانگنا۔
''ہم جیسے لوگ اپنے گھمنڈ اپنے غرور میں اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں کہ ہم سب کا مالک ہمارا رب سائیں سب سے زیادہ طاقت ور ہے، جو بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ میں نے بھی وہی کیا......میں جو سمجھتی تھی مجھ پر، میری اولادوں پر کبھی کوئی برا وقت نہیں آئے گا، میں جو سمجھتی تھی کہ صرف حکمرانی کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہوں۔ جیسے اس جہاں میں، میں اپنی مرضی سے جیتی ہوں لوگوں پر حکمرانی کرتی ہوں ایسے ہی اگلے جہاں میں میرا راج رہے گا، تو میں غلط سوچتی تھی۔ حالات نے مجھے بہت بڑا دھچکا دیا ہے۔ عرش سے زمین پر ایسے پٹخا ہے کہ اگر خود کے ٹکڑے بھی گننا چاہوں تو مشکل ہے۔'' وہ کچھ دیر رکی تھیں، سانس لینے کو یا پھر ان کا دل بہت زیادہ بھر آ گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی نکلنے لگی تھی۔
علی شاہ جو چپ چاپ ان کو سن رہا تھا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور چلتا ہوا زبیدہ جہاں کے پاس آیا ان کے جھکے

شانے پر اپنا بازو دھر دیا۔

”ضویا شاہ کو جب سوچتی ہوں تو پوری نظر گھماؤ عقل دوڑاؤں بھی تو یاد نہیں پڑتا کہ میری ضویا شاہ کو معمولی سی بھی پھانس چبھی ہوگی، مگر جب یہ سوچتی ہوں کہ کتنی اذیت کتنی تکلیف سے اس کی جان نکلی ہوگی۔ اتنی آسانی سے تو اس کے جسم سے روح نہیں نکلی ہوگی...... نہایت بے رحمی سے بے دردی سے اس کو مارا گیا ہے اور اس طرح...... زیادتی کا شکار کر کے......“ زبیدہ جہاں کے لفظ لڑکھڑانے لگے ان کا لہجہ کانپنے لگا۔

”بے بے!“ علی شاہ نے ہلکے سے پکارا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ یہ سب دہرا کے خود کو اذیت میں ڈالیں۔

”جب یہ سب سوچتی ہوں تو میری روح کانپ اٹھتی ہے...... میرا رواں رواں تڑپ اٹھتا ہے...... میرے جسم کے ہزاروں ٹکڑے ہو جاتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جسم کا ایک ایک اعضاء کٹ کٹ کے گر رہا ہے۔“ وہ پھر چپ ہو گئیں۔

”میں کتنی ناسمجھ اور بے وقوف تھی...... ضویا کو خواب میں ہر روز ایسی اجڑی بکھری حالت میں دیکھتی کبھی خون میں لت پت تو کبھی چیختے چلاتے، روتے تڑپتے...... مگر سمجھ ہی نہیں سکی کہ میری نازوں سے پلی بچی کو ایسی اذیت سے مارا گیا ہے اور اس کا دکھ اس کی تکلیف کم کرنے کے ہم نے تم کو اذیت دی، دکھ دیئے کیونکہ ہم اپنے رب سائیں کی وحدانیت کو فراموش کر چکے تھے۔ ہم بھول چکے تھے کہ وہ سب دیکھ رہا ہے، ہر شے سے باخبر ہے۔“

بی بی جان جن کی آنکھیں بھر آئی تھیں یہ سب دیکھ اور سن کر جو اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتی تھیں اس وقت اپنے مولا کریم کے انصاف پر ان کا دل رو پڑا...... وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور زبیدہ جہاں کے قریب آئیں۔

”صبر کرو بیٹا! زندگی سے بہت کچھ سیکھتے ہیں، یہ زندگی ہمیں اگر بہت کچھ نوازتی ہے تو بہت کچھ لے بھی جاتی ہے، یقیناً ضویا کے ساتھ جو ہوا بہت غلط ہوا، مگر ہم صبر اور حوصلے کا دامن تھام کر اس بچی کے لیے مغفرت کی دعا تو کر سکتے ہیں۔“

”صبر ہی تو نہیں آ رہا بی بی جان!“ وہ بری طرح سسک اٹھیں۔ ”مگر اس کے علاوہ کیا کر سکتی ہو، غریبوں، مسکینوں، یتیموں کو دیکھو، ان کے درد دکھ غم کو محسوس کرو۔ ہو سکے تو ان کی مدد کرنے کی کوشش کرو تو تمہارے دل کو سکون ملے گا، غلط فہمی کی بنیاد پر اس بچی کے ساتھ بہت سی ناانصافیاں، زیادتیاں ہوئی ہیں تو مداوا کرو، ازالہ کرو، دیکھو اس بچی کی طرف۔“ بی بی جان نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے سالار شاہ سے بالکل لگی ڈری سہمی اربش کی طرف اشارہ کیا۔

زبیدہ جہاں نے اربش کو دیکھا، جس کے چہرے اور آنکھوں سے دہشت ٹپک رہی تھی۔

”وہی تو کرنا چاہتی ہوں بی بی جان! میں نے اس معصوم پر ظلم کی انتہا کر دی تھی۔ میری زیادتی سے اس بچی کی روح گھائل ہوئی ہے، اس کی شخصیت بکھر کے رہ گئی ہے، آج اگر یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے تو ہماری زیادتی کی وجہ سے، اس کی ذات مجروح ہوئی ہے تو اس کے ذمے دار بھی ہم ہیں۔“ زبیدہ جہاں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہلکے سے ہاتھ رکھا تو وہ مزید سالار شاہ میں سمٹ کر رہ گئی، زبیدہ جہاں نے ہلکی سی کوشش بھی کی تھی اربش کو خود سے لگانے کی مگر وہ سالار شاہ کو مزید سختی سے تھام گئی۔

”اربش بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس۔“ بی بی جان زبیدہ جہاں کی بے بسی بھی دیکھ رہی تھیں اور اربش کو بھی، جو کسی بھی طرح زبیدہ جہاں پر یقین کرنے کو راضی نہیں تھی۔

”آؤ ادھر۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا بلکہ اس کے بازو کو پکڑ لیا اور اپنی طرف کیا۔ مگر اس کا ہاتھ

ابھی بھی سالار شاہ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

اس نے بہت مشکل سے سالار شاہ پر بھروسہ کرنا سیکھا ہے اور یہ سالار شاہ ہی جانتا تھا یا اس کا رب کہ کیسے وہ اربش کے اعتماد کو جیتنے میں کامیاب ہوا تھا، سالار شاہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

بی بی جان اربش کو لے کر صوفے پر آ بیٹھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اربش سب کے ساتھ بیٹھے باتیں کرے اس کا دماغ فریش ہو۔ سالار شاہ نے زبیدہ جہاں کو تھام لیا تھا۔ دونوں سائیڈ ان کے دونوں بیٹے کھڑے تھے۔

”سب بہتر ہو جائے گا ان شاء اللہ، پریشان نہ ہوں آپ۔“ علی شاہ نے سہولت سے سمجھایا۔ وہ بھی اربش کو سمجھ سکتا تھا، اس کی کیفیت دیکھ چکا تھا۔ اس کو ضویا شاہ کا وہ وقت یاد آ گیا جب اس کا گہوارہ حویلی میں رکھا تھا اور اربش کو بڑی بری طرح سالار شاہ نے پھینکا تھا اس گہوارے کے پاس۔

بازغہ نے اربش کو دیکھا اور دو تین باتیں بھی کیں مگر وہ صرف ہوں، ہاں کا جواب دیتی مگر انشراح بہت باتونی تھی۔ وہ خوش بھی بہت تھی اربش کے لیے، وہ جان گئی تھی کہ اب آگے اربش کے لیے زندگی بہت سہل ہے۔

☆......☆

زبیدہ جہاں کا کچھ دن تک کا قیام یہیں ”ملک ولا“ میں رہا تھا، بہت اچھی مہمان نوازی کی تھی ان لوگوں نے، ان کے حسن سلوک ان کے برتاؤ کی تو وہ گرویدہ ہو گئی تھیں، سب کچھ کھلانے پلانے سے ہی انسان اس کی تعریف نہیں کرتا، اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے ہمارا اخلاق، جو سامنے والے کی دل و جان سے نا صرف عزت و قدر کرتا ہے بلکہ تاقیامت بھی یاد رکھتا ہے اور زبیدہ جہاں دل و جان سے رافعہ ملک کی بی بی جان کی عزت کرتی تھیں۔ وہ انشراح سے بھی ملی تھیں۔

اس نے اس دن جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ سب اس نے زبیدہ جہاں کو بتا دیا تھا۔ اس رات وہ انشراح کو خود سے لگا کر بہت روئی تھیں بہت معافیاں مانگی تھیں...... ایک ذرا سی غلطی نے ہنستے بستے خاندان کو بکھیر دیا تھا۔ انشراح بھی اپنے اماں، ابا کو یاد کر کے بہت روئی تھی مگر جو چلا گیا وہ واپس بھی تو نہیں آ سکتا، ہاں بہت سی تکلیف اور درد اٹھا کے اس کو رائب ملک کی صورت میں ایک بے حد چاہنے والا پیار کرنے والا جیون ساتھی مل گیا تھا۔

زبیدہ جہاں نے انشراح کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تھا، انہوں نے اس کو بہت تسلی دلائی تھی کہ وہ اربش کو اپنی بہو نہیں اپنی بیٹی جیسا پیار دیں گی۔

وہ رافعہ ملک کے ساتھ کراچی کے مہنگے ترین شاپنگ مال سے سب کے لیے بہت سی شاپنگ کر کے لائی تھیں۔ اربش اور بازغہ کے لیے اوپن شرٹ کے ساتھ آج کل جو غرارے چل رہے تھے وہ لے کر آئی تھیں۔

ایک غرارے کی قیمت تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔ کام جتنا بھاری تھا اتنا ہی خوب صورت تھا۔ وائٹ نگوں کا کام ہم رنگ دبکا اور گولڈن باریک دھاگے کی نازک کڑھائی۔

اربش کا کلر پنک اینڈ پرپل امتزاج کا تھا تو بازغہ کا لائٹ فیروزی اینڈ لائٹ پستہ امتزاج کا تھا۔ دونوں کے بالکل ایک جیسے تھے صرف کلر میں فرق تھا۔ اب دونوں کو جو پسند آئے وہ لے لے، بازغہ نے اربش پر چھوڑ دیا، اس کو جو پسند ہو وہ لے لے، مگر اربش نے کچھ نہیں کہا اس کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے کبھی ایسے مہنگے کپڑے خواب میں دیکھے بھی ـــــ ہوں گے، حویلی میں جو کپڑے اس نے پہنے وہ تو اس پر بھی شاکر تھی، کبھی اس نے حرف شکایت نہیں کی۔ کبھی اپنے رب سے گلہ نہیں کیا۔

☆......☆

حویلی میں بہت بڑے پیمانے پر زبیدہ جہاں نے دعوت رکھی تھی۔ خاندان بھر کے ہر فرد کو مدعو کیا تھا، دوست احباب، رشتے دار، سسرالی رشتے دار یہ خالی دعوت ہی نہیں تھی بلکہ اربش اور بازغہ کا دعوت ولیمہ اور اپنی پوتی ضویا کی خوشی بھی تھی، حویلی کو مکمل دلہن کی طرح سجایا گیا ہر شے چمک دمک رہی تھی ہر چہرہ خوشی سے مسکرا رہا تھا۔

عالم شاہ کی پوتی ''ضویا شاہ'' جسے ہر شخص نے دعا دی تھی، تحائف دیے تھے۔ زبیدہ جہاں کی گود میں سمٹی سی گڑیا کو ہر کوئی رشک بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، پیار کر رہا تھا۔

تقریباً سب ہی مہمان آ چکے تھے اور اب وہ لوگ اس حویلی کی بہوؤں کو دیکھنا چاہتے تھے، ان کو اچھے نصیب کی دعا دینا چاہتے تھے، ان سے ملنا چاہتے تھے۔

اس قدر بھاری سوٹ اوپر سے خاندانی گولڈ کا زیور، چوڑیاں، مہندی اتنا کچھ اس نے پہلے کب پہنا تھا، اتنا ہیوی میک اپ گویا وہ سر کے بالوں سے پیر کے ناخن تک مکمل طور پر بدل چکی تھی بلکہ جب وہ سنبھلتی سنبھلتی قد آور آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو خود کو ہی پہچان نہیں سکی۔

''بہت حسین لگ رہی ہو۔'' سالار شاہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا، اور صاف شفاف شیشے میں اس کا عکس دیکھا۔ وہ کچھ پریشان بھی تھی مگر کیوں؟''

سالار شاہ نے اس کو دونوں شانوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی جانب موڑ لیا تھا۔ اس کے جھکے چہرے اور جھکی نگاہیں جس پر پہرا دیتی لمبی گھنیری پلکوں کی باڑ، سالار شاہ نے بغور یہ چہرہ دیکھا، جو اس کی زندگی بن گیا تھا۔ اس کا عشق اس کا جنون بن گیا تھا، جو اس کی بیوی اس کا پیار ہی نہیں اس کی بیٹی کی ماں بھی تھی تو کیسے وہ نہ چاہے کیسے نہ وہ اس کا دیوانہ ہو۔

سالار شاہ نے اس کا معصوم سا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھرا تھا اور پھر اسی چاہت سے اوپر کو اٹھایا تھا۔

''مجھے نہیں بتاؤ گی اپنی پریشانی کی وجہ۔''

''آپ ڈانٹیں گے تو نہیں؟'' کتنی معصومیت تھی اس کے چہرے اور آنکھوں میں اُس کے لہجے میں، سالار شاہ فدا ہی تو ہو گیا تھا، جب انداز بدلا تو دیکھنے کا انداز تو خود بخود بدل گیا تھا۔

''بالکل بھی نہیں، اس وقت تو قیامت لگ رہی ہو ایسا سوچنا بھی کفر ہے۔'' اس کی ذومعنی بات اربش کی سمجھ سے بالاتر تھی کیونکہ وہ اپنی الجھن سے پریشان تھی۔

''بولو۔''

''مجھ سے اتنے بھاری سوٹ میں چلا نہیں جا رہا۔''

سالار شاہ کو اس کی بات پر ہنسی آئی تھی، وہ تو سمجھا تھا کوئی اور بات ہو گی۔

''مگر...... کیوں اتنا خوب صورت تو لگ رہا ہے اور تم پر تو اور زیادہ کھل رہا ہے۔'' سالار شاہ نے سچائی سے کہتے ہوئے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا، سالار شاہ کے اس طرح دیکھنے پر وہ حیا سے خود میں سمٹ کر رہ گئی۔ پہلے کب اس نے یہ پیار لٹاتی نظریں دیکھی تھیں۔

''اچھا اس کا ایک حل ہے میرے پاس، اگر تم مانو تو۔'' سالار شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے اور اپنی پشت پر باندھ دیے۔

''وہ کیا؟'' اربش نے سیاہ نین اوپر اٹھائے۔

''وہ یہ کہ میں تمہیں اپنی بانہوں میں اٹھا کے لے چلوں۔''

''اف۔'' اربش کے لبوں پر شرمگیں مسکراہٹ نے اپنا گھر بنا لیا۔ وہ جو نگاہیں اوپر کو اٹھائے سالار شاہ کو دیکھ رہی تھی وہ نگاہ خود بخود سرخ عارض پر جھکتی چلی گئی۔ اس کی اس ادا نے سالار شاہ کو مزید اس کا دیوانہ بنا دیا۔ وہ مزید آگے بڑھا اتنا کہ اب انچ بھر کا فاصلہ بھی نزدیکی میں سمٹ چکا تھا، اس بار ان نگاہوں میں اس چہرے پر ڈر خوف کی وجہ سے اربش کا یوں سالار شاہ کی بانہوں کے حصار میں سمٹنا نہیں تھا بلکہ حیا کے ہر ہر رنگ اس کے وجود سے ظاہر ہو رہے تھے۔

وہ مکمل تیار ہو چکی تھی بس اس کا وہ بھاری دوپٹا سیٹ ہو کر نہیں دے رہا تھا، حالانکہ ماہر بیوٹیشن بہت اچھے سے سیٹ تو کر گئی تھی مگر اس کو پسند نہیں آیا تو اس نے اتار دیا، اور اب دس منٹ سے وہ اپنے اس بھاری بھر کم پستہ کلر کے دوپٹے سے الجھ رہی تھی اور اس کی وجہ بھی کوئی چھوٹی یا عام سی نہیں، بہت بڑی اور خاص وجہ تھی۔

علی شاہ جو بیڈ پر کوئی آدھے گھنٹے سے اس کی کاروائی دیکھ بھی رہا تھا اور اپنے موبائل میں بھی لگا ہوا تھا، مگر بازغہ کو محسوس ہونے نہیں دیا کہ اس کے دھیان کے سارے دھاگے صرف ایک اس وجود سے الجھے ہوئے ہیں، اس کے چہرے کی بیزاری اور بے چینی وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا مگر صرف اس کے پکارنے کا انتظار کر رہا تھا، اس واقعہ کے بعد علی شاہ نے بازغہ کو تنگ کرنا یا وہ اس واقعے سے پہلے تھا سب ویسا نہیں رہا تھا۔ کمرے کے باہر وہ اس سے ہلکی پھلکی بات ضرور کر لیا کرتا تھا مگر کمرے کے اندر وہی سرد جنگ دونوں کے درمیان تھی، مگر علی شاہ نے بھی ٹھان لیا تھا کہ اب کی بار بازغہ کو قدم بڑھانے ہوں گے خود اس کو چل کر آنا ہو گا، حالانکہ ان سبز کانچ میں ایک دلفریب سا تبسم گھرا ہوا تھا جس کو وہ فی الحال چھپا گیا تھا۔

یہاں بازغہ کو الجھن اور بے چینی اس بات کی تھی کہ علی شاہ جو کتنی دیر سے یہاں بیڈ پر بیٹھا ہے وہ کیوں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا کیوں متوجہ نہیں ہو رہا جب کہ اس بیڈ روم کی خاموشی میں بازغہ کی ہم رنگ چوڑیاں شور کر رہی تھیں تو کبھی اس کے پیروں کی پائل کی جھنکار چیخ چیخ کے اس کو بلا رہی تھی۔ ٹھیک ہے اس سے غلطی ہو گئی وہ شرمندہ ہے، اب کیا جان لے گا۔ علی شاہ کو ٹائم گزرنے کا احساس شدت سے ہوا تھا سب مہمان تقریباً آ چکے تھے اور وہ محترمہ ابھی تک اپنے دوپٹے میں ہی الجھی ہوئی ہیں۔

بازغہ کے ہاتھوں سے دوپٹا گر گیا جس کو اٹھانے کے لیے وہ جھکی اس سے پہلے ہی علی شاہ نے اٹھا لیا اور نہایت گہری نظروں سے دیکھنے کے بعد آگے بڑھا اور اس کے شانے پر ڈال کر بیک سائیڈ سے پھیلا کے اس کی مرمریں نازک کلائی تھامی اور ڈریسنگ ٹیبل سے ایک سیفٹی پن لے کر اس کی کلائی پر اٹکا دیا، اور خود پیچھے ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔

''یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا۔ تم بھی کر سکتی تھیں مگر کیوں نہیں کر پا رہی تھیں۔ اس کا کیا جواز ہے۔ وہ بھی بتا دو۔''

بازغہ جو خود علی شاہ کے سرد رویے سے تھک گئی تھی اب اس کی بانہوں کے حصار میں آ کر آرام کرنا چاہتی تھی۔ اپنی زندگی کی نئی شروعات کرنا چاہتی تھی۔ اس کو آگے بڑھنا ہو گا اس کو جھکنا ہو گا۔ وہ علی شاہ سے دور نہیں رہ سکتی اور یہ اس نے ان چند دنوں میں ہی جان لیا تھا۔

علی شاہ کا بس یہ کہنا تھا اور وہ بے ساختہ اس کے سینے سے لگی تھی، علی شاہ جس کے چہرے پر دلفریب سا ایک تبسم

ٹھہرا ہوا تھا، بازغہ کے اس طرح سینے سے لگ کر سسکنا اس کی جان ہی تو لے گیا۔

''آئی ایم سوری، میں نے غلطی کی ہے، پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے، اس سے معافی مانگے ایسا تو علی شاہ نے نہیں چاہا تھا۔

بازغہ اس کا پیار ہی نہیں اس کا عشق اس کا جنون ہے، وہ بھلا کیسے اپنے پیار کو شرمندہ ہوتے دیکھ سکتا ہے۔

بازغہ کی ہچکیوں کی زد میں وجود پر علی شاہ نے اپنی محبت وچاہت کا حصار کھینچ دیا تھا۔

''پلیز علی! مجھے معاف......'' بازغہ اس کے سینے سے سر اٹھا کے اس کو دیکھنے لگی تھی۔

''شش۔'' علی شاہ نے جلدی سے اس کے سرخ ہونٹوں پر اپنی انگشت شہادت رکھ دی۔ ''میری محبت کی یوں توہین مت کرو معافی مانگ کر، جو ہوا وہ گزرا کل تھا جس کو یاد کر کے ہم دونوں کو تکلیف ہوگی، اور مجھے تم سے زیادہ ہوگی جب تم اس طرح اشک بہاؤ گی۔'' علی شاہ نے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھا، بازغہ نے نگاہیں جھکا لیں، کتنی دیر تک وہ بازغہ کے چہرے پر کھیلتے قوس قزح کے رنگوں کو تکتا رہا۔

''ویسے جان لینے کے آج تمہارے پاس سارے ہتھیار ہیں۔'' علی شاہ کا اشارہ اس کے سجے سنورے روپ کی طرف تھا۔

''بس ایک چیز کی کمی ہے۔'' علی شاہ نے اپنی واسکٹ سے ایک سرخ کلر کی ویلوٹ کیس نکالا اور اس کو کھول کر اس کے آگے کر دیا۔

بازغہ نے دیکھا، یہ وہی بریسلٹ تھا جو اس نے نہایت بے دردی سے پھینکا تھا اور شاید ٹوٹ بھی گیا تھا۔

''اجازت دو گی اس کو پہنانے کی۔'' اس نے اجازت طلب نظروں سے بازغہ کی کاجل سے بھری آنکھوں میں جھانکا۔ بازغہ کی بادامی آنکھوں میں وہ وقت عکس بن کے جھلملانے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی جگہ مضبوط بناتا علی شاہ نے اپنی چوڑی ہتھیلی کی پشت اس کے عارض پر پھیری۔

''میں آج بھی زبردستی کا قائل نہیں ہوں تمہیں تمہاری رضامندی سے اپنانا چاہتا ہوں۔''

''اور اگر میری رضامندی آپ کی خوشی میں خوش رہنے کی ہے تو۔'' بہت خوب صورت اقرار کیا تھا بازغہ نے، علی شاہ اندر تک پرسکون ہوگیا۔

''تو پھر میں اس دعوت کے ختم ہونے کا شدت سے انتظار کروں گا۔''

''تم نے رضامندی دے دی، میری پناہوں میں آنے کی اجازت دے دی تو پھر ہر جسارت، ہر گستاخی کے لیے خود کو تیار رکھنا۔'' پرشوق لہجہ سبز کانچ میں جہاں بھر کا پیار، بازغہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

اس کے چہرے پر حیا کا ہر رنگ چمک رہا تھا۔

علی شاہ نے اس کی کلائی تھامی اور وہ بریسلٹ اس کی کلائی میں بڑے پیار سے باندھ دیا اور وہیں اپنے عشق کی ایک مہر ثبت کر دی۔ ''یاد رکھنا تم سراپا محبت اور میں تمہاری محبت کا پیاسا...... آج ہر دیوار توڑنی بھی پڑے تو تم بچ نہیں پاؤ گی۔''

بازغہ ہلکے سے مسکرادی اور مسکراتے ہوئے ایک بار پھر خود کو اس کے حوالے کر دیا۔ علی شاہ نے اس کی پیشانی پر اپنی چاہت کی ایک تحریر رقم کر دی۔ وہ سرخرو ہوگیا آج اپنی محبت کے آگے۔ آج اس نے بازغہ کو جیت لیا۔ اس کا پیار جیت لیا تھا۔

''اور بتاؤ یہ رائب تم کو تنگ تو نہیں کرتا۔'' انابیہ نے انشراح سے پوچھا۔

دونوں کافی دن بعد ملی تھیں تو خوب باتیں ہوئیں۔

''انابیہ آپی! رائب بہت اچھے ہیں بس مجھے ان کی ایک ہی چیز سے شکایت ہے۔'' انشراح وہی اپنا پرانا دکھڑا لے کر بیٹھ گئی، وہ آج بھی بہت بے وقوف سی تھی۔

''اچھا مجھے بتاؤ میں ابھی اس رائب کے بچے کے کان کھینچتی ہوں۔'' اس نے بہت سنجیدہ انداز میں کہا تھا مگر وہ جانتی تھی سمجھ سکتی تھی اس کی بے بسی۔

''یہی کہ یہ مجھے رات بھر سونے نہیں دیتے۔'' بے ساختہ شکوہ زبان پر آگیا، اس بار وہ اپنی بے ساختہ اٹھتی مسکراہٹ روک نہیں سکی۔

''اور سونے کیوں نہیں دیتا۔'' تجسس برقرار تھا۔

''میں بتاؤں تم کو کہ کیوں سونے نہیں دیتا۔''

پیچھے سے رائب ملک اور داہم خان نے یکدم انٹری ماردی۔

''دنیا بدل جائے گی مگر تمہاری جاسوسی والی عادت نہیں بدلے گی۔'' رائب ملک نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر ماری جب کہ داہم خان مسلسل اس کو گھورے جا رہا تھا۔

''اور نہ ہی میری بیوی کی یہ بے وقوفی والی حرکتیں۔'' رائب ملک نے انشراح کو شکایتی نظروں سے دیکھا جس پر وہ منہ بنا کر رخ پھیر گئی اور یہ حرکت انابیہ سے چھپی نہیں رہ سکی، وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''کتنی بار کہا ہے کہ یوں مت ہنسا کرو مگر مجال ہے جو کان پر جوں بھی رینگی ہو۔'' داہم خان نے جھڑکنے کی کوشش تو پوری کی تھی مگر انابیہ کے آگے زور نہیں چلا۔

''رہنے دے داہم کیوں خون جلا رہا ہے یہ صنف بدلنے والی نہیں ہے ہر کل ٹیڑھی ہے ان کی۔'' رائب ملک نے تپ کر جواب دیا۔

''تو جب پتا ہے ہم نہ بدلنے والی ہیں اور نہ ہی سدھرنے والی تو کیوں ناکام کوشش کرتے ہو۔''

رائب ملک اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ انابیہ کبھی نہیں بدلے گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

''اور دوسری بات یہ بتاؤ کہ تم دونوں کیا کن سوئیاں لے رہے تھے شرم تو آتی نہیں دو لڑکیاں آپس میں پرائیوٹ باتیں کر رہی تھیں اور تم دونوں محلے کی کسی لڑاکا اور چغل خور عورت کی طرح ہماری باتیں سن رہے تھے۔'' اس القاب پر تو داہم خان صحیح معنوں میں جلبلا کے رہ گیا۔

''کبھی تو عقلمندوں والی بات کر لیا کرو۔'' داہم خان نے جل بھن کر سلگتے انداز میں کہا تھا اس پر رائب ملک کے ساتھ ساتھ انابیہ بھی زور سے ہنس دی۔

''قسم سے انابیہ! دائم کی برداشت کو داد دینے کو دل کرتا ہے جو تم جیسی چیز کو برداشت کرتا ہے۔'' رائب ملک نے ایک اور چٹکلہ چھوڑا تھا۔ جس پر داہم خان نے نہایت گھور کے پہلے رائب ملک کو دیکھا پھر انابیہ کو، اس کے گھورنے پر انابیہ کا ایک بار پھر بلند قہقہہ ابھرا تھا۔

''خود تو مرنا ساتھ مجھے بھی لے کر مرنا۔'' رائب ملک، دائم خان کی گھوریاں بھی دیکھ رہا تھا اور انابیہ کی ہنسی بھی جو رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، وہ جانتا تھا کہ داہم خان کو عورتوں کا یوں قہقہہ لگانا سخت ناپسند تھا۔

''اتنا ٹائم ہو گیا مگر داہم خان کی محبت کا بھی تم پر کوئی اثر نہیں ہوا، مجال ہے جو تمہاری عادتوں اور حرکتوں میں معمولی سا بھی فرق آیا ہو۔''

”ڈیئر فرینڈ عادتوں اور حرکتوں میں برکت تو ضرور ہو سکتی ہے مگر کمی نہیں۔“ شریر لہجے میں کہتے ہوئے داہم خان کو دیکھنے لگی، مگر جلدی اس کو اپنی ہنسی کا گلا گھونٹنا پڑا، کیونکہ داہم خان کا چہرہ دیکھ کر صاف ظاہر تھا وہ اس کو سالم ہی نگل جائے گا۔

”ارے باپ رے میں تو اب بھاگوں ورنہ تمہارا دوست یہیں میرا قتل کر دے گا۔“ ڈرنے کی مکمل ایکٹنگ کی گئی۔

”یہ نیک کام اس کو بہت پہلے نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ رائب ملک نے کہا۔

”سب سمجھتی ہوں تمہارے تپنے کی وجہ مگر خیر ہے، انشراح گھر آنا مل کر ہم دونوں خوب باتیں کریں گے کمرہ بند کر کے۔“ اس کی باتوں سے محظوظ ہوتی انشراح سے کہا۔

”اور تمہیں لگتا ہے میں تمہارے پاس اپنی معصوم بیوی کو چھوڑ دوں گا۔“ رائب ملک نے جھٹ پٹ جواب دیا۔

”یہ تو وقت بتائے گا ابھی تو میں بی بی جان کے پاس دوڑ لگا رہی ہوں۔“

دائم خان کا پارہ اس سے پہلے مزید ہائی ہوتا وہ وہاں سے رفو چکر ہونے لگی مگر داہم خان نے تیزی سے اس کا بازو جو پکڑ کے کھینچا وہ سیدھا اس چٹان جیسے سینے سے جا لگی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے تم کو وہاں جانے کی، وہاں زبیدہ آنٹی بھی بیٹھی ہیں اور رافعہ آنٹی بھی، یقیناً تم اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے وہاں بھی باز نہیں آؤ گی۔“

”ہائے مر جانواں، کبھی بیڈ روم میں بھی یہ شوخیاں کر لیا کرو۔“ انابیہ کا اشارہ داہم خان کی اس جسارت کی طرف تھا جو بالکل بے ساختہ ہوئی تھی۔

داہم خان نے جلدی سے اس کو خود سے الگ کیا، اور نا چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر تبسم سا بکھر گیا۔

”تم بیڈ روم میں چلو وہیں ضائع ہو گی میرے ہاتھوں، مگر ابھی میرے ساتھ بازغہ اور علی شاہ سے ملنے چلو۔ وہ سامنے سے آ رہے ہیں، اور خبردار جو کوئی بھی فضول گوئی ان کے سامنے کی تو۔“ اس کی کلائی تھامے وہ علی شاہ اور بازغہ کی جانب بڑھنے لگا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد رائب ملک نے روٹھی روٹھی سی انشراح کو دیکھا۔ جس کے چہرے اور لبوں پر کچھ دیر پہلے مسکراہٹ تھی مگر اب وہاں خفگی تھی۔

”ناراض رہو گی۔“ اس نے تھوڑا پاس آ کر دھیمے سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”بالکل۔“ انشراح نے ہلکے سے گردن اثبات میں ہلائی۔ رائب ملک نے دلچسپ نظروں سے اسکی گلابی آنکھیں دیکھیں جن میں پیار کے ساتھ ساتھ خفگی بھی تھی۔

”جانِ رائب! آپ کو منانے کے میرے پاس چھ ہزار چھ سو چھتیس طریقے ہیں وہ بھی بیڈ روم میں، مگر یہاں کچھ تو رحم کرو۔“ اس کی بے باک گفتگو پر انشراح کان کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی۔ رائب ملک آج بھی اس کا ویسا ہی دیوانہ تھا جیسے روزِ اول تھا اور اس کی دیوانگی میں ہر روز اضافہ ہی ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی بہت الجھ جاتی کبھی منہ پھلا کر بیٹھ جاتی۔

”آپ بہت بدتمیز ہیں۔“ اس نے مسکراتی آنکھوں سے رائب ملک کو دیکھا، جس کا مطلب وہ مان گئی تھی، رائب ملک مطمئن ہو گیا۔

”ماشاءاللہ رائب! وہ دیکھیں اربش کتنی خوب صورت لگ رہی ہے۔“ انشراح خوشی سے چہکی تھی۔

”ہاں ماشاءاللہ!“ رائب ملک نے اس طرف دیکھا جہاں سالار شاہ اور اربش چلے آ رہے تھے۔

”آئیں چلیں نا اربش سے ملنے۔“ اس نے رائب ملک کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اربش۔“ انشراح تو ڈائریکٹ جا کر اس کے گلے لگی تھی، اربش جو پہلے ہی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پا رہی تھی اور اس سے پہلے وہ لڑکھڑاتی، گرتی اور شاید انشراح بھی ساتھ گرتی مگر سالار شاہ نے تیزی سے اربش کی نازک سی کمر پر اپنے بازو کا حصار کھینچ کر دونوں کو ہی گرنے سے بچا لیا۔ انشراح خود بھی جلدی سے اربش سے الگ ہوئی تھی۔

”تم ٹھیک ہو۔“ سالار شاہ نے انشراح کو سنجیدہ نظروں سے دیکھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں۔“ اس کو تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔

”گڈ۔“ سالار شاہ نے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھا اور پھر رائب ملک سے مصافحہ کیا۔

”اصل میں اس سے اتنا بھاری سوٹ سنبھل نہیں رہا ہے، میں اسی لیے اس کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔“ رائب ملک، سالار شاہ کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اس کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ دل و دماغ میں جو معمولی سا شک و شبہ تھا، وہ بھی اس وقت دور ہو گیا۔ وہ اربش کی جانب سے مطمئن اور پرسکون ہو گیا۔

جس لڑکی نے اپنی چھوٹی سی عمر میں اتنے دکھ تکلیف اور غم اٹھائے تھے اس سے کہیں زیادہ اب زندگی اس کو خوشیاں اور آسودگی دے گی۔

زبیدہ جہاں اپنی دونوں بہوؤں کو اپنے ساتھ لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں۔ ان کی گود میں ضویا تھی۔ آج ان کی فیملی مکمل ہو گئی تھی۔ فیملی کے ہر ممبر کا فوٹو سیشن ہو رہا تھا۔

رائب ملک کو داہم خان اور انابیہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے، اس نے ادھر ادھر متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔ ایک سائیڈ پر وہ دونوں دکھائی دیے۔ انابیہ اپنے دونوں کان پکڑے داہم خان کو منانے کی کوشش کر رہی تھی اور داہم خان جان کر اس کو ستا رہا تھا، جو کہ وہ سمجھ بھی چکی تھی۔

”دیکھو اگر نہیں مانے تو پھر مجھ سے شکایت مت کرنا۔“ داہم خان اس کے شوخی سے کہتے جملے کو سمجھ گیا تھا اور اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا بے باکی میں تو ویسے ہی اس نے جھنڈے گاڑے ہوئے تھے۔

”سخت بری لگ رہی ہو۔“ دائم خان نے ہنستے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ کانوں سے ہٹائے تھے، جس پر وہ اور کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔

رائب ملک ہلکے سے مسکرا دیا اور پھر چلتا ہوا انشراح کے برابر میں خالی جگہ پر آ بیٹھا۔ وہاں سب اپنی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ ہر چہرہ خوش تھا اور مسکرا رہا تھا۔ رائب ملک نے انشراح کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اپنے موبائل میں اسی کی پکس دکھانے لگا جو اس نے الگ الگ پوز میں لی تھیں۔

انشراح بہت شوق سے وہ تصویریں دیکھ رہی تھی، انشراح کی اس خوشی نے رائب ملک کو ہمیشہ ہی مطمئن کیا تھا، وہ اب بلا جھجک اس سے ہر بات کہہ دیتی تھی۔ ہر دکھ درد ہر خوشی شیئر کر لیتی تھی اور رائب ملک یہ ہی تو چاہتا تھا کہ وہ بلا جھجک اس سے سب کچھ کہہ دے، اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی، وہ کامیاب ٹھہرا تھا۔ ہر قدم ہر راہ میں انشراح اس کے ہمراہ تھی۔ براؤن کانچ میں کائنات کا سارا پیار آباد کیے وہ انشراح کا خوشی سے چمکتا دمکتا چہرہ تکنے لگا اور پھر بالکل بے ساختہ بے خودی میں اس کے شانے پر اپنی بانہوں کا حصار کھینچ دیا۔

......☆☆......

لبنیٰ جمشید

جنشن والے

شام کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ نیلا آسمان آہستہ آہستہ مٹیالے رنگ میں بدلا اور تاریکی چھانے لگی۔ وہ چھت کی آخری سیڑھی پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے اس آخری پرندے کو دیکھے گئی۔ جو دور کسی درخت کی کھوہ میں گم ہوا تھا۔

"شاید اس کا خاندان اس کے انتظار میں ہوگا۔"

اس نے ایک آہ بھری۔

"کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں ناں جن کا انتظار کیا جائے۔" اس کے لب دھیمے سے وا ہوئے تھے۔

"اور انتظار کرنے والوں کی قسمت؟"

اندر کوئی زور سے چلایا تھا۔ وہ ڈر کے اردگرد دیکھنے لگی کہ اندر کا شور کوئی سن تو نہیں رہا لیکن آج کے تیز رفتار دور میں کسے فرصت اندر تک جھانک کے دل کا احوال جاننے کی۔ بس جو سامنے دکھتا ہے ہم اسے ہی حق مان لیتے ہیں۔

اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن موٹی کالی آنکھوں کی نسبت دادی نے نیناں کہہ کر بلانا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ سب کے لیے ہمیشہ نیناں ہی رہی۔ اصل نام کہیں گم ہو گیا تھا ہادی کی طرح۔ وہ بھی دنیا کے جھمیلوں میں ایسا گم ہوا کہ دادی اور وہ دونوں کم ہی آپس میں اس کی کوئی بات کیا کرتی تھیں۔ دل کا کیا ہے وہ تو اسی کی مالا جپتا ہے جسے چاہتا ہے۔ کہانی سادہ سی تھی۔ دادی کے زیور چرا کر نیناں نے ہی اسے دیے تھے تاکہ دنیا کی نامی گرامی یونیورسٹی میں پڑھنے کا خواب پورا کر سکے۔ یہ زیور دادی نے اس کے جہیز کے لیے ہی تو رکھے تھے اس لیے اپنی اس چوری پر شرمندگی بھی نہ تھی۔ وہ ہمارے خواب پورے کرنے گیا ہے۔ خوابوں کی تعبیر قربانی مانگتی ہے، میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔

پھر قربانیوں کا نیا دور شروع ہوا۔ اپنے سکون کو قربان کر کے مشقت کرتے ہاتھوں نے نئی جوان ہوتی امنگوں کا گلا خود گھونٹ دیا۔ اسے انتظار کرنا تھا۔ اس وقت کا جب ہادی لوٹتا۔ پڑھائی تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اب روزگار کے بنا کس منہ سے یہاں کا رخ کرتا۔ نیناں کے خواب بھی تو تھے۔ اس کے تمام سپنوں کی تعبیر اور خوشیاں لوٹاتی مسکراہٹ کے ساتھ اسے واپس آنا تھا۔ پھر یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔ اس کے آدھے سے زیادہ بالوں میں چاندی اتر آئی جسے وہ اہتمام سے مہندی لگا کر چھپایا کرتی۔ جس صبح آئینہ دیکھتے آنکھوں کے گرد نمودار ہوتی پہلی جھری دیکھ کر آنکھوں نے اپنا ضبط کھو دیا تھا۔ اب اس کی خواہشات اندر ہی اندر سر پٹختی تھیں۔ آخر انہیں وہ باہر کا راستہ دکھاتی بھی تو کیسے؟ وہ محبت میں راستہ بدلنے کی قائل نہیں تھی پر اپنے اندر اٹھتے طوفان کا کہاں رخ موڑے۔ ہر راستہ ہی ہادی کی گلی تک جاتا تھا۔

"ڈاکٹر مہمند کو پیغام بھیجو میرا بلڈ چیک کر جائے۔ جس دن انڈا کھا لوں موا تیز ہو جاتا ہے۔" دادی اس کی کھوج میں اونچا بولتی ہانپتی چھت پر چلی آئیں اور اسے یوں گم صم خلا میں نظریں جمائے دیکھ کر ان کا دل کٹ گیا۔

"نکاح میں نہ ہوتی تو آج باقی بچیوں کی طرح اپنے گھر بار کی کر دیتی۔"

وہ یہ بات صرف سوچ ہی سکتی تھیں۔ ہادی کے خوابوں نے ان سب کو تپتے صحرا میں لا کھڑا کیا تھا۔

"تو انڈا کھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" وہ جھلا کے بولی اور دھپ دھپ سیڑھیاں اتر کے چلی گئی۔

اسے اعتراض انڈے پر نہیں بلکہ آنکھوں سے باتیں کرتے ڈاکٹر مہمند پر تھا۔ ان کی نظروں کا پیغام وہ اچھے سے جانتی تھی لیکن ان کو وصول کرنے کی قیمت وہ نہیں چکا پائے گی۔ یہ بات بھی اسے معلوم تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کال ملانے لگی۔ اب اسے خود کو بولتی آنکھوں والے مسیحا کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنا تھا۔

بلڈ پریشر تو زیادہ تیز نہیں تھا لیکن دادی کو اپنی

بیماریاں ڈسکس کرنے کے لیے ایک سامع چاہیے تھا۔ ڈاکٹر مہمند جو کہ ان کا کرایہ دار بھی تھے۔ بے حد فرصت سے ان کا سامع بنتے تھے۔ رات کے نو بج گئے۔

نیناں چائے بسکٹ کی ٹرے لے کر اندر گئی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر خاموشی سے تپائی پر دھرے الٹے قدموں باہر چلی آئی تھی۔

ساڑھے نو کا وقت تھا وہ باہر برآمدے میں پلر سے ٹیک لگائے اس کے گرد لپٹی بیل کا پتہ پتہ توڑ رہی تھی تب دو بھاری بوٹ اس کے قریب آ کر رکے۔ اس نے ذرا گردن اوپر اٹھائی اور بولتی آنکھوں کو خود پر مرکوز پایا۔

اسے لگا جیسے وہ کہہ رہی ہوں۔ ''وہ ان پر اعتبار کر سکتی ہے۔'' اس سے مزید نہ دیکھا گیا اور نظریں سامنے گیٹ کی طرف موڑ لیں۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ تو انتظار کی مسافر ہے۔ اس کی منزل کا رستہ طویل سہی لیکن امید کا ایک سرا تو ہے جس کی رسی کتنی بوسیدہ ہو چکی تھی وہ کبھی جان نہ پائی۔

ڈاکٹر مہمند کب کے درمیانی دروازے کے راستے اپنے پورشن کی جانب بڑھ چکے تھے اور وہ لامتناہی سوچوں کے بھنور میں گھومتی چلی گئی۔

☆......☆

موسم اچانک بدلنے لگا اور اب کی برسات لگتا تھا اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے جانے والی تھی۔ وہ جب سے نہا کر آئی تھی تولیہ سر پر لپیٹے پریشان نظر آ رہی تھی تب ہی درمیانی دروازے کے پار ہونے والی کھٹ پٹ کی جانب دھیان چلا گیا اور بے اختیار قدم اس سمت اٹھ گئے۔

وہ اس کمرے کے بالکل وسط میں کھڑی تھی جسے کلینک کی شکل دی گئی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ تولیا اس کے سر پہ ہی لپٹا ہے لیکن اب واپس جانے کی ہمت نہ کر پائی۔ اس نے شیشے کی کھڑکی سے بارش کی بوندوں کو دیکھتے شخص پر نظریں جمائیں۔

''میں آپ پر کتنا اعتبار کر سکتی ہوں؟''

گھبرائی ہوئی آواز سن کر ڈاکٹر مہمند نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سفید قمیص اور سرخ شلوار میں ملبوس دوپٹے سے بے نیاز وہ مجسم حقیقت ان کے سامنے کھڑی تھی جو چند لمحے قبل خیالوں میں اٹھکیلیاں کرتی پائی گئی تھی۔

''آپ کتنا اعتبار کرنا چاہتی ہیں؟'' ڈاکٹر مہمند نے گیند اس کے کورٹ میں لوٹا دی۔

''جتنا ایک مریض کو اپنے معالج پر کرنا چاہیے۔ مجھے اتنا اعتبار درکار ہے۔'' نیناں اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔

''میں کوشش کروں گا کہ اعتبار کے اس رشتے کو ٹوٹنے نہ دوں۔'' وہ بولتی آنکھوں سے مسکرایا۔ نیناں ٹیبل کے قریب مریضوں کی مخصوص اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''آج سے دو ماہ قبل میں نے کمر کی بائیں جانب خارش محسوس کی جو چند دن کھجلانے کے بعد دانوں کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ میں موسمی دانے سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی لیکن جلن کا احساس متواتر ساتھ رہا۔ آج نہاتے ہوئے دیوار گیر شیشے میں دیکھا تو سرخ دانوں کی ایک قطار ہے جو انتہائی تکلیف کا باعث ہے۔''

ڈاکٹر مہمند اب اسے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سن رہا تھا۔

''ان دانوں سے مواد بھی نکلتا ہے اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔'' وہ مزید صورتحال بتانے لگی۔

''کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں؟'' ڈاکٹر مہمند نے پرچے پر کچھ لکھتے ہوئے پروفیشنل لہجے میں کہا۔

وہ سن ہوئی تھی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر مہمند نے اسے اپنی جگہ سے اٹھتے دیکھا تھا۔ وہ کھڑکی تک گئی۔ بارش کی کن من اب بھی جاری تھی۔ ایک جھٹکے میں بلائینڈ رز گرانے کے بعد وہ مڑی۔

ڈاکٹر مہمند اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''میں روشنی نہیں چاہتی۔'' اس نے نظریں چرائیں۔

ڈاکٹر مہمند نے اپنی پشت کی دیوار کی طرف ہاتھ بڑھا کر روشنی کم کی۔ اب کمرے میں صرف نیلے رنگ کا زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔

ڈاکٹر مہمند کانپتی ہوئی لڑکی کے مقابل کھڑے تھے۔ اس نے رخ موڑا اور ڈاکٹر مہمند کی جانب پشت کر لی۔

چند لمحوں بعد سفید قمیص چاک سے اوپر اٹھتی دکھائی دی اور قمیض میں ملبوس وجود کی گھبراہٹ اس کے ہر عضو سے ٹپکتی نظر آنے لگی۔

''رہنے دیجیے۔'' دفعتاً ڈاکٹر مہمند نے کہا اور کمرہ دوبارہ سے روشنی میں نہا گیا۔ نیناں نے ہاتھ میں پکڑا سفید قمیص کا چاک چھوڑ کر ممنون نظروں سے دیکھا تھا۔

ڈاکٹر مہمند اب الماری کے سب سے نچلے حصے سے ایک گہری جامنی رنگ کی شیشی کی بوتل نکال رہے تھے۔

''مجھے لگتا ہے پہلے زخم سے بیکٹیریل انفیکشن ختم کرنا ہوگا اس کے بعد ضروری ہوا تو دانوں کا معائنہ کر لوں گا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر مہمند کے اس فعل نے ان کے بارے میں خیالات بدلنے میں مدد دی۔ اب وہ خود کو ہلکا محسوس کر رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' دواؤں کے پرچے کے ساتھ انہوں نے بڑی سی جامنی شیشی بڑھائی تو اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''جنشن وائلٹ! یہ جراثیم کش دوا ہے۔ آپ اسے ابھی استعمال کر سکتی ہیں کیونکہ یہ بے حد پر اثر دوا ہے۔ اس وقت کوئی دوسری چھوٹی شیشی دستیاب نہیں ہے۔'' ڈاکٹر مہمند نے دھیمے لہجے میں کہا اور تھوڑی سی کاٹن بڑھا کر ملحق باتھ روم کی جانب اشارہ کیا۔

''آپ بہ آسانی اس کی کچھ مقدار استعمال کر کے مجھے واپس کر کے جا سکتی ہیں۔ میں کارٹن کھلوا کر چھوٹی بوتل میں شام کو آپ کی طرف پہنچا دوں گا۔ کھانے والی دوائیں میڈیکل اسٹور سے ضرور منگوا لیجیے گا۔'' وہ ان کی ہدایات سنتی رہی۔

اس کو اعتراض نہ تھا کیونکہ جب خیالات کسی کے بارے میں بدلتے ہیں تو اس کی موجودگی میں انسان خود کو محفوظ تصور کرتا ہے۔

دوا کا پرچہ میز پر رکھ کر ملحق غسل خانے میں چلی گئی۔ دوا لگا کر جب وہ باہر نکلی تو ڈاکٹر مہمند کھڑکی کھول رہے تھے۔ وہ ان کا شکریہ ادا کرتی جیسے ہی جنشن وائلٹ کی بوتل ان کے ہاتھوں میں تھمانے لگی تو اس کے کانوں نے وہ مانوس سی آواز سنی تھی۔ پھر لوگوں کا شور وہ اپنے وہم کو حقیقت میں دیکھنے کی منتظر یہ بھی نہ دیکھ پائی کہ ڈاکٹر مہمند کو تھمائی گئی بوتل ان کے پکڑنے سے قبل ہی زمین بوس ہو چکی تھی۔ بادامی رنگ کے ٹائیلز پر گہرا جامنی مواد نقش و نگار بنا چکا تھا۔ انہوں نے ایک نظر بھاگتی لڑکی پر ڈالی اور بڑی بڑی کرچیاں بن میں پھینکی۔ مزید صفائی کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے بھاگتی لڑکی کے پیچھے لپکے تاکہ صورتحال جان پائیں۔

جیسے ہی انہوں نے درمیانی دروازے سے اس کے پورشن پر قدم رکھا تو چند محلے داروں اور گھر والوں کے بیچ انہیں مسکراتا ہوا وہ چہرہ نظر آیا۔ جسے وہ ''ہادی'' نام سے جانتے تھے۔

وہ اپنی پھولی سانسوں پر قابو پاتی اپنی منزل سے چند قدم دور خود کو یقین دلا رہی تھی کہ سفر رائیگاں نہیں گیا۔

ڈاکٹر مہمند چلتے ہوئے اس کے برابر کھڑے ہو کر پر شوق نظروں سے جذبات سے کھلتا چہرہ دیکھنے لگے اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب ہادی سمیت سب کی نظریں تولیہ سر پر لپیٹے، دوپٹے سے بے نیاز سفید تنگ قمیض پر کمر سے تھوڑا اوپر جامنی نشانوں سے پھسلتی ڈاکٹر مہمند کے مصافحے کے لیے بڑھے ہاتھوں پر لگے دھبوں تک جا کے رک گئیں۔

☆......☆......

عائشہ ذوالفقار

تیری محبتوں میں رہنا ہے

''تم ڈاکٹر میرے شوہر کی کمائی سے ہی بنی ہو ماریہ۔ یہ احسان فراموشی کہاں سے آ گئی تمہارے خون میں؟'' نائلہ نے جتادیا۔

''تو میں نے جواباً کیا نہیں کیا امی! ان کے چھوٹے بھائیوں تک کو گھر بنا کر دیے ہیں۔ ان کے دونوں بچوں پر

ہمیشہ بے دریغ خرچ کیا ہے۔ ان کے ماں باپ کے علاج میں کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔'' اس کی آواز پہلی مرتبہ نائلہ کے سامنے اونچی ہوگئی۔

''تم اس شخص کے لیے مجھ سے لڑ رہی ہو ماریہ!''

''میں لڑ نہیں رہی امی! میں صرف آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہوں۔''

''اور میں منع کر دوں تو۔'' نائلہ ایک دم بولیں۔

''بڑی کوی ریاضت اور مسافت کے بعد ملا ہے وہ مجھے۔ امی! بہت پیار کرتی ہوں میں اس سے۔'' وہ رو دی تھی۔

''تمہارے باپ نے بھی مجھ سے پیار کیا تھا ماریہ۔'' وہ دھیرے سے بولیں۔ ''لیکن کیا ہوا؟ لمحوں میں ختم

مکمل ناول

ہوگیا۔ اپنے خوابوں اور شوق کی خاطر قربان کردیا انہوں نے اپنا پیار۔"

"سب بابا جیسے نہیں ہوتے امی! آپ کو تو فخر ہونا چاہیے کہ میں اپنے پیار کو ہر خود کر رہی ہوں۔"

نائلہ چپ ہوگئیں۔

"میں جانتی ہوں جب میں بابا کے سامنے جاؤں تو وہ خود کہیں کہ میری بیٹی مجھ سے زیادہ بہادر ہے۔" وہ اپنی بات کہہ کر اٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی اپنے شوہر سے بات کرنے کے بعد نائلہ اور متنفر ہوجائیں گی اور ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے ہر چیز سے ہاتھ اٹھالیا۔ وہ بالکل بھی راضی نہیں تھیں۔

"میں آپ کی بیٹی ہوں امی!" اسے انتہا کا دکھ تھا۔

"تم بالکل اپنے باپ جیسی ہو، ضدی اور ہٹ دھرم۔" وہ چپ رہی۔ اسے خلوص اور مروت کا یہ صلہ ملا کہ اس کے نکاح میں صرف نائلہ اور طارق کے شوہر نے شرکت کی۔ سائرہ نکاح سے دو دن پہلے ہی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ زخرف نے صرف ڈاکٹر ولید کو بتایا۔ وہ سن کے کافی حیران ہوئے۔

"بہت حیرانی کی بات ہے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ تم میں کوئی کمی ہے لیکن اس قدر مقام ہوتے ہوئے بھی وہ دوسری بیوی بن رہی ہے۔"

"وہ مجھ سے پیار کرتی ہے نہ جانے کب سے؟" وہ ہولے سے بولا اور جواباً ڈاکٹر ولید کی حیران پریشان آنکھوں کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆.....☆

گرتے کے کف چڑھاتے ہوئے وہ دھیرے سے اس کے سامنے آکر بیٹھا۔

وہ جس کا ملنا ناممکن ہو
وہ مل جائے تو کیسا ہو

زخرف کے چہرے کو پورے حق سے دیکھتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔ جواباً وہ اسے بہت دیر تک خاموشی سے دیکھے گیا۔

"ایسا کیا ہے مجھ میں؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

"سب کچھ۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ آنکھیں خود بخود نم ہوگئیں۔

"ایسے تو نہیں چلے گا۔ میں اچھا خاصا عاجز انسان ہوں تم مجھے مغرور بنادو گی۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے ماریہ کی جانب ہاتھ پھیلائیں۔ شکرانے کے آنسو بہانی ہوئی وہ اس کے گلے لگ گئی۔

"آپ سے بڑھ کے کچھ بھی عزیز نہیں ہے مجھے..... کچھ بھی نہیں۔" وہ آنکھیں بند کیے کہہ رہی تھی۔

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔" اس کی آنکھوں پر اپنے لبوں کو رکھتے ہوئے زخرف نے وعدہ کیا اور اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے وقتوں میں یہ وعدہ وفا نہیں ہوپائے گا۔

☆.....☆

"جی ماں..... خیریت ہے؟" خصہ کی کال تھی۔ وہ سیل کان سے لگاتا باہر نکل آیا۔

"شایان! کافی دیر سے سائرہ واپس نہیں آئی۔ اسپتال کا کہہ کر نکلی تھی۔ دیکھو تو وہیں ہے؟" وہ بہت پریشان تھیں۔

"آپ فکرمند نہ ہوں، یہیں ہے اپنے آفس میں۔" اس نے انہیں مطمئن کر کے کال کاٹ دی۔ سائرہ کے آفس

کی طرف آیا تو وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

"تھوڑی دیر کے لیے گھر چلی جاؤ، آرام کرلو۔" وہ ہولے سے بولا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شایان تڑپ گیا۔ وہ رو رہی تھی۔

"جب ایک فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر اب ہمت کرو۔" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آخر ہوں تو انسان ناں، دل تو دکھے گا ہی، عادت نہیں ہے نہ مجھے قربانیاں دینے کی۔" اس نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے زخرف نہ جانے کتنی دور چلا گیا ہے۔" اسے صبر نہیں آرہا تھا۔

"جس کے حوالے کر کے آئی ہو، وہ مناسب نہیں ہے؟" شایان دھیرے سے بولا۔

"آپ کو دکھ نہیں ہو رہا، آپ کی امید پوری طرح ختم ہوگئی۔" اس نے پوچھا۔

"اچھا ہے ناختم ہوگئی، اب بار بار دکھ نہیں ہوگا۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کے کرسی سے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"چلو تمہیں گھر چھوڑ کے آؤں، ماں پریشان ہو رہی ہیں۔" وہ اسے زبردستی باہر لے آیا۔ وہ رات اس نے جاگ کے گزاری دو دن بعد زخرف کا فون آگیا۔

"ڈاکٹر صاحبہ گھر کب آنا ہے؟" اسے نامحسوس سی خوشی ہوئی۔

"جب آپ لے جائیں۔" اور زخرف اسے اسی شام واپس لے گیا۔ ماریہ کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمیشہ کی طرح پیار، مان، بھروسہ تھا اور اب تشکر بھی آگیا تھا۔

"میری حیثیت ہمیشہ تمہارے بعد ہی رہے گی سائرہ، پہلے نہیں۔" بہت سچائی سے اس نے سائرہ کو گلے لگایا۔

☆.....☆

نکاح کے بعد نائلہ نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا، ماریہ کو یقین تھا کہ وہ ایسا ہی کریں گی کیونکہ ان پر اپنے شوہر کے بہت احسانات تھے جنہیں وہ اس کے لیے بھلا نہیں سکتی تھیں۔ ماریہ نے اسپتال کو ہمیشہ کے لیے خوشی سے خیرباد کہہ دیا۔ ساس، سسر اور نندوں کے سامنے پہلے دن سے زبان کو جو گرہ لگائی وہ تاعمر نہ کھولی۔ ان میں سے ہر ایک کی، ہر ایک بات کے جواب میں اس کے پاس صرف دو الفاظ ہوتے "ٹھیک ہے" لیکن اس قدر تابعداری اور سعادت مندی کے باوجود اسے ذرا سا بھی صلہ نہیں ملا۔

اسماء ملک کے لہجے میں ہمیشہ اس کے لیے نفرت ہی ہوتی۔ شمیم ملک تو بات ہی نہیں کرتے تھے۔ رخسانہ ملک کے لیے بھی وہ انتہائی قابل نفرت تھی۔ اس گھر میں صرف سائرہ تھی جو اس سے ٹھیک طرح سے بات کرتی تھی لیکن رفتہ رفتہ نہ جانے کیوں اس کا رویہ بھی تبدیل ہوتا چلا گیا۔ ماریہ سمجھ نہ سکی کہ اسے آخر ہوا کیا ہے۔

وہ دن بہ دن اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ بعض اوقات تو اس قدر روکھے لہجے میں بات کرتی کہ ماریہ حیران ہی رہ جاتی اور پھر وہی ہوا جو اس سے سب نے کہا تھا۔ نائلہ نے شایان نے اور خود زخرف نے۔ وہ اس گھر کے ایک کونے تک محدود ہوگئی۔ اس گھر میں اگر کوئی اس کا تھا تو وہ زخرف تھا۔ وہ بھی بس چند لمحوں کے لیے، اس دن بھی اس نے دودھ چولہے پر رکھا تو فون بج اٹھا۔ سائرہ اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔

"دیکھنا ذرا دودھ نہ ابل جائے۔" اس سے کہتی وہ باہر آگئی۔ فون سن کے واپس کچن میں آئی تو دودھ ابل ابل کے سلیب پر پھیل چکا تھا اور اسماء ملک آنکھوں میں قہر لیے کھڑی تھیں۔

"میں فون سننے گئی تھی، سائرہ سے۔ کہہ کر گئی تھی۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"مجھ سے تو نہیں کہا، میں تو ابھی آئی ہوں۔" وہ صاف مکر گئی۔ ماریہ دم بخود رہ گئی۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی لیکن اسماء ملک کا ہاتھ اٹھ گیا۔ وہ لڑکھڑا کے سلیب کے اوپر گری تو سر باہر کو ابھرے الماری کے کونے میں لگا۔ بس ایک لمحہ، ایک لمحے کے لیے سائرہ کا دل تڑپ گیا لیکن اگلے ہی پل وہ چپ چاپ کچن سے باہر نکل گئی۔ اسماء ملک نے قہر بار نظروں سے اسے گھورا۔

"میرا بس چلے تو لمحہ نہ لگاؤں تمہیں اس گھر سے نکالنے میں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئیں۔

چپ چاپ اس نے کچن صاف کیا اور اوپر آ گئی۔ زخم دھو کر سنی پلاسٹ لگایا۔ رات کا کھانا لگا کر وہ خود اوپر آ گئی۔ اب کھانے کے دوران بھی اکثر بدمزگی ہونے لگی تھی، نہ جانے کیسے اسماء ملک کو پتا چل گیا تھا کہ وہ نائلہ کے پہلے شوہر کی اولاد تھی سو ہر بات میں اس کے باپ کا ذکر لے آتیں۔ ذرا دیر سونے کے بعد وہ نیچے آئی تو رات کے دس بج رہے تھے۔ برتن دھو کر اس نے اپنے لیے کھانا نکالا اور وہیں بیٹھ کے کھانے لگی۔ تبھی اسے زخرف کی گاڑی رکنے کی آواز آئی، اس سے پہلے کہ وہ منظر سے غائب ہوتی، وہ سیدھا کچن میں ہی آ گیا۔

"یہ کس وقت کا کھانا کھا رہی ہو؟" وہ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولا۔

"رات کا...... آپ کھائیں گے؟" کہتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"نہیں بس چائے پلا دو۔" وہ کرسی گھسیٹ کے وہیں بیٹھ گیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پہلے کھانا تو کھا لو۔" زخرف نے اس کا ہاتھ پکڑا تبھی اس کے ماتھے پر نظر گئی۔

"یہ چوٹ کیسے لگی؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"چھوڑیں...... بس لگ گئی، چائے پیتے ہیں۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"بتاؤ تو سہی۔" زخرف نے اصرار کیا۔

"زخرف آپ سے وعدہ کیا تھا کہ کوئی شکوہ نہیں کروں گی اور جھوٹ مجھے بولنا نہیں آتا سو چپ رہنا بہتر ہے۔" اس نے زخرف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر چائے بنانے لگ گئی۔

زخرف کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر ہولے سے دونوں ہاتھ اس کی کمر کے گرد لپیٹے اور اپنا چہرہ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے ہولے سے بولا۔ "ساس سے مار پڑی ہے؟" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"آپ کھل کے ہنس لیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زخرف یوں ہی کھڑے کھڑے کھل کے ہنس دیا۔

کچن کے باہر سے گزرتی سائرہ نے بڑی عجیب نظروں سے ان دونوں کو دیکھا اور پلٹ گئی۔

ماریہ نے مسکراتے ہوئے اسے چائے کا کپ پکڑایا۔ چائے ختم ہونے تک دونوں وہیں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو آؤ امی کا کفارہ ادا کروں۔" وہ اسے دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز سے بولا۔ جواباً وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"صبح اٹھ کے سائرہ مجھے قتل کر دے گی ڈاکٹر زخرف!" اس نے چائے کے برتن سنک میں رکھتے ہوئے کہا۔

"صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔ اتنا ڈرو گی تو جیو گی کیسے؟" وہ محبت سے اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولا۔

☆......☆

"اور سناؤ زخرف! سب ٹھیک ہے ناں۔" وقفے کے دوران ڈاکٹر ولید اس کے آفس میں آ کر بیٹھ گئے۔

"کس حوالے سے پوچھ رہے ہیں آپ؟" وہ ہولے سے بولا۔

"دو دو بیویوں کے نرغے میں رہتے ہو بھئی، کل پرزے ٹھیک ٹھاک ہیں ناں؟" اب کے انہوں نے کھل کے پوچھا۔ زخرف ہنس کے رہ گیا۔

"بڑے عرصے سے ماریہ کا کوئی نیا انٹرویو نہیں دیکھا۔" انہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

"دراصل اسپتال چھوڑ دیا ہے اس نے۔"

ڈاکٹر ولید حیران ہوئے۔ "کیا مطلب ہے چھوڑ دیا؟"

"امی نے ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ وہ سب کچھ چھوڑ دے گی۔ اسپتال، انٹرویوز، نیوز چینلز...... سب کچھ اور اس نے بخوشی یہ سب قبول کر لیا۔"

یہ سب سن کر ڈاکٹر ولید چائے پینا بھول گئے۔

"تو اب کیا کرتی ہے؟"

"گھر میں ہوتی ہے، سسرالیوں کے دلوں میں ہر ممکن جگہ بنانے کی جدوجہد کرتی رہتی ہے۔" وہ بولا۔

ڈاکٹر ولید کچھ نہ بول سکے، انہیں یکدم اپنا وقت یاد آ گیا۔

"یعنی تمہاری خاطر اپنے اتنے سالوں کی محنت اور صلہ قربان کر دیا اس نے۔"

زخرف نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اس کی چاہتوں اور محبتوں کی کوئی حد نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! بعض اوقات میں خود حیران ہو جاتا ہوں۔"

ڈاکٹر ولید اس کی بات سن کے کچھ دیر خاموش رہے پھر دھیرے سے بولے۔ "جانتے ہو زخرف......! جب میں تمہاری عمر کا تھا تب میں نے بھی پیار کیا تھا۔"

زخرف نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا۔

"اس سے میری شادی بھی ہو گئی تھی لیکن مجھے میرے خواب بھی پورے کرنے تھے۔ اسپتال سیٹ کرنا تھا، نام کمانا تھا، شہرت حاصل کرنی تھی سو...... جب وہ مقام آیا جہاں مجھے محبت اور شوق میں سے کسی ایک کو چننا پڑا تو میں نے اپنے شوق اور خوابوں کو چن لیا۔ محبت قربان کر دی۔" وہ روانی میں اسے بتاتے چلے گئے۔

"ڈاکٹر سعدیہ میری دوسری بیوی ہیں۔ تب مجھے لگا میں نے بہت عقل مندی کا کام کیا ہے لیکن میں آج دکھے دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ ڈاکٹر ماریہ مجھ سے زیادہ بہادر نکلی، اس قدر دولت، شہرت، عزت، نیک نامی اور اس قدر اعلیٰ اسپتال کو ایک لمحے میں ٹھوکر مار دینا آسان نہیں ہوتا۔" دھیرے سے کہتے ہوئے انہوں نے زخرف کی طرف دیکھا۔

"اس کی محبت کا ہمیشہ بہت احترام کرنا زخرف! کیونکہ یہ ایک بار کھو جائے تو دوبارہ واپس نہیں ملتی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماریہ کی محبت کا اسیر تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔

☆......☆

اس دن وہ ذرا جلدی گھر آ گیا۔ گاڑی کھڑی کر کے اندر داخل ہوا تو شور برپا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہوئی تھی۔ سائرہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسماء اور رخسانہ دونوں فل اسپیڈ میں بول بول کے کچن کے دروازے سے لگی کھڑی ماریہ کے چھکے چھڑا رہی تھیں۔ ناعمہ اور صائمہ دونوں آئی ہوئی تھیں اور اپنے شوہروں سمیت بڑے مزے سے تماشا دیکھ رہی تھیں۔ شعیب ملک بھی خاموش بیٹھے تھے۔ وہ بے چاری سر جھکائے چپ چاپ سن رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ تیزی سے اندر آیا۔
"میں نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس جیسی نانہجار اس گھر میں آئے گی۔ نہ آگے کا پتا نہ پیچھے کا...... نہ جانے کس کا خون ہے؟" اسماء ملک کا یوں کہنا زخرف کو بالکل اچھا نہ لگا۔ پورے خاندان کے سامنے نہ جانے کب سے اس کی بے عزتی ہو رہی تھی۔
"جاؤ اوپر!" وہ اسے بازو سے پکڑ کے دھیرے سے اوپر کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ سُتے ہوئے چہرے اور نم آنکھوں کے ساتھ وہ اوپر چلی گئی۔
"بس کریں امی!" بمشکل اس نے انہیں چپ کروایا۔ اصل بات نہ جانے کیا تھی اور پھر جیسے یہ معمول ہی بن گیا۔ زخرف نے خود سائرہ کا سرد اور روکھا رویہ محسوس کرلیا۔
"تم اپنی مرضی سے لائی تھیں اسے اس گھر میں...... اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" آخر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔
"مجھے کیا ہوا ہے؟" "زخرف تم مجھ سے دور ہو رہے ہو، وہ چھین رہی ہے تمہیں مجھ سے......" سائرہ ایک دم رو پڑی۔
"کوئی نہیں چھین رہا مجھے، کیوں اتنا فضول سوچتی رہتی ہو۔" زخرف نے حتی الامکان اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔
"تم اس کے ہو رہے ہو زخرف!"
"میں اس کا نہ ہو کے کیسے رہوں سائرہ؟" وہ آخر جھلا گیا۔
"یہ بھی کہا تھا نا میں نے تمہیں کہ مجھے تقسیم ہوتا نہیں دیکھ پاؤ گی۔" سائرہ روتی رہی۔
"تمہارے رونے سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے سائرہ...... پلیز ایسے نہیں کرو۔" لیکن اس کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ماریہ کی پریگنینسی بھی اسے اس کا حق نہ دلا سکی۔ اس رات بھی اس نے اپنی خوشی صرف زخرف کے ساتھ ہی سیلیبریٹ کی۔ وہ اس کے انتظار میں رات ایک بجے تک جاگتی رہی۔ زخرف اسے جاگتا دیکھ کے کافی حیران ہوا۔
"خیریت ہے، اتنی رات گئے یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" وہ اسے تنہا لاؤنج میں اکیلے بیٹھے دیکھ کے حیران ہوا۔
"ادھر آئیں۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ زخرف چپ چاپ اس کے برابر آ بیٹھا۔
"آپ کو ایک بات بتانا تھی۔" وہ اس کی ٹائی کھولتے ہوئے بولی۔
"آپ کی گڑیا آنے والی ہے۔" چند لمحوں تک زخرف سمجھ نہ سکا اور پھر جب سمجھ میں آیا تو بے انتہا خوش ہوا۔
"میری ساری تھکن اتار دی تم نے۔" اس نے بہت محبت سے اس کے کندھوں کے گرد بازو لپیٹ کے اسے خود سے لگایا اور اپنے لب اس کی پیشانی سے لگا دیے۔
"لیکن تمہیں کیسے پتا کہ گڑیا ہے؟" وہ بولا۔
"میرا دل کہتا ہے۔"
"پھر ایسا کرو، دو گڑیاں دے دو ایک اپنے جیسی اور ایک سائرہ جیسی۔" وہ اسے کندھے لگاتے ہوئے بولا۔
اس کی فرمائش سن کر وہ ہولے سے مسکرائی۔
"چلو مجھے اس خوشی میں اچھی سی چائے پلاؤ۔" وہ کف اوپر کرتے ہوئے بولا۔ دس منٹ بعد وہ چائے بنا کر لائی تو وہ وہیں بیٹھا تھا، کپ اسے پکڑاتے ہوئے وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔
"سائرہ کو بتایا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، آپ خود بتائیے گا، وہ زیادہ خوش ہوگی۔" وہ دھیرے سے بولی۔
"امی، ابو بھی بہت خوش ہوں گے۔ بہت انتظار تھا انہیں اس خوش خبری کا۔"
زخرف بہت خوش تھا۔ چائے کا کپ ختم کر کے وہ صوفے پر ہی لیٹ گیا۔
"یہاں کیوں لیٹ رہے ہیں، اوپر چلے جائیں۔" اس کے کہنے پر زخرف نے چپ چاپ بازو اس کی طرف کھول دیے۔
"آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا، میرا ریکارڈ لگ جائے گا ڈاکٹر صاحب!" وہ اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ زخرف نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد لپیٹ دیا۔
"میں شاید کبھی بھی تمہاری محبتوں کا قرض نہ چکا سکوں۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے ماریہ کے بالوں میں لگا کیچر ہولے سے کھینچ دیا اور پھر اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں چلانے لگا۔ ماریہ نے اس کے چہرے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بہت نرمی سے اس کے لبوں کو چھوا۔
"یہ قرض نہیں ہے، آپ کا حق ہے زخرف!"
زخرف نے اس کے گرد گھیرا تنگ کیا۔
"آئی لو یو!" آنکھیں بند کرتے ہوئے ماریہ نے دھیرے سے کہا۔

☆......☆

وہ زخرف کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی جب سائرہ کچن میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر ماریہ کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر عجیب لہجے میں بولی۔ "تو آخر تمہیں بھی مزے اڑانے آ ہی گئے؟"
اس کی بات پر ماریہ سُن رہ گئی۔
"وہ پورے چار ہفتوں بعد پہلی مرتبہ صرف چار گھنٹوں کے لیے میرے ساتھ بیٹھا تھا سائرہ۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ماریہ نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔
"اور تم نے ان چار گھنٹوں میں ہی کسر نکال لی۔" وہ زور سے ہنس کے بولی۔
"تمہیں آخر ہو کیا گیا ہے۔ اتنی پوزیسیو کیوں ہو گئی ہو؟"
"اپنے شوہر کے لیے پوزیسیو ہونا میرا حق ہے کارڈیالوجسٹ صاحبہ!" وہ آگے کو ہو کر بولی۔
"تو اس کے ساتھ چار گھنٹے گزارنا میرا بھی حق ہے۔" ماریہ اسی لہجے میں بولی۔ سائرہ کو یکدم غصہ آ گیا۔
"اپنی اوقات میں رہو تم، اس نے میرے کہنے پر تم سے شادی کی تھی اور میرے کہنے پر چھوڑ بھی سکتا ہے تمہیں۔"
اس کے الفاظ اور لہجے پر ماریہ دم بخود رہ گئی۔
کیا یہ وہی سائرہ تھی جس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے اس سے لگاتار چار ماہ اصرار کیا تھا؟ اب کیا ہو گیا تھا اسے؟
وہی جو شوہر کی دوسری شادی کے بعد ہر پہلی بیوی کو ہو جاتا ہے۔ چھن جانے کا ڈر...... حسد اور احساس کمتری۔
ماریہ ویسی ہی تھی، پہلے دن جیسی...... ہر پل اس کی احسان مند حالانکہ زخرف ہر وقت اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ پورے ہفتے میں بمشکل چند گھنٹوں کے لیے وہ اس کے حصے میں آتا تھا۔ کوئی حدیں نہیں لگائی تھیں اس نے۔ زخرف کی زیادہ تر توجہ اور وقت اب بھی سائرہ کا تھا لیکن اس کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔ اسے ماریہ کے ساتھ گزارے گئے زخرف کے چند گھنٹے بھی قابل قبول نہیں تھے۔ ماریہ کے حق میں کی گئی اس کی کوئی بات قابل

برداشت نہیں تھی۔

زخرف کی باتیں حرف بہ حرف سچ ثابت ہو رہی تھیں۔ ماریہ کوئی غیر نہیں تھی اس کے لیے، اس کی جائز بیوی تھی، پورا حق تھا زخرف کا اس پر..... کیسے دور رہ پاتا اس سے اور بیوی بھی ماریہ خان..... جس کی سیرت میں ڈھونڈے سے بھی کوئی کھوٹ نہیں تھا جس کی تمام محبت اور توجہ صرف زخرف کے لیے تھی۔ وہ کیسے نہ اس کا ہوتا اور یہی سائرہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

اسے ماریہ کے امید سے ہونے کی خبر ملی تو بجائے نرم ہونے کے وہ اور سخت ہوتی چلی گئی۔ زخرف کی توجہ ماریہ کے لیے کچھ زیادہ ہوئی تو سائرہ کو ماریہ سے اتنی ہی نفرت ہوتی چلی گئی۔ ماریہ شاید کبھی زخرف کو اس کی نفرت سے آگاہ نہ کر پاتی اگر وہ خود نہ دیکھ لیتا۔ بات نہ جانے کہاں سے شروع ہوئی تھی لیکن ختم حسب معمول ماریہ کے خون پر آکر ہوئی۔

''کسی کھرے انسان کا خون ہوتیں نا تم تو یوں میرے حق پر ڈاکا نہ ڈال رہی ہوتیں۔ پتا نہیں کس کا خون ہو؟'' سائرہ کی زبان آگ اگل رہی تھی۔

''میرے بابا کے بارے میں تم آئندہ ایک لفظ بھی نہیں کہو گی۔'' ماریہ کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''ورنہ کیا کرو گی تم؟ کر کے دکھاؤ۔ تم جیسی گھٹیا نسل اور کر بھی کیا سکتی ہے سوائے گھٹیا پن کے۔''

زخرف نے سائرہ کے آخری الفاظ نہ سنے تھے۔

''سائرہ.....!'' ماریہ کی آواز شاید پہلی بار بلند ہوئی تھی اور سائرہ یہ برداشت نہیں کر سکی۔ لمحہ لگا تھا اسے ماریہ کا گال رنگنے میں۔ وہ اپنا توازن کھو کر صوفے پر گر گئی۔

زخرف تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''اس لیے لے کر آئی تھیں تم اسے اس گھر میں؟'' اس کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔

''زخرف! مجھ سے غلطی ہو گئی جو میں اسے لے آئی۔ خدا کے لیے میری اس غلطی کو سدھار دو۔ چھوڑ دو اسے ورنہ میں گھٹ گھٹ کے مر جاؤں گی۔'' سائرہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ماریہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے زخرف کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''تمہارے لیے یہ بچوں کا کھیل ہے کیا۔ جب تم نے کہا اسے اپنا لیا اور جب تم نے کہا چھوڑ دیا۔'' زخرف اس کی بات سن کے حیران رہ گیا۔

''ہو گئے ناتم پاگل نے زخرف۔ چھین لیا ہے اس نے تمہیں مجھ سے، دور ہو گئے ہو تم مجھ سے۔'' سائرہ نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''سائرہ میں کوئی کھلونا نہیں..... کل بھی تمہارا تھا اور آج بھی..... اور آئندہ بھی تمہارا ہی رہوں گا۔ یہ فضول سوچیں نکال دو اپنے دماغ سے۔'' وہ بمشکل اسے سمجھا بجھا کر اوپر لے کر گیا۔ ماریہ وہیں بیٹھی رہ گئی۔

ابھی اس کی شادی کو سال بھی نہیں ہوا تھا اور واپسی کے تقاضے شروع ہو گئے تھے۔ کچھ وقت اور گزرا تو اللہ نے اسے جڑواں بیٹیوں سے نواز دیا۔ زخرف بے انتہا خوش تھا۔ وہ اسپتال میں تھا جب اس کے پاس ماریہ کا سسکیوں بھرا فون آیا۔

''زخرف میری مدد کریں پلیز..... میں بہت تکلیف میں ہوں۔'' وہ بمشکل بول رہی تھی۔ گھر میں گاڑی ہونے کے باوجود شعیب ملک اسے اسپتال نہیں لے کر گئے۔ وہ گھر آیا تو ماریہ مارے تکلیف کے بے ہوش ہونے کے

قریب تھی۔ پورے یقین اور بھروسے کے ساتھ وہ اسے گاڑی میں ڈال کے اس کے اپنے اسپتال لے آیا۔ سائرہ بھی وہیں تھی۔ اس کے اسٹریچر کو آئی سی یو میں چھوڑ کے وہ خود بھاگتا ہوا اس کے آفس تک آیا۔

''چلو جلدی..... اپنی گڑیا کو خود اس دنیا میں لے کر آؤ۔'' بڑے مان سے اس نے سائرہ کا بازو پکڑا جسے اس نے فوراً جھٹک دیا۔

''میں کم از کم اس خود غرض لڑکی کی اولاد کو اس دنیا میں نہیں لا سکتی..... سوری۔''

زخرف دم بخود رہ گیا۔ ''سائرہ تم ایک مسیحا ہو..... اپنی نفرت میں اس قدر اندھی نہ بنو۔'' دکھ سے وہ بول نہ سکا۔

''زخرف پلیز..... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' سخت لہجے میں کہتے ہوئے وہ اپنے سامنے پڑی فائلوں پر جھک گئی۔

''آج پہلی بار مجھے اپنی محبت پر افسوس ہوا ہے ڈاکٹر سائرہ۔'' انتہائی دکھی لہجے میں کہتا وہ واپس آئی سی یو تک آیا۔ شایان نے ہر ممکن اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ ماریہ کو فوراً وہاں سے لے گیا۔

''زخرف رکو تو سہی، میں ڈاکٹر نوزیہ سے کہتا ہوں۔ وہ ڈیوری کر دیں گی۔''

''نہیں شایان..... بے شک یہ راستے میں مر جائے لیکن میں اسے یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رہنے دوں گا۔'' وہ اسی وقت اسے وہاں سے شفاء اسپتال لے کر آ گیا۔ تاخیر کے باعث ماریہ کی حالت کافی بگڑ گئی تھی۔ نہ اس کے گھر والوں میں سے کوئی آیا اور نہ ہی ماریہ کے رشتے داروں میں سے کسی نے خبر لی حالانکہ زخرف نے خود نائلہ کو فون کر کے نانی بن جانے کی خوش خبری سنائی تھی۔ پورے ہفتے وہ اسپتال میں رہی۔ صرف زخرف اس کے ساتھ تھا۔

''آج مجھ پر تمہارے ان گنت احسانوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔'' وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے چہرے چومتے ہوئے بولا۔

''زخرف آپ خوش ہیں نا؟'' وہ بمشکل بولی۔

''کاش تم اس لمحے میرے دل میں جھانک سکتیں۔'' اس نے بہت محبت سے اس کی پیشانی پر اپنے لبوں سے نشان بنایا۔

جس شام وہ اسے لے کر گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں کافی چہل پہل تھی۔ صائمہ اور ناعمہ دونوں اپنے بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔ زخرف اسے لے کر سیدھا اوپر کی جانب بڑھا لیکن وہ سائرہ کے پاس صوفے کے قریب رک گئی۔ ایک بیٹی اسماء ملک اور دوسری سائرہ کی گود میں ڈال دی۔ خود اس کے پاس نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

''آج بھی تم سے وہی کہوں گی جو پہلے دن کہا تھا۔ تمہاری جگہ ہمیشہ سے یہیں ہے۔ صوفے پر..... اور میری ہمیشہ سے تمہارے نیچے، قالین پر..... فرش پر۔ یہ تمہاری بیٹیاں ہیں، تم جیسے چاہو پالو..... میرا کوئی حق نہیں ہے ان پر..... وعدہ کرتی ہوں تم سے۔'' سائرہ کے دونوں ہاتھوں پر اپنے لرزتے ہاتھ رکھے، وہ آنسو بہاتی ہوئی کہتی چلی گئی۔

زخرف نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اوپر لے گیا۔ اس رات وہ پرامید ہو کر سوئی کہ اگلے دن سب ٹھیک ہو گا لیکن!! سب ٹھیک نہیں ہوا، سائرہ نے صحیح معنوں میں اس کی بیٹیوں پر اس کا کوئی حق نہیں رہنے دیا۔ وہ زخرف کی بیٹیاں تھیں جن پر ماریہ کا کوئی حق نہیں تھا۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد بھی وہ اس گھر میں جگہ نہیں بنا پائی۔ اسماء اور شعیب اسے بہو تسلیم ہی نہ کر سکے اور سائرہ..... وہ صحیح معنوں میں اس کی سوتن بن گئی۔ آئے دن اس کا

زخرف سے ایک ہی تقاضا ہوتا ''اسے طلاق دے دو'' اور زخرف اس کی بات ماننے سے قاصر تھا۔
اس دن بھی صائمہ کے دیور کا ولیمہ تھا۔ پورا گھر انوائیٹڈ تھا۔ زخرف کی تمام تیاری مکمل کروا کے وہ نیچے جانے لگی تو وہ بولا۔
''تم اس حلیے میں جاؤ گی کیا؟''
''مجھے بھی جانا ہے؟'' اس نے جواباً حیرانی سے پوچھا۔
''تو کیا نہیں۔ بیوی ہو تم میری۔'' زخرف نے جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا۔
''آپ ایک دفعہ آنٹی سے پوچھ لیں کہ مجھے جانا ہے یا نہیں۔''
''اوہو...... ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو جلدی تیار ہو جاؤ جب سب جا رہے ہیں تو تم بھی چلو۔'' زخرف اسے واش روم کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔
''آپ ایک دفعہ پوچھ لیتے تو......''
''میں نیچے جا رہا ہوں، پندرہ منٹ میں تم بالکل تیار ہو جانا۔'' وہ خود پر پرفیوم چھڑکتا باہر نکل گیا۔ سائرہ نے دونوں بچیوں کو بھی تیار کر لیا تھا۔
''تم میری گڑیوں کو نظر لگوا دو گی آج۔'' ان دونوں کو چومتے ہوئے اس نے سائرہ سے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔
''چلو روما کو اٹھاؤ۔'' وہ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔
''اب ان میں روما کون سی ہے؟'' وہ پریشانی سے دونوں کو دیکھ کر بولا۔
''زخرف تم ان کے باپ ہو، تمہیں تو پتا ہونا چاہیے۔'' سائرہ نے اسے لتاڑنا چاہا۔
''میں کون سا سارا دن ان کے ساتھ رہتا ہوں، تم رہتی ہو لیکن پتا تو تمہیں بھی نہیں چل رہا۔'' واقعی سائرہ خود بھی بعض اوقات کنفیوژ ہو جاتی تھی۔
''چلو کسی ایک کو اٹھا لو۔ ان کی پہچان صرف ماریہ ہی رکھتی ہے۔'' ہولے سے کہتے ہوئے وہ ایک کو اٹھا کے باہر آ گئی۔ سائرہ کے نام لینے پر اسے ماریہ کا خیال آیا۔ وہ ابھی تک نیچے نہیں آئی تھی۔
''ایک سیکنڈ اسے پکڑیں ذرا!'' وہ اسے اسماء ملک کے حوالے کرتا اوپر آ گیا۔
''جلدی کرو کیا کیے جا رہی...... '' کمرے کے وسط میں وہ ساکت ہو گیا۔
گلابی رنگ کی بے بی اسٹائل جھالر والی فراک، چوڑی دار پاجامے میں اونچے سول کے سینڈل پہنے، دوپٹا گلے میں ڈالے، لمبے بال کمر پر بکھرائے، گلابی ہیئر بینڈ لگا کے ماتھے پر آئے بالوں کے ساتھ ہلکا ہلکا میک اور جیولری پہنے، وہ اس کے کہنے پر ایک دم پیچھے کو مڑی تھی۔
''بس ہو گئی تیار...... آنٹی سے پوچھ لیا۔'' کہتے ہوئے اس نے جلدی سے بیڈ پر پڑا بیگ اٹھایا اور دوبارہ اس کی طرف مڑی۔ وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
''کیا ہوا؟'' وہ اس کی نظروں سے کچھ اخذ نہ کر سکی۔
''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری کارڈیالوجسٹ اتنی سحر انگیز ہے۔'' زخرف نے آج پہلی بار اس کی یوں تعریف کی تھی۔ وہ چپ رہ گئی۔
''اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے ہولے سے اس کے لبوں کو چھوا۔
''تھینک یو۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''چلو۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا اور پھر نیچے لے آیا۔
''آؤ سائرہ!'' گاڑی کی چابی اٹھاتا وہ باہر نکلنے لگا جب اسماء ملک کی تیز آواز پر رک گیا۔
''تم کہاں جا رہی ہو؟'' وہ ماریہ سے مخاطب تھیں۔
اس نے زخرف کی طرف دیکھا۔
''وہیں جہاں سب جا رہے ہیں۔'' وہ ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔
''کہیں نہیں جا رہی یہ، پورے خاندان میں تماشا بنواؤ گے کیا؟ صرف سائرہ جائے گی۔'' وہ سخت لہجے میں بولیں۔
''کیسا تماشا امی؟ میری بیوی ہے یہ۔'' وہ جھلا گیا۔
''تو بس پھر اسی کو لے جاؤ، ہم میں سے کوئی نہیں جا رہا۔'' وہ غصے سے بولیں۔
''کس کس کو صفائیاں دیتی پھروں گی میں اس کے بارے میں، حسب نسب تو ہے نہیں اس کا...... کس کس کے سوالوں کا سامنا کروں گی۔ جتنا تماشا لگوانا تھا لگوا دیا تم نے اس سے شادی کر کے، خدا کا واسطہ اب بس کرو۔''
اسماء ملک اس پر چڑھ دوڑیں۔
''اٹس اوکے آنٹی...... میں رک جاتی ہوں۔ آپ لوگ چلے جائیں۔'' وہ حتیٰ الامکان لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔
''یہ بچیاں بھی اس کے حوالے کرو...... یہ سنبھالے گی، وہاں کہاں لیے پھرو گی انہیں۔'' انہوں نے دونوں بچیاں اس کی گود میں تھما دیں۔
''چلو...... خبردار جو ایک لفظ بھی اور کہا تو......'' سائرہ کو باہر کی طرف دھکیلتے ہوئے انہوں نے قہربار نظروں سے زخرف کو گھورا۔ بمشکل اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے وہ پاس کھڑی ملازمہ کی طرف مڑا۔
''جب تک ہم لوگ واپس نہ آ جائیں، یہیں رہنا۔'' اس نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ دونوں بچیوں کو لے کر اوپر آ گئی۔ کچھ دیر بعد دونوں سو گئیں۔ ملازمہ کو وہیں لیٹ جانے کی ہدایت کرتے ہوئے وہ خود نیچے آ گئی۔
دل بہت دکھی ہو رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کولڈ ڈرنک کا گلاس بھر کے وہ صوفے پر آ بیٹھی۔
یوں ہی گزرے گی کیا ساری عمر؟ گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں اور وقفے وقفے سے چھلک رہی تھیں۔
''کہیں کوئی کمی نہیں چھوڑی...... ہر ایک کے دل میں جگہ بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن...... کیا کروں؟ نہ جانے کامیابی ملے گی بھی کہ نہیں۔'' گلاس خالی ہو گیا تھا۔
''کیا کبھی کوئی میرا بن پائے گا۔''
''اس لمحے تم ایک ناکام عاشق کے خاکے پر پوری اتر رہی ہو۔'' زخرف نہ جانے کب اس کے پاس آ کر بیٹھا تھا۔ وہ یکدم سیدھی ہوئی۔
''آپ کیوں آ گئے؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔
''تمہارے آنسو صاف کرنے۔'' وہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اس کے گالوں کو خشک کرتے ہوئے بولا۔
''چلو اٹھو جلدی......'' اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''کہاں جانا ہے اب؟'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔
''ڈنر کرنے۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے باہر تک آیا۔
''نہیں زخرف..... انکل آنٹی کو پتا چل گیا تو مجھے جان سے ماردیں گے۔ نہیں پلیز.....'' اس نے جانے سے صاف انکار کردیا۔
''ہم ان کے آنے سے پہلے واپس آجائیں گے، وہاں ابھی کھانا شروع ہوا تھا۔ اتنی جلدی واپس نہیں آئیں گے وہ۔'' زخرف اسے زبردستی گاڑی میں بٹھاتے ہوئے بولا۔
''رانی سے کہنا بچوں کا خیال رکھے اور تم بھی چوکس رہنا، ہم بس آدھے گھنٹے تک آتے ہیں۔'' چوکیدار کو ہدایات دیتے ہوئے اس نے گاڑی نکالی۔ ماریہ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑدیں۔
''آپ واپس کیوں آئے؟''
''کیونکہ میرا بہت دل کررہا تھا کہ میں اپنی گڑیا جیسی دوسری بیوی کے ساتھ ڈنر کروں۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے ہولے سے مسکرایا۔
''میں کس زاویے سے گڑیا لگتی ہوں؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
''یہ تو باقاعدہ ہاتھ لگا کے تمہارے کان میں بتانے والی بات ہے۔'' زخرف کے قہقہے پر وہ اسے گھور کر رہ گئی۔
ڈنر آدھے گھنٹے پر محیط ہوگیا۔ ان دونوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پیچھے کیا ہوگیا تھا۔ نہ جانے کس نے زخرف کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور سائرہ تک اطلاع پہنچ گئی تھی۔ اس نے گھر فون کیا تو پتا چلا کہ وہ دونوں ڈنر پر گئے ہوئے ہیں۔ تبھی جب زخرف کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو گھر والے شادی سے واپس آچکے تھے۔
گیراج میں کھڑی گاڑیاں دیکھ کے ماریہ کے تو ہوش اڑ گئے۔
''اب کیا ہوگا؟'' ساری خوشی لمحوں میں اڑن چھو ہوگئی۔
''تمہاری ساس اور سوتن تمہاری پٹائی کریں گی۔'' زخرف نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے اسے اور ڈرایا۔ وہ وہیں زمین میں گڑ گئی۔
''ڈاکٹر صاحبہ اب ساری رات یہیں کھڑی رہو گی کیا؟ چلو آؤ کچھ نہیں ہوتا۔'' زخرف نے اس کا ہاتھ پکڑا۔
اس کے نزدیک معاملہ اتنا سنگین نہیں تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے زخرف کے پیچھے اندر داخل ہوئی۔ توقع کے عین مطابق سب لوگ لاؤنج میں جمع تھے۔ ناعمہ بھی ان کے ساتھ ہی آگئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سائرہ ایک دم اس کی طرف آئی۔
''آج ایک فیصلہ کرلو تم..... اسے رکھنا ہے یا مجھے؟'' وہ سپاٹ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
''سائرہ میری بات سنو۔'' وہ آگے کو آیا۔
''ایک لفظ نہیں سننا مجھے۔ تم یا اسے رکھو یا پھر مجھے۔'' وہ اونچی آواز میں بولی۔
''اس گھٹیا لڑکی کی خاطر تم نے آج ہمیں سب کے آگے شرمندہ کروادیا۔'' شعیب ملک، ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت زدہ لہجے میں بولے۔
''زخرف میں نے ہی کہا تھا نا تمہیں اس سے شادی کرنے کو..... اب میں ہی کہہ رہی ہوں، طلاق دے دو اسے۔ میں ایک سیکنڈ بھی اسے برداشت نہیں کرسکتی۔ ابھی اسی وقت طلاق دو اسے..... ابھی دو.....'' سائرہ بلند آواز میں چلا رہی تھی۔

''ایک منٹ میری بات سنو۔'' اس نے سائرہ کو دونوں بازوؤں سے تھاما۔
''اگر تم اسے طلاق نہیں دو گے تو میں چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لیے، اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے برے طریقے سے زخرف کے دونوں ہاتھ جھٹک دیے۔ ماریہ لرزتے ہاتھوں سے دروازہ پکڑے خاموش کھڑی تھی۔
''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے زخرف..... بس بہت ہوگیا۔ اولاد چاہیے تھی نا تمہیں سول گئی۔ اب چلتا کرو اسے۔'' اسماء ملک سفاکی کی انتہا پر تھیں۔
''امی وہ میری بیوی ہے۔'' زخرف کو اس پر ترس آیا۔
''تو میں کیا ہوں تمہاری.....؟ ایک فالتو اور فضول چیز جس کی اب تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے..... تو بس پھر چھوڑ دو مجھے۔'' سائرہ غصے سے بولی۔
''زخرف تمہیں میری قسم..... طلاق دو اسے، ابھی طلاق دو اسے۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے زخرف کا گریبان پکڑلیا۔
''تمہیں میری محبت کی قسم..... ابھی اسی وقت چھوڑ دو اسے۔'' وہ اس کا گریبان کھینچتے ہوئے پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ ماریہ کے کھڑے رہنا دوبھر ہوگیا۔ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔ دونوں آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔
''سائرہ.....'' زخرف نے اسے زور سے جھٹکا دیتے ہوئے اپنا گریبان چھڑوایا۔
''ہوش میں آؤ..... !!''
قہر بار نظروں سے زخرف کو دیکھتی وہ ماریہ کی طرف آئی۔
''اس کی خاطر اگنور کررہے ہو مجھے۔ آج یہ مجھ سے زیادہ اہم ہوگئی ہے تمہارے لیے..... آخر اوقات ہی کیا ہے اس کی..... ؟ اسے آج تک اس کی ماں نے گلے نہیں لگایا ہوگا تو تم کون ہوتے ہو اس کی سائیڈ لینے والے..... نکلو یہاں سے..... نکلو باہر.....'' اس نے دونوں ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے اسے باہر کی طرف دھکا دیا۔
''سائرہ کیا کررہی ہو۔'' زخرف اور ناعمہ دونوں تیزی سے اس کی طرف آئے۔ اسماء ملک خاموش کھڑی تھیں۔
''مجھ سے غلطی ہوگئی جو تمہیں اس گھر میں لے آئی۔ معاف کردو مجھے اور یہاں سے دفع ہوجاؤ..... نکلو.....'' وہ پاگلوں کی طرح ماریہ کو دھکے دے رہی تھی۔
''اسے طلاق دو زخرف..... ابھی طلاق دو۔'' سائرہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماریہ کو جان سے ماردے۔
''سائرہ چھوڑو اسے..... ہوش میں آؤ..... چھوڑو اسے.....'' بمشکل اسے بازوؤں میں جکڑتا وہ گھسیٹ کے اندر لے کر آیا۔
''زخرف اسے طلاق دو.....'' اس نے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی تھی۔ زخرف اسے کھینچتے ہوئے کمرے تک لے کر آیا۔
''پلیز سائرہ..... خود کو سنبھالو..... ہوش کرو۔'' اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس دیتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
''اس کا خیال رکھنا، کمرے سے باہر نہ نکلے، میں ابھی آتا ہوں۔'' ناعمہ کو کہتے ہوئے وہ باہر آیا۔ لرزتے، کانپتے وجود کے ساتھ بے آواز روتے ہوئے وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دوپٹا نہ جانے کہاں تھا۔
''ماریہ..... میری طرف دیکھو۔'' اس کے پاس بیٹھتے ہوئے زخرف نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما۔
''کچھ دیر کے لیے اپنی امی کے گھر چلی جاؤ..... میں اسے سمجھا کے تمہیں واپس لے آؤں گا۔''

"نہیں مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ آپ نے وعدہ کیا..... چھوڑیں گے نہیں۔" وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بول رہی تھی۔

"چھوڑ نہیں رہا ماریہ..... بس تھوڑی دیر کے لیے چلی جاؤ۔"

مگر وہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔ "آپ نے وعدہ کیا تھا زخرف....." وہ بس یہ ہی کہے جا رہی تھی۔ زخرف نے بمشکل اسے کھڑا کیا، سر اور کندھوں کے گرد دوپٹا لپیٹتے ہوئے اسے گاڑی تک لایا۔

"زخرف میں مر جاؤں گی آپ کے بغیر..... میں نہیں رہ سکوں گی۔" وہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

"نہیں جانا کہیں بھی مجھے..... مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے ہمیشہ اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔ زخرف میری بچیاں..... میں کیسے رہوں گی ان کے بغیر۔" ماریہ کے وجود کی لرزش اور ہونٹوں کی کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ زخرف بمشکل اسے گھر تک لایا۔ نائلہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"آنٹی میں صبح تک لے جاؤں گا اسے، بس ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔" اسے اندر لاتے ہوئے بمشکل اس نے نائلہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی آخر ماں تھیں اسے یوں روتا، تڑپتا دیکھ نہ سکیں۔

"تمہاری خاطر جہاں چھوڑ دیا تھا اس نے زخرف..... تم کس کی خاطر چھوڑ رہے ہو اسے؟"

"بھروسہ رکھیں آنٹی..... میں نہیں چھوڑ رہا اسے۔"

"زخرف آپ نے وعدہ کیا تھا..... آپ نے کہا تھا نہیں چھوڑیں گے۔" اس نے بلکتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے زخرف کی ٹانگیں پکڑ لیں۔

"ماریہ پلیز یار، بس صبح تک....." اس نے بمشکل اسے دور کیا۔

"اب نہیں رہ پاؤں گی میں..... اب نہ چھوڑیے گا۔" وہ روتے ہوئے دروازے تک آئی تھی۔ زخرف دروازہ پار کر گیا۔

نائلہ نے اس کا شکستہ وجود گلے سے لگا لیا۔

☆.....☆

وہ واپس آیا تو سائرہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ بمشکل اسے ہوش میں لایا۔ "طلاق دے دی ہے نا اسے؟ بتاؤ، دے دی ہے نا؟" اس کا بازو پکڑے سائرہ کا ایک ہی سوال تھا۔

"ہاں دے دی۔ تم پلیز ریلیکس ہو جاؤ، دے دی طلاق۔"

اسے خواب آور گولیاں دے کر بمشکل سلایا۔ ساری رات اس کے سرہانے بیٹھا جاگتا رہا۔ صبح تک وہ پرسکون ہوئی۔

"میری بچیاں کہاں ہیں؟" بہت بے تابی سے اس نے دونوں گڑیوں کو آغوش میں لیا۔

"یہ صرف میری بیٹیاں ہیں۔ کسی کا کوئی حق نہیں ہے ان پر۔"

زخرف چپ چاپ باہر آ گیا۔

"اسے کہاں چھوڑ کے آئے؟" نائمہ نے ہولے سے پوچھا۔

"اس کی امی کے گھر۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

"اب کیا کرو گے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"میں نے اسے چھوڑا تو مر جائے گی وہ..... ایک ہی وعدہ لیا تھا اس نے مجھ سے کہ میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔" وہ صوفے پر گر گیا۔

"زخرف..... یہ اس روز بھی آئی تھی نا جب تمہارا اور سائرہ کا نکاح تھا؟"

زخرف نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تب بھی تو اپنی مرضی سے چھوڑ گئی تھی نا تمہیں..... تو ایک بار اور نہیں چھوڑ سکتی کیا؟"

زخرف سیدھا ہوا۔ "اس رات دوستی کی خاطر چھوڑ گئی تھی، اب کس کی خاطر چھوڑے.....؟ اس دوستی کی خاطر جو خودغرضی کے سوا اور کچھ نہیں....." وہ کہتا گیا۔

"اور نائمہ وہ ہی کیوں چھوڑے ہر بار؟ ہمیشہ قربانی دینا اسی کا فرض تو نہیں ہے۔ اس نے تو نہیں کہا تھا اس گھر میں آنے کے لیے، نہ مجھ سے نہ سائرہ سے۔ سائرہ نے ہم سب کو مجبور کیا تھا اسے لانے کے لیے۔ اپنی مرضی سے لے کر آیا ہوں میں اسے..... تو پھر اب کیسے چھوڑ دوں؟ اور کیوں چھوڑ دوں؟ کوئی وجہ بھی تو ہو۔"

نائمہ چپ رہ گئی۔

"مجھے نہیں پتا دنیا سے کیا کہے گی لیکن وہ میری بیوی ہے اور مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں کہتا اٹھ گیا۔ سائرہ کو نارمل دیکھ کے کچھ دیر بعد وہ گاڑی لے کر دوبارہ نائلہ کی طرف آ گیا لیکن ان کا دروازہ لاکڈ تھا۔

وہ پریشان ہو گیا۔

"رات ہی رات میں کہاں چلی گئیں؟" سوچتا ہوا وہ واپس آ گیا۔ سیل گھر ہی بھول آیا تھا۔

"دوسرا سیل کہاں ہے۔" ڈھونڈتے ہوئے وہ اندر آیا۔

"وہ پڑا ہے۔" سائرہ نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آف ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے چارجنگ پر لگایا اور خود پانی سی ایل سے نائلہ کو فون کیا۔ کسی نے بھی نہیں اٹھایا تو وہ اور پریشان ہو گیا۔ دوپہر کو وہ اسپتال جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ شایان کی کال آ گئی۔

"جلدی اپنے اسپتال پہنچو، ماریہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" ہر چیز چھوڑ چھاڑ کے وہ اسپتال بھاگا۔

☆.....☆

وہ ساری رات دروازے سے لگی روتی رہی۔ نائلہ اسے منا منا کے ہار گئیں لیکن وہ اندر نہ گئی، نائلہ کے شوہر دونوں بچوں کے ساتھ گاؤں گئے ہوئے تھے صرف وہی گھر پر تھیں۔

"بس کرو ماریہ! کیوں ہلکان ہو رہی ہو، کتنا منع کیا تھا؟" اس کا یوں بلک بلک کر رونا ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"وہ آئیں گے امی..... ضرور آئیں گے، انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" زخرف کے انتظار میں دروازے سے ہی جڑی رہی۔ صبح ہو گئی لیکن زخرف نہ آیا۔ وہ اپنے یقین کو مرتے ہوئے نہ دیکھ سکی۔ لڑکھڑاتے ہوئے اندر آئی اور زخرف کا نمبر ملایا۔ "زخرف آپ نے کہا تھا صبح کو آئیں گے، کہاں ہیں آپ؟" کال ریسیو ہوتے ہی وہ دیوانوں کی طرح بول پڑی۔

"آخری بار کہہ رہی ہوں بھول جاؤ زخرف کو..... اب کبھی نہیں آئے گا وہ۔" سائرہ سخت لہجے میں بولی۔

"مجھے زخرف سے بات کرنی ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"اس نے تمہیں طلاق دے دی ہے سمجھیں، اب نہیں آئے گا وہ۔" غصے سے کہہ کر سائرہ نے کال ڈس کنیکٹ کر کے اس کا سیل آف کر دیا۔

بے یقینی کی آخری حدوں کو چھوتی وہ دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے نیچے کو بیٹھی۔ شدید درد تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔

"ماریہ! کیا ہوا بیٹا؟" نائلہ پریشانی سے اس کی طرف آئیں۔

"ایسا نہیں ہو سکتا، زخرف نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے کبھی نہیں چھوڑیں......" اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔
"نائلہ نے اسی وقت زخرف کا نمبر ملایا لیکن اس کا نمبر بند تھا۔ ماریہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر فرش پر گر گئی۔
نائلہ نے شایان کا نمبر ملایا۔
"خیریت ہے آنٹی؟" اس نے پوچھا۔
"بیٹے پلیز ذرا جلدی سے آجاؤ، ماریہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ میں گھر میں اکیلی ہوں بیٹے......زخرف کا نمبر بند ہے۔" وہ پریشانی سے بولیں۔
"آنٹی میں بس ابھی آیا۔" دیوانہ وار گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔
ماریہ بالکل بے جان ہو چکی تھی۔ اسے گاڑی میں لے کر نائلہ کے ساتھ وہ سیدھا اپنے اسپتال آیا۔ زندگی اور موت کی جنگ لڑتے ہوئے ماریہ ایک بار پھر آئی سی یو میں تھی۔ کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر کرن دو گھنٹے بعد آئی سی یو سے باہر آئیں۔
"کیا صورت حال ہے؟" زخرف بہت پریشان تھا۔
"ڈاکٹر شایان کیا انہیں پہلے بھی......" اس نے فوراً کرن کی بات کاٹ دی۔
"انہیں ایک اٹیک ہو چکا ہے۔" وہ فوراً بولا۔
"انہیں دوبارہ سے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" وہ کرن کی بات سن کر دم بخود رہ گیا۔
"بہت سیریس حالت ہے ان کی، دل انتہائی کمزور ہو چکا ہے۔ بائی پاس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے اور اگر جلدی نہ کیا گیا تو......" اس سے آگے کرن خاموش ہو گئی۔
"آپ کریں گی؟" اس نے پوچھا۔
"میں نے پہلے کبھی نہیں کیا...... اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو......" کرن کو آئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ فوراً نائلہ کی طرف آیا۔ اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
"آنٹی ماریہ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسے فوری طور پر بائی پاس کی ضرورت ہے۔ ہمیں اسے شفاء اسپتال لے جانا ہوگا۔" اس نے بڑے آرام آرام سے انہیں بتایا۔ وہ از حد پریشان ہو گئیں۔
"پہلے ہی اٹیک پر بائی پاس......!!" وہ سمجھ نہ پائیں۔
"ماریہ کا دل بہت کمزور ہو چکا ہے آنٹی اس لیے یہ ضروری ہے۔"
وہ اسی وقت اس کا اسٹریچر ایمبولینس میں ڈال کے نائلہ کو ساتھ لے کر شفاء اسپتال آ گیا۔ ایمرجنسی وارڈ میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو تفصیلاً ساری صورت حال بتا کے وہ نائلہ کو وہیں چھوڑ کے خود ڈاکٹر ولید کے آفس کی طرف آ گیا۔
"خیریت تو ہے شایان؟" وہ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی دیکھ کر بولے۔
"میں آج ایک بار پھر ڈاکٹر ماریہ کو لے کر آیا ہوں، اسی حالت میں۔" وہ دھیرے سے بولا۔
"اوہ مائی گاڈ...... کہاں ہیں وہ؟" وہ جلدی سے کھڑے ہوئے۔
"آئی سی یو میں۔" وہ ان کے پیچھے باہر آتے ہوئے بولا۔
"ارجنٹ بائی پاس ہوگا۔" ان کے ساتھ آتے ہوئے اس نے انہیں سرسری سا سب بتا دیا۔
"زخرف کہاں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"پتا نہیں۔" وہ کندھے اچکا گیا۔ ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوتے ہوئے وہ سیدھے آئی سی یو کی طرف آئے اور

تیزی سے اندر داخل ہوئے لیکن دروازے میں ہی ٹھٹھک گئے۔ چند لمحوں بعد دو قدم پیچھے کو مڑے اور ساکت رہ گئے۔ نائلہ دم سادھے انہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔
کتنے سالوں بعد...... پانچ سال، دس سال...... نہیں پورے بائیس سالوں بعد۔
ڈاکٹر ان کی طرف آئے۔
"تم یہاں، خیریت......؟" انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔
"میری بیٹی ہے...... اندر۔" وہ ان کی بات سن کر دم بخود رہ گئے۔
"نائلہ کی بیٹی...... ماریہ؟"
"میری بیٹی......؟" ان کے لبوں سے نکلا۔
شایان کی آنکھیں کھل گئیں۔
"ہاں تمہاری بیٹی۔" نائلہ کی بات پر ان کی آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ شایان کی کھلی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔
"ڈاکٹر ماریہ خان...... ایک انتہائی قابل باپ کی بے انتہا قابل بیٹی۔"
ڈاکٹر ولید غائب ہوتے دماغ کے ساتھ اندر آئے۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ بیڈ پر پڑی تھی۔ ان کی گڑیا...... جسے صرف سات سال کی عمر میں اکیلا کر دیا تھا انہوں نے...... وہ آج زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔ کتنا یاد کیا کرتے تھے وہ اسے......؟ روپڑتے تھے بعض اوقات بے چینی سے سو نہیں پاتے تھے۔ نہ جانے کیسی ہو گی، کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی......؟ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے انہیں کہاں پتا تھا کہ وہ سات سالہ گڑیا ان جیسا بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔
کارڈیالوجسٹ ماریہ خان کے بارے میں بات کرتے ہوئے، اس کے لیکچرز اٹینڈ کرتے ہوئے، اس کی بے تحاشا تعریفیں سنتے ہوئے...... انہیں کہاں اندازہ تھا کہ وہ ان کی اپنی کارڈیالوجسٹ تھی۔ ان کی ذہین ترین بیٹی انہیں تو تب بھی نہیں پتا تھا جب انہوں نے اسے موت کے منہ سے بچایا تھا۔
"کیا وہ جانتی تھی کہ وہ میری بیٹی ہے؟" اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کے وہ سوچتے چلے گئے۔
"ان کا دل بہت کمزور ہو چکا ہے ڈاکٹر...... ارجنٹ بائی پاس کرنا پڑے گا۔ ہر چیز تقریباً مکمل ہے بس...... آپ شروع کریں۔" ایمرجنسی ڈاکٹر نے انہیں بتایا۔
"اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کسے ترجیح دیتے ڈاکٹر...... کسی اور کے شاندار سے اسپتال کا انتہائی پرسکون آئی سی یو یا اپنی چند دن کے اسپتال کا جنرل وارڈ!" ان کے ذہن میں اس کی آواز گونجی۔
وہ شاندار رائزنگ اسٹار ان کا خون تھی۔ وہ خود کو یکجا نہیں کر پا رہے تھے۔ بائیس سالوں میں آج پہلی دفعہ آپریشن تھیٹر میں انہیں پسینہ آ گیا۔ پہلی بار انگلیاں لرز گئیں۔
وہ بہادر لڑکی ان کا اپنا خون تھی۔ اپنی روگی ماں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی آگے بڑھ جانے والی، بنا کسی سہارے کے ڈاکٹر ماریہ خان بن جانے والی۔ اپنی محنت اور قابلیت سے پورا اسپتال کھڑا کر لینے والی اور پھر...... اپنی محبت کی خاطر سب کچھ لمحوں میں قربان کر دینے والی۔
وہ آپریشن شروع نہیں کر پا رہے تھے۔
"ہمیشہ یاد رکھنا زخرف...... تم تب تک اپنے مریض کی جان نہیں بچا سکتے جب تک تمہیں خود پر یقین نہ ہو۔" انہوں نے ایک بار زخرف سے کہا تھا اور آج بائیس سالوں میں پہلی بار انہوں نے خود پر سے وہ یقین کھو دیا تھا۔

وہ پہلی بار ڈر گئے تھے۔

"ڈاکٹر زخرف کو بلاؤ۔" انہوں نے ماسک اتارتے ہوئے نرس سے کہا۔

"وہ آج نہیں آئے۔" ساتھی ڈاکٹر نے فوراً کہا۔ تبھی زخرف دروازہ کھولتے ہوئے اندر آیا۔ اسے شایان نے کال کردی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ تیزی سے آگے کو آیا۔

"ارجنٹ بائی پاس!" انہوں نے انسٹرومنٹ کٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ماسک اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ زخرف حیرانی سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ نہیں کریں گے۔" اس نے پوچھا۔

"مجھ سے نہیں ہوگا۔" وہ حیرانی سے ان کی کپکپاتی انگلیاں دیکھنے لگا۔

"میں ڈاکٹر ولید بن کر تمہیں، ایک باپ بن کر تم سے التجا کرتا ہوں ڈاکٹر زخرف..... میری بیٹی کو بچالو۔" انہوں نے زخرف کے سر پر بم پھوڑا۔ وہ دم بخود رہ گیا۔

"یہ مجھے بائیس سالوں بعد ملی ہے ڈاکٹر..... اب میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔" ان کی آواز بھرا آئی، زخرف گم صم کھڑا رہ گیا۔

"شایان ایک بار پہلے بھی اسے یہاں لایا تھا۔ تمہارے نکاح والی رات..... اسے تب ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" ایک اور انکشاف..... چند گھنٹوں پہلے اسے دوسرا اٹیک ہوا ہے۔ یاد ہے نا میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ یہ بہت بہادر ہے۔ اس کی محبت کا ہمیشہ احترام کرنا..... لیکن تمہاری محبت کی خاطر ہار اپنے دل کی قربانی دینا اس کا فرض نہیں ہے زخرف..... میری ماریہ کا فرض نہیں ہے۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

زخرف خاموش کھڑا رہ گیا۔

"آپ نے کبھی کسی مریض کا بائی پاس کیا ہے۔" ایک بار ماریہ نے پوچھا تھا۔

"نہیں، لیکن ڈاکٹر ولید کو کئی بار اسسٹ کیا ہے، بڑے مضبوط دل کا کام ہے، یہ کسی کا بائی پاس کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی قدر و قیمت کیا ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا ہوتی ہے بھلا....." ماریہ نے سوال کیا تھا۔

"وہ مریض جان سے پیارا ہو جاتا ہے بس....." وہ ہنسا تھا۔

"پھر تو میری دلی خواہش ہے..... میرا بائی پاس آپ کریں، کم از کم اس کے بعد میں جان سے پیاری تو ہو جاؤں گی۔" ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اس نے چند لمحوں بعد ماسک پہن لیا۔

"میں بھی تمہیں بھی کھونا نہیں چاہتا ماریہ۔" اس نے دل میں سوچا۔ چھ گھنٹوں بعد وہ آئی سی یو سے باہر نکلا۔ ڈاکٹر ولید باہر ہی انتظار کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کچھ دیر تک ہوش آجائے گا۔" اس نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" نائلہ کی دعائیں رنگ لے ہی آئیں۔ شایان کو بھی سانس آیا۔

"آنٹی اگر آپ مناسب سمجھیں تو گھر چلی جائیں۔" نائلہ نے شایان کی بات کاٹ دی۔

"وہ ہوش میں آجائے..... پھر جاؤں گی۔" شایان چپ ہو گیا۔

"زخرف میرے ساتھ آؤ۔" ڈاکٹر ولید اسے ساتھ لے کر اپنے آفس میں آئے۔

"بیٹھو۔" وہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"کیا ہوا تھا؟" انہوں نے پوچھا۔

زخرف نے چند لفظوں میں انہیں ساری بات بتادی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"تم تو پوری طرح رکھو..... یا پھر پوری طرح چھوڑ دو، اسے بیچ میں معلق نہ کرو۔" وہ دھیرے سے بولے۔

"دیکھو زخرف! محبتیں قرض ہوتی ہیں اور ہمیں وہ قرض اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اگر ہمیں لگے کہ ہم ناکام ہو رہے ہیں تو اس قرض کو احسان مان لینا چاہیے۔ وہ میری بیٹی ہے اس لیے نہیں کہہ رہا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتی تو میں یہی کہتا یا تو اس کے قرض کو پوری طرح اتارو یا پھر اس کا احسان مان لو۔" وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتا گیا۔

☆.....☆

"اسے پتا تھا میں اس کا باپ ہوں؟" انہوں نے ہولے سے پوچھا۔

"شاید....." نائلہ دھیرے سے بولیں۔

"میرے بارے میں کیا سوچتی ہے وہ نائلہ؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہے۔ میں اس کے حقوق پورے نہیں کر پائی۔ ہم دونوں ہی مجرم ہیں ولید..... تم اسے چھوڑ دینے کے اور میں اسے لے کے بھی چھوڑ دینے کی..... میں صرف سات سالوں تک اس کی تھی، اس کے بعد نہیں، بالکل تمہاری طرح تم اپنے خوابوں کے پیچھے لگ گئے اور میں اپنے دوسرے شوہر کے احسانات اتارنے میں لگ گئی۔ تم اپنے بیوی بچوں میں مگن ہو گئے اور میں اپنے شوہر اور بچوں میں، وہ گڑیا اکیلی رہ گئی، تنہا ہو گئی، تم تو ویسے ہی چھوڑ گئے تھے، میں نے ساتھ ہوتے ہوئے بھی خیال نہ رکھا، تم تو ویسے ہی ساتھ نہیں تھے، میں نے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہ دیا۔

وہ ہر قدم پر اکیلی تھی ولید..... جس رات تم گئے تب بھی، جس رات میرا نکاح ہوا تب بھی۔ جس دن وہ ڈاکٹر بنی تب بھی، جس دن اس نے اپنی محبت کھوئی تب بھی، جس دن اس نے ہر چیز کو ٹھکرا کے زخرف کو چنا تب بھی اور..... آج بھی..... وہ آج بھی اکیلی ہے....." نائلہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"وہ مجھے معاف کردے گی؟" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بہت بڑا دل ہے اس کا، ہماری طرح خود غرض نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے بولیں۔

شام تک اسے ہوش آگیا۔ جو پہلا لفظ اس کے خشک لبوں سے نکلا وہ "زخرف" تھا۔ نرس دوڑتے ہوئے اسے بلانے آئی۔ وہ بھاگتا ہوا آئی سی یو تک آیا، اشارے سے اس نے سب کو باہر جانے کا کہا۔

"چھوڑ دیا نا۔" وہ ویران آنکھوں سے بولی۔

"چھوڑنے کے لیے نہیں اپنایا تھا۔" وہ اس کے پاس بیٹھا۔

"مگر سائرہ نے تو کہا کہ....." اس کی آنکھوں میں خوف در آیا۔

"مجھے تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔" وہ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے بولا۔ اس کا پورا وجود سوالیہ ہو گیا۔

"آئی لو یو!" پانی بھری آنکھوں کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے ماریہ کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کے آنسو ماریہ

کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔

''میں دنیا چھوڑ سکتا ہوں، تمہیں نہیں۔''

سکون کی ایک لہر تھی جو ماریہ کے پورے وجود میں اتر گئی وہ جواباً کچھ بھی نہ کہہ سکی ایک لفظ بھی نہیں۔

''تم مجھے میری جان سے بھی زیادہ پیاری ہو۔'' اس کے چہرے کو محبت سے چومتے ہوئے اس نے سچے اور مضبوط لہجے میں کہا۔ بہت دیر تک وہ اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ ماریہ بالکل خاموش تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ سوگئی۔

زخرف اپنے آفس میں آیا تو اسسٹنٹ نے بتایا کہ اس کے گھر سے کئی بار فون آچکا ہے۔ پورے عملے کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لیے گھر آگیا۔

''کہاں چلے گئے تھے؟'' سائرہ نے اس کے بے حد سنجیدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اسپتال۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''اسپتال گئے تھے یا پھر اس شاطر لڑکی کی دلجوئی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔'' سائرہ کے الفاظ پر اسے پہلی بار شدید غصہ آگیا۔

''بس سائرہ..... اس کے متعلق ایک بھی اور لفظ نہیں بولو گی تم۔'' اس نے درشت لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

''بس اب یہ ہوگئی میری حیثیت.....'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔

''خدا کا واسطہ ہے تمہیں، اس معصوم لڑکی کو بخش دو۔ تمہارا جھوٹ آج اس کی جان لے لیتا، بائی پاس ہوا ہے اس کا۔'' زخرف کی آواز اونچی ہوگئی۔

''تم وہ سائرہ تو نہیں ہو جس سے پیار کیا تھا میں نے؟ جسے دیکھ کر مجھے فخر ہوتا تھا کہ یہ میرا انتخاب ہے۔ وہ اتنی خود غرض تو نہیں تھی؟'' زخرف کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔

''تم اسے نہیں چھوڑو گے؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''نہیں، کیونکہ میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میرا دل اتنا چھوٹا نہیں ہے کہ وہاں ایک انسان کی محبت کے بعد کسی اور کے لیے جگہ ہی نہ رہے۔ تمہارے ساتھ بھی بے وفائی نہیں کی، اس کی بے تحاشا محبتوں کو ہمیشہ تمہاری خاطر ٹھکرایا میں نے، اپنے دل میں ہمیشہ تمہیں ہی رکھا، لیکن اب وہ میری بیوی ہے سائرہ! چاہے دوسری ہی سہی، تم چاہو تو اسے بے وفائی کہہ لو لیکن میں صرف تمہیں خوش کرنے کی خاطر اس لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتا جس کی ذات میں خلوص اور خالص محبت کے سوا اور کچھ نہیں.....'' وہ مضبوط لہجے میں کہتا چلا گیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، اسے ہی رکھو، میں نہیں رہوں گی تمہارے ساتھ۔'' دوٹوک لہجے میں بولی۔

''یہ سراسر تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ میں نے تم پر کبھی زبردستی نہیں کی، نہ شادی سے پہلے اور نہ بعد میں۔ تم میری پہلی بیوی ہو، میری پہلی محبت ہو، میرے دل میں تمہارا جو مقام ہے وہ کوئی نہیں چھین سکتا۔ میرے خاندان کی عزت ہو تم، میں بھی نہیں چاہوں گا کہ تم مجھے چھوڑ کر جاؤ۔ میں پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ میں تم بن ادھورا ہوں۔ تمہیں منا کے واپس لانے کے جتن کروں گا کیونکہ..... تم مجھے بہت عزیز ہو لیکن اگر مجھ سے الگ ہونا ہی تمہارا آخری فیصلہ ہوگا تو..... تو زبردستی تو تم پر بھی کی ہی نہیں۔'' وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

گھر والوں میں سے صرف ناعمہ نے ماریہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ دوبارہ اسپتال آگیا۔

ماریہ کی حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ سہ پہر کے وقت اسے ناعمہ کی کال آئی، سائرہ دونوں بچیوں کو چھوڑ کے اپنی امی کے گھر چلی گئی تھی۔

☆.....☆

نائلہ اس کا سر اپنی گود میں رکھے دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔ ڈاکٹر ولید اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھے تھے۔

''بابا میں بالکل آپ جیسا بن کے آپ کے سامنے آنا چاہتی تھی۔ پرفیکٹ..... کامیاب اور آسودہ، میں آپ کو دکھانا چاہتی تھی کہ رشتے پاؤں کی زنجیر نہیں ہوتے، ہمیشہ محبتیں بلند رہنی چاہئیں، خواب پورے ہو ہی جاتے ہیں۔'' وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔

''میں نے ہمیشہ رشتے نبھانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی اپنی ذات سے کسی کو دکھ نہیں پہنچایا۔ کبھی اپنی زبان سے کسی کو تکلیف نہیں دی لیکن..... میں پھر بھی ہمیشہ خالی ہاتھ ہی رہی ہوں۔'' اس کے آنسوؤں پر وہ تڑپ گئے۔

''میں جانتی ہوں امی مجھ سے خوش نہیں ہیں، امی کے خاندان والے بھی مجھ سے ناراض ہیں۔ بابا آپ بھی میرے حصے میں نہیں ہیں۔ بھرپور کوشش کے باوجود میں نے سائرہ کی دوستی کو بھی کھو دیا۔ میں آج تک شایان کا حق بھی ادا نہیں کر پائی اور زخرف.....'' اس سے آگے صرف اس کے آنسو تھے۔

''ماریہ میری گڑیا، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' نائلہ نے اس کی پیشانی چومی۔

''ماریہ تم تنہا نہیں ہو بیٹے! محبتوں کو سمیٹنے والے بھی تنہا نہیں ہوتے۔ مجھے اپنے بہادر خون پر بہت فخر ہے۔ میرا وعدہ ہے تم سے کہ آج کے بعد تم کو کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں ماضی کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا لیکن مستقبل کو روشن کرنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔'' انہوں نے بہت محبت سے اس کا کمزور اور شکستہ وجود اپنی آغوش میں لیا۔

''محبتیں رائیگاں نہیں جاتیں ماریہ.....! زخرف تمہارے پاس خود لوٹ کر آئے گا۔'' وہ دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے۔ رات کو زبردستی ماریہ نے نائلہ کو گھر واپس جانے کے لیے راضی کیا وہ کافی تھک گئی تھیں۔ شایان انہیں گھر چھوڑ کے خود اسپتال چلا گیا۔ کچھ دیر بعد حفصہ کی کال آگئی، وہ اسے گھر آنے کا کہہ رہی تھیں۔ کچھ مریضوں سے فارغ ہو کے وہ تقریباً رات دس بجے ان کی طرف آگیا۔

''میں اس لڑکی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں شایان..... اب گھر آکر بیٹھ گئی ہے۔'' وہ اس کے آگے چائے کا کپ رکھتے ہوئے بولیں۔ شایان بھی پریشان ہوگیا۔

''زخرف نے کچھ کہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں بتا رہی۔ جب اس کی دوسری شادی کروا رہی تھی تب منع کرنے کے باوجود باز نہیں آئی۔ اب جب اس نے دونوں بچیاں بھی اسے ہی دے دی ہیں تو نہ جانے کیا پریشانی ہے۔ زخرف کو فون کیا تو وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ ایسے کیسے طلاق دے دے وہ اسے۔'' حفصہ کے لہجے میں جہاں بیٹی کی طرف داری تھی وہیں ماریہ کا دکھ بھی تھا۔

''شایان اسے سمجھاؤ، دوسری بیوی کے ہوتے ہوئے وہ اس سے بالکل ہی آنکھیں تو نہیں پھیر سکتا نا۔'' جو بات سائرہ کو سمجھنی چاہیے تھی وہ سارا جہان سمجھ چکا تھا۔

''یہ آخر کونسا بھوت چڑھ گیا ہے کہ تمہیں جو اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔'' شایان اس کے کمرے کے دروازے

میں کھڑا ہو کر بولا۔ وہ تکیے میں منہ دیے لیٹی تھی۔

"کسی ایک کی بات تو سمجھ جاؤ۔ میری نہیں سمجھنی اپنی ماں کی نہیں سمجھنی تو اسی کی سمجھ جاؤ جس سے پیار کرتی ہو۔" وہ آگے کو آیا۔

"آپ ہمیشہ اسی کی سائیڈ لیتے ہیں؟" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"میں اس کی سائیڈ لیتا ہوں جو درست ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"تو میں غلط ہوں کیا؟" وہ تڑخ کے بولی۔

"ہاں...... تم تب بھی غلط تھیں جب تم نے اس کی اور زخرف کی شادی کروائی اور تم آج بھی غلط ہو جب ان دونوں کی طلاق پر زور دے رہی ہو۔" شایان کی آواز اونچی ہوگئی۔

"صرف ایک بات بتاؤ مجھے۔ اسے زخرف کی زندگی میں کیوں لائی تھیں تم؟"

"غلطی ہوگئی مجھ سے۔" وہ بولی۔

"تو بس پھر اب اس غلطی کا خمیازہ بھگتو۔ ہمیشہ ہر غلطی قابل معافی نہیں ہوتی۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے جب کوئی آپ کے اور آپ کے شوہر کے بیچ آئے۔ شوہر کی توجہ اور محبت کسی طور بانٹی نہیں جاتی، بالکل ایسے ہی غصہ آتا ہے، بالکل ایسے ہی نفرت محسوس ہوتی ہے جیسے تمہیں ہو رہی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے سائرہ، تمہارے حق پر ڈاکا ڈالتی کوئی عام سی انجان لڑکی نہیں ہے وہ، خلوص اور محبت میں گندھی ماریہ خان ہے وہ، جس کے کردار کی مضبوطی کی میں آنکھیں بند کر کے گواہی دے سکتا ہوں اور جب میں دے سکتا ہوں تو زخرف کیوں نہ دے جو اس کی بے تحاشا محبتوں کا قرض دار ہے۔"

زوہیب نہ جانے کب دروازے میں آ کھڑے ہوئے۔

"اپنے اس ظرف کو بلند کرو جو تمہیں تمہاری ماں سے ملا ہے اور واپس چلی جاؤ۔ وہ تمہارا شوہر ہے جو تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ تمہارا گھر ہے جہاں تمہاری دو بیٹیاں ہیں، اپنی جنت کو اپنے ہاتھوں سے مت اجاڑو۔" اسے ہر ممکن سمجھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک نظر زوہیب کو دیکھ کر باہر نکل گیا۔

"سنو!" انہوں نے ہولے سے اسے روکا۔ شایان نے رک کے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ تمہاری بہن ہے۔ اس کی خوشیوں کو سامنے رکھتے ہوئے بتانا کہ وہ لڑکی کس قابل ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے میری ماں کی قسم، وہ اس قابل ہے کہ اس کا ٹھکانہ ہمیشہ زخرف جیسے انسان کے دل میں رہے۔ سر آنکھوں پر بٹھانے کے قابل ہے وہ۔" مضبوط لہجے میں کہتا وہ باہر نکل گیا۔ زوہیب سائرہ کو دیکھ رہ گئے۔

شایان وہاں سے سیدھا اپنے فلیٹ پر آگیا۔ وہ کئی گھنٹوں سے جاگ رہا تھا۔ کچھ گھنٹے سونے کے بعد فریش ہوا۔ اسپتال آیا اور کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد کچھ سوچتا ہوا سیدھا شفاء اسپتال آ گیا۔

"اندر آ سکتا ہوں؟" اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دیتے ہوئے پوچھا۔ زخرف اسے دیکھ کے کافی حیران ہوا۔

"آؤ شایان...... بیٹھو۔" خوشدلی سے کہتے ہوئے اس نے چائے لانے کا کہا۔

"کیسی ہیں اب ڈاکٹر ماریہ؟" اس نے پوچھا۔

"بہت بہتر ہیں۔ خدا کا شکر ہے۔" زخرف پرسکون لہجے میں بولا۔

"زخرف ہو سکتا ہے تمہیں میری بات سن کے غصہ آئے اور تم مجھ سے کہو کہ میں کون ہوتا ہوں تمہیں یہ سب کہنے والا لیکن میں پھر بھی کہوں گا۔" وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے پہلے نکاح والی رات جب میں اسے گاڑی میں ڈال کے انتہائی نازک حالت میں یہاں لے کر آیا تھا تو ایک وعدہ لیا تھا اس سے کہ آئندہ میں اسے کبھی یہاں مریض کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہتا لیکن......" وہ کچھ دیر رکا۔

"اس نے پاسداری نہیں کی، مجھ سے کیا وعدہ توڑ دیا، میں پھر اسے اسی حالت میں یہاں لے کر آیا۔" زخرف چپ چاپ سن رہا تھا۔

"میں آج تم سے صرف وہی وعدہ لینے آیا ہوں، پلیز زخرف میں اسے دوبارہ کبھی اس حالت میں یہاں لے کر نہیں آنا۔" زخرف کو لگا شایان کی آواز بھرا رہی ہے۔

"میں تمہاری طرح رشتوں اور محبتوں کے معاملے میں امیر نہیں ہوں زخرف...... بالکل ڈاکٹر ماریہ خان کی طرح، اسی لیے میں تمہاری طرح مضبوط نہیں ہوں، اسے یہاں لاتے ہوئے میں نہ جانے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہوں، میں نے اسے کبھی اپنی پلکوں سے نیچے نہیں اترنے دیا بالکل ویسے جیسے وہ تمہیں نہیں اترنے دیتی۔" زخرف کے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"زخرف جن کے حوالے دل کی حکومت کی جاتی ہے انہیں پھر ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ انہیں کبھی ان کے مقام سے نیچے نہیں گرنے دیا جاتا۔ انہیں ہمیشہ سب سے آگے دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ سب سے الگ، سب سے بلند، سب سے منفرد، بہت مضبوط اور بہت خوش، وہ تمہیں ہمیشہ ایسا ہی دیکھنا چاہتی ہے نا؟" شایان نے دھیرے سے اس سے پوچھا۔

"میں بھی اسے ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں زخرف ہمیشہ۔" کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

"شایان تم مجھے بہت زیادہ نہیں لیکن بہت حد تک جانتے ہو، میں نے بھی بڑے بڑے دعوے نہیں کیے، اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے کبھی قسمیں نہیں کھائیں، ہمیشہ میری کوشش ہوتی ہے کہ میری وجہ سے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں آئندہ اسے یہاں نہیں لانا پڑے گا۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

☆......☆

اس نے زوہیب اور حفصہ کے سامنے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ ماریہ کو طلاق نہیں دے گا۔

"مجھے سائرہ سے بہت محبت ہے چاچو اور میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا، ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے حقوق میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوگی لیکن...... میں ماریہ کو طلاق نہیں دوں گا۔ وہ میری بیوی ہے، میری بچیوں کی ماں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے، آپ نے ہی کہا تھا نا چاچو کہ محبت کسی کی بھی ہو، دل پر ہاتھ رکھ کے پوچھو کہ سچی ہے یا نہیں، میں نے بھی دل سے ہی پوچھا ہے اور آپ نے ہی کہا تھا کہ دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

"تم جب واپس آنا چاہو بس مجھے ایک میسج کر دینا۔ میں اسی وقت تمہیں لے جاؤں گا۔" آتے ہوئے اس نے سائرہ سے فقط اتنا کہا۔

"ابو مجھے معاف کر دیجیے گا لیکن آپ لوگوں کی جھوٹی انا، تعصب اور برادری کے لیے میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ لوگوں کو اگر اس کا وجود گوارا نہیں ہے تو میں اسے یہاں نہیں رکھوں گا۔" شعیب اور اسماء ملک کے سامنے اس نے ببانگ دہل کہا اور اس رات نہ جانے کتنے دنوں بعد وہ انتہائی پرسکون نیند سویا۔

ماریہ ابھی تک اسپتال میں ہی تھی۔ اس دن بھی وہ اس کا ڈسچارج لیٹر بننے کا کہہ کر خود اس کے کمرے میں آ گیا۔

''زخرف مجھے گھر جانا ہے۔'' وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

''ابھی تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ بہت شدید جھٹکا لگا تھا اسے، آنکھیں کئی کئی انچ اندر دھنس گئی تھیں۔

''سائرہ مان گئی کیا؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''میں نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا ہے۔ جیسے وہ چاہے۔'' وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ ماریہ چپ ہو گئی۔ پندرہ منٹ بعد اسپتال سے اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ زخرف اس کا ہاتھ تھام کر باہر لایا۔

''کہاں لے کر جا رہے ہو اب اسے؟'' ڈاکٹر ولید اپنے آفس سے نکلتے ہوئے بولے۔

''میری بیوی ہے، جہاں مرضی لے کر جاؤں۔'' وہ دھیمی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''دیکھنا کہیں دوبارہ یہاں نہ لے آنا، اسے رکھ کے تمہیں ہمیشہ کے لیے نکال باہر کروں گا۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

زخرف مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''یہ کس طرف جا رہے ہیں آپ؟'' وہ نہ تو اپنے گھر جا رہا تھا اور نہ ہی نائلہ کی طرف۔

''اپنے گھر...... تمہارا اور میرا۔'' وہ کہتے ہوئے ایک ڈبل اسٹوری مکان کے آگے رک گیا۔ ماریہ کو کندھوں سے تھام کے اندر لے کر آیا۔

''ابھی دو چار روز میں یہ فرنشڈ ہو جائے گا۔ کچھ سامان کم ہے وہ کل تک آ جائے گا۔ تمہاری امی اور ابو دونوں کے گھروں سے چھوٹا ہے لیکن گزارہ ہو جائے گا۔ اس سے بڑا ابھی میرے بجٹ سے باہر ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے ماریہ کو صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ تمہارا گھر ہے ماریہ...... تمہارا اور میرا، جب تک زندہ ہوں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ مرنے کے بعد کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ میں اپنا سارا وقت تمہیں نہیں دے سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہوا ضرور دوں گا اور مجھے اپنے لیے صرف چائے اور کھانا بناتی ماریہ نہیں چاہیے، مجھے وہ کارڈیالوجسٹ چاہیے جس سے مجھے پہلی بار خوف محسوس ہوا تھا۔ کارڈیالوجسٹ ماریہ خان...... جس کی انگلیوں میں خدا نے مسیحائی رکھی ہے۔ وہ اسپتال تمہاری محنتوں کا صلہ ہے، میں کون ہوتا ہوں اسے تم سے چھین لینے والا۔'' وہ دھیرے دھیرے کہے جا رہا تھا۔

''ہاں بس ایک مسئلہ ہے وہ تم مجھ سے ایک وعدہ کرو تو دور ہو سکتا ہے۔'' آخر میں کہتے ہوئے اس نے ماریہ کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے قید کیا۔

وہ اس کے لہجے کی شرارت سمجھ نہ سکی۔

''جی بولیں۔'' اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

''مجھے جڑواں بیٹے دو گی؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''یہ آپ کی تمنا ڈاکٹر زخرف۔'' وہ کہتے ہوئے اس کے سینے سے لگ گئی۔

''جو تمہارے بنا پوری تو نہیں ہو گی نا۔'' زخرف نے بہت محبت سے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا بنایا۔ محبت ایک بار پھر جیت گئی تھی۔

☆...... ختم شد ......☆

سدرہ چودھری

ماں

وہ اکیڈمی جانے کے لیے ابھی حجاب کر ہی رہی تھی جب اس کے موبائل کی بپ بجی۔ اس کے ہونٹ مسکرائے تھے۔ اس نے حجاب زدہ چہرے کو آئینے میں دیکھا اور پھر پلٹ کے موبائل اٹھایا تھا۔

اور میسیج دیکھ کہ اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی تھی۔ اس نے میسیج پڑھا اور پھر دل کا اسٹیکر بھیجا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ میسیج کرنے والے کے فیصلے سے راضی ہے۔

اس نے موبائل کو بیگ میں رکھا اور پھر بیگ کو کندھے پر ڈالے اپنے حجاب کو ایک نظر دوبارہ آئینے میں دیکھا اور کمرے سے نکل کر کچن میں ماں کے پاس آ رکی۔

اس کی ماں نے پلٹ کر اسے تیار دیکھا تو دعائیں پڑھ کر اس پہ پھونلیں اور اس کا ماتھا چوم کے اسے اللہ کے حوالے کر دیا۔

وہ دو قدم چلی اور پھر واپس پلٹ کے ماں کے گلے لگ گئی اور ماں کے گال پر پیار کیا۔

''بولو اب اور کیا بات ہے؟'' ماں اس کی رگ رگ سے واقف تھی، جانتی تھی کہ وہ اب ان سے کچھ مانگنے والی ہے۔

''اماں وہ باہر میرا انتظار کر رہے ہیں۔'' کہتے ساتھ ہی اس نے سر جھکا لیا تھا۔

جو اس بات کی یقین دہانی تھی کہ ماں اجازت دے گی تو وہ جائے گی نہ دیں گی تو وہ جانا ملتوی کر دے گی۔

''ٹھیک ہے۔ چلی جاؤ۔ لیکن کلاس مت چھوڑنا

اور اسے کہنا کہ واپسی پہ وہی تمہیں لینے آجائے اور رات کا کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھائے۔ میں کھانا تیار رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے اماں جیسا آپ کا حکم۔'' ماں کی اجازت ملتے ہی وہ باہر نکل آئی تھی۔ جہاں عدنان پہلے سے ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی وہ اس کے پاس چلا آیا تھا۔ اسے سلام کہتے ہی اس کے ساتھ چلنا شروع کر دیا تھا۔

''کیسی ہو اساور؟'' اس نے مسکرا کر ہمیشہ کی طرح پہلا سوال یہی کیا تھا۔

''تم میرے ساتھ ہو عدی تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

اور اس کی بات پہ وہ ہنس دیا تھا۔

''ہنس کیوں رہے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پہ یقین نہیں ہے؟'' اس کے ہنسنے پہ اس نے رک کر فوراً ہمیشہ کا سوال دہرایا تھا۔

''مجھے تم پہ خود سے زیادہ یقین ہے اساور۔ میں جانتا ہوں میں تمہارے لیے آکسیجن جیسی اہمیت رکھتا ہوں۔ اسی لیے تو دیکھو سب کام چھوڑ کے صرف تمہارے لیے چلا آتا ہوں۔

اور سچ پوچھو تو میں بھی نہیں رہ سکتا تمہیں دیکھے بنا۔''

''لیکن میں تو مکمل عبایا اور حجاب میں ہوں تم نے کیسے دیکھا مجھے؟

جسم کو دیکھنا دیکھنا نہیں ہوتا وہ ہوس ہوتی ہے اساور اور میں تم سے محبت کرتا ہوں اساور۔ پاکیزہ محبت۔ بالکل تمہارے جیسی پاکیزہ۔ جس پہ نہ کسی کی نظر پڑتی ہے اور نہ اپنا دکھاوا کرتی ہے۔ تم میرے دل کا سکون ہو اساور۔ جانتی ہو جب جب میں تمہیں دیکھتا ہوں مکمل چھپی ہوئی تب تب میرا دل اللہ کا اور شکر گزار ہو جاتا ہے کہ اس نے میرے دل میں تمہاری محبت ڈالی۔''

چلو محبت پہ پھر بات کریں گے اکیڈمی آگئی ہے۔ واپسی پہ لینے آجانا۔''

''لیکن اساور مجھے تو ابھی جانا ہے۔ واپسی پہ نہیں آسکتا۔''

''امی نے کہا تھا وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ رات کے کھانے پہ بلایا ہے تمہیں۔''

''اگلی دفعہ رک جاؤں گا۔ ابھی مجھے لازمی جانا ہے، کچھ کام ہے۔ نبٹانا ہے مجھے۔''

''لیکن عدی؟''

''کام بہت ضروری ہے ورنہ ضرور رکتا۔ پہلے کبھی تمہیں منع کیا ہے میں نے؟ پرسوں آجاؤں گا دوبارہ۔ تمہارے ساتھ ہی گزاروں گا سارا دن۔ لیکن ابھی میرا جانا ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے چلو جاؤ۔ اللہ حافظ۔'' اس نے اسے بنا دیکھے جواب دیا تھا اور اسے بنا دیکھے اکیڈمی میں چلی گئی تھی جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ ناراض ہو چکی ہے۔

اور وہ اسے یوں جاتا دیکھ کہ منہ پہ ہاتھ پھیر کے رہ گیا تھا۔

☆......☆

''کیا ہوا اساور؟ کیوں بڑبڑا رہی ہو؟''

اساور اکیڈمی میں داخل ہوئی ہی تھی جب ماریہ اس کے پاس آئی تھی اور اس کی بڑبڑاہٹ سن کر پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی۔ تم بتاؤ ابھی تک کلاس میں کیوں نہیں گئ؟

تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم دیر سے کیوں آئی ہو آج؟

نہیں بلکہ یہ پوچھنا ہی نہیں چاہیے کیونکہ تمہاری آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے کہ تم دیر سے کیوں آئی ہو۔''

''ہاں میری آنکھوں کی کیسی چمک؟ میری آنکھیں تو بالکل نارمل ہیں۔''

''ہاہاہاہا بالکل تم جب بھی عدنان سے مل کے آتی ہو نا تمہاری آنکھوں میں ایک عجیب چمک ہوتی ہے۔ ایسے جیسے تم نے بہت کچھ پا لیا ہو اور اب بھی تمہاری آنکھیں یہی کہہ رہی ہیں۔''

''ہاں صحیح کہہ رہی ہو، میں عدنان کی ساتھ آئی ہوں، تمہیں تو پتا ہے کتنا آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ ہمیشہ دیر کروا دیتا ہے مجھے۔''

''اور پھر بھی تم اس کے ساتھ آتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم آخر کیوں اس کے ساتھ آکر اپنا نقصان کرتی ہو؟ اتنا اچھا بھی نہیں ہے کہ تم اپنا وقت اور پڑھائی ضائع کرو۔ اب آج پھر پہلا لیکچر رہ گیا۔''

''تم جانتی ہو میں اس کے ساتھ آنا نہیں چھوڑوں گی۔ پھر اتنی باتیں سنانے کا فائدہ، تم لے لیتیں نہ کلاس۔ میرا انتظار نہ کرتیں۔''

''کیا بات ہے اساور! ایک تو تمہارا انتظار کیا اوپر سے تمہاری ہٹ دھرمی۔ میرا دل کرتا ہے جا کے تایا ابو کو بتا دوں کہ عدنان نے چکر چلا رکھا ہے۔ دیکھنا پھر کیسے سیدھا ہوتا ہے۔ کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھے گا وہ تمہیں۔''

''اور تم ایسا کس خوشی میں کرو گی۔ مجھے اس پر خود سے زیادہ یقین ہے۔ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔''

''چلو دیکھتے ہیں یہ تو وقت بتائے گا۔''

☆......☆

''میں تمہیں یہاں وہاں دیکھ رہی تھی ماریہ اور تم یہاں فون پہ لگی ہو۔ کس سے بات کر رہی ہو، جو اتنی دھمکیاں دے رہی ہو؟''

''کسی کو نہیں۔ یہ بتاؤ تم مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟''

''کچھ نہیں، یہ نوٹس دیے ہیں سر نے، تمہارے لیے، یہی دینے تھے۔''

''ہاں ٹھیک ہے لاؤ دو اور تم گئیں کیوں نہیں ابھی تک۔ پہلے تو اس وقت تک چلی جاتی تھیں۔''

''ہاں بس میں عدنان کا انتظار کر رہی تھی۔ لینے آئے گا مجھے۔''

''تم چلی جاؤ اساور، وہ نہیں آئے گا۔'' ماریہ نے ایک دم بیزاری سے کہا تھا۔

''لیکن کیوں ماریہ اور تمہیں کیسے پتا کہ وہ نہیں آئے گا؟''

''یار اساور، بڑی ہو جاؤ۔ میرا کزن ہے میں جانتی ہوں۔ وہ مصروف ہے آج گھر پہ کچھ کام تھا اسے۔ انتظار کرنا بے وقوفی ہے۔ بہتر ہے تم چلی جاؤ۔''

ماریہ کے کہنے پر اساور نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا جہاں اکیڈمی کا وقت ختم ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن عدنان نہیں آیا تھا۔ آخر تھک کر وہ گھر جانے لگی۔ دل ہی دل میں وہ عدنان سے ناراض ہو چکی تھی جو کہ نہ آیا تھا اور نہ اس کی کال پک کی تھی۔

''تم بتاؤ مجھے تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کیوں روکا تم نے مجھے اساور سے ملنے سے؟'' ماریہ ابھی آئی ہی تھی گھر جب عدنان اس کے کمرے میں چلا آیا تھا اور غصے سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''وجہ تم جانتے ہو۔'' وہ لاپروائی سے بولی تھی اور اپنا دوپٹا گلے سے ہٹا کر بیڈ پہ پھینکا تھا۔

عدنان نے غصے سے اس کی لاپروائی اور بے شرمی کو دیکھا تھا اور رخ موڑ لیا تھا۔

''تم نے آج مجھے دھمکی دے لی لیکن آئندہ اگر ایسا ہوا نہ تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا یاد رکھنا۔''

''اور کتنی دفعہ کہا ہے کہ یہ بے شرمی میرے سامنے مت کیا کرو۔ دوپٹہ اوڑھ کے رکھا کرو۔''

''اوہ کم آن عدنان، تم اس دو ٹکے کی ملانی کے لیے مجھ سے بحث کر رہے ہو۔ انتہائی دوغلی لڑکی ہے۔

ایک طرف شرعی پردہ دار بنی ہوئی ہے اور دوسری طرف بوائے فرینڈ بنا رکھا ہے۔"

"شٹ اپ ماریہ جسٹ شٹ اپ۔ تم سے وہ لاکھ درجے بہتر ہے، تمہارے جیسی بے شرم نہیں ہے وہ۔"

"اتنی ہی پردہ دار اور شرم کی پوٹلی ہے تو کیوں ملتی ہے وہ تم سے۔ کیوں تم سے رابطہ بنا رکھا ہے۔ پتا نہیں کیا کچھ کر چکی ہوگی۔ کس کس سے چکر چلا رکھے ہیں۔ اور میں بے شرم ہوں، اس لیے کہ تم سے محبت کرتی ہوں۔ بچپن کی منگیتر ہوں تمہاری۔ کل کو بھی تو میرا وجود تم نے ہی دیکھنا ہے تو پھر اب کیسا پردہ۔"

"لعنت بھیجتا ہوں میں تم پہ اور تمہارے منگیتر ہونے پہ۔ سوچنا بھی مت کہ تم سے شادی کروں گا۔ دور رہو مجھ سے بھی اور اسامر سے بھی۔ ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم میری کزن ہو۔" وہ غصے سے پلٹ کر اس تک آیا تھا اور اس کا بازو دبوچ کر اسے وارننگ دی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو عدنان؟ میں تمہاری منگیتر ہوں لیکن بیوی تو نہیں۔ پلیز چھوڑو مجھے، میری نہیں تو اس گھر کی ہی عزت کا خیال کرلو۔ پلیز چھوڑو مجھے۔" عدنان نے اس کا بازو ابھی دبوچا ہی ہوا تھا جب ایک دم سے ماریہ روتے ہوئے زور زور سے بولی تھی۔

"بکواس بند کرو اپنی۔" کہتے کے ساتھ ہی عدنان نے اسے بیڈ پر دھکا دیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟ تم عدنان.....! تم سے ایسی گھٹیا حرکت کی امید نہیں تھی، اپنے ہی گھر کی عزت لوٹنے چلے تھے۔"

عدنان ابھی پلٹا ہی تھا جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا تھا اور انہوں نے کہتے ساتھ ہی اسے تھپڑ مارا تھا۔

"ماریہ تیزی سے دوپٹہ لپیٹتی اٹھی تھی اور چچا کے گلے جا لگی تھی۔ ایک منٹ میں عدنان اس کی چالاکی سمجھ گیا تھا۔ لیکن اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

☆.....☆

"اسامر بیٹا کیا ہوا؟ تم اپنے کمرے میں کیوں چلی آئیں سیدھی؟ سلام بھی نہیں کیا مجھے۔"

اسامر گھر آکر بنا ماں کو سلام دعا کیے اپنے کمرے میں آبیٹھی تھی جب اس کی ماں نے آکر پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں اماں، میرے سر درد ہے۔ مجھے سونے دیں۔ کچھ دیر آرام کروں گی۔"

"پہلے بتاؤ کہ عدنان کہاں ہے؟ اور تم اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟"

"وہ نہیں آئے اماں۔ انہیں میری ناراضی اور میری حالت کی بھی پرواہ نہیں ہے۔"

"بدگمان نہیں ہوتے، اسے پرواہ نہیں ہوگی تو کسے ہوگی۔ آخر کو بیوی ہو تم اس کی اور اب اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی ہو۔"

"تو اماں وہ کیوں نہیں آئے، پتا ہے پہلے ہی ایک ہفتے بعد آج آئے تھے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ آپ نے ملنا ہے۔ آنا تو دور وہ تو میری کال بھی نہیں اٹھا رہے۔ انہیں میری بالکل پرواہ نہیں ہے۔"

"اسامر کیا ہو گیا تمہیں، کیوں اتنی بے اعتبار ہو رہی ہو۔ جانتی ہو نا جب ہمارا کوئی نہیں تھا۔ جب تم بیچ بازار میں ان لفنگے لڑکوں کے ہاتھوں بے پردہ ہونے جا رہی تھیں تب اس نے پروا کی تھی۔ تمہیں جانتا تک نہیں تھا۔ پھر بھی تمہیں بے پردہ نہیں ہونے دیا۔ اور تم داغ دار نہ ہو جاؤ تمہیں اپنا نام دیا۔ ایک جائز رشتہ بنایا۔ ہمارا سہارا بنا۔ اور تم کہہ رہی ہو کہ اسے پروا نہیں۔ بیٹا وقت سب کا بدلتا ہے، کام ہر کسی کو ہوتا ہے، وہ بھی کسی مجبوری میں الجھا ہوگا ورنہ وہ کیسے نہ آتا۔ اب دل سے بدگمانیاں نکالو اور چلو اٹھ کر کھانا کھاؤ۔ پھر نماز پڑھو اور اس کے لیے دعا کرو کہ اللہ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

☆.....☆

"ابا آپ سب غلط سمجھ رہے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ نے دیکھا۔ یہ بکواس کر رہی ہے۔ پھنسا رہی ہے مجھے اور آپ اس پہ یقین کر رہے ہیں۔"

"تم اپنی زبان بند رکھو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے میں نے تمہیں اس کے کمرے میں اور جس حالت میں دیکھا ہے یہ تم بھی جانتے ہو۔"

کہتے ہوئے انہوں نے پاس بیٹھی آنسو بہاتی ماریہ کو ساتھ لگایا تھا۔

"ابا میں ویسے ہی گیا تھا اس کے کمرے میں، اس نے آگے سے بکواس شروع کر دی اور دوپٹا بھی اس نے خود اتار کے پھینکا تھا۔ میں اسے سمجھا رہا تھا اور اس نے آپ کو دیکھ کے جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔"

عدنان نے اپنے باپ کے کندھے سے لگی ماریہ کو گھور کر دیکھا تھا۔

"بس بہت کر لی تم نے بکواس، میں نے نکاح خواں کو بلایا ہے۔ ابھی اسی وقت تمہارا نکاح ہوگا اس سے اور اگلے ہفتے شادی۔ تم نے کیا سمجھا تھا کہ بن ماں باپ کی بیٹی ہے تو جو چاہے کرو گے کوئی پوچھے گا نہیں۔

عدنان کی ماں، لے کے جاؤ ماریہ کو کمرے میں اور اس کا حلیہ ٹھیک کرو۔ مولوی آتا ہی ہوگا۔"

"نہیں ابا میں یہ نکاح ہرگز نہیں کروں گا کیونکہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔ یہ جانتی ہے سب۔ اسے معلوم ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ اسی لیے اس نے یہ ڈراما کیا ہے لیکن میں اس ڈرامے کا حصہ ہرگز نہیں بنوں گا۔ میں ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے چلے جاؤ لیکن اپنی ماں کو بھی ساتھ لے کے جاؤ۔ جس نے مجھے تم جیسی اولاد پیدا کر کے دی۔ اس سے تو بہتر تھا میری اولاد ہوتی ہی نا۔ طلاق دے رہا ہوں تمہاری ماں کو۔"

"کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟"

"بالکل کر سکتا ہوں۔ سوچ لو۔ ماریہ سے نکاح کرو گے یا اپنی ماں کو طلاق دلواؤ گے۔" انہوں نے بالکل بے رحم ہو کر فیصلہ سنایا تھا۔

عدنان نے اپنی ماں کو دیکھا جو آس سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"بیٹا ماں جاؤ، اس عمر میں مجھے طلاق کا داغ نہ لگواؤ۔"

اس نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا اور پھر واپس آکر بیٹھ گیا۔

"قبول ہے مجھے اس سے نکاح۔"

"صرف نکاح نہیں شادی۔ پہلے تو سوچا تھا ایک ہفتے بعد رخصتی کروں گا۔ لیکن اب ابھی یہ نکاح کے بعد تمہارے کمرے میں شفٹ ہو رہی ہے۔ اور یہ جو تم نے شوشا چھوڑا ہے نا کہ کسی کو پسند کرتے ہو تو بھول جاؤ اسے۔ کیونکہ اگر مجھے ایسا ویسا کچھ پتا چلا تو میں مہلت نہیں دوں گا۔ تمہاری ماں کو فارغ کر دوں گا۔ اور وجہ صرف تم ہو گے یاد رکھنا۔"

☆.....☆

"السلام علیکم آنٹی۔ میرا نام ماریہ ہے۔ اسامر کی دوست ہوں۔ کیا اسامر گھر پہ ہے؟" اس نے دروازے پہ کھڑے کھڑے پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں بیٹا آؤ اندر آؤ، اسامر اکثر تمہارا ذکر کرتی ہے۔ بیٹھو تم میں اسامر کو بلاتی ہوں۔" انہوں نے اسے برآمدے میں بچھے تخت پہ بیٹھنے کا کہا تھا اور خود اسامر کو بلانے چلی گئی تھیں۔

"السلام علیکم ماریہ کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں اور بہت خوش بھی لیکن تمہیں کیا ہوا ہے؟ اتنی زرد ہو رہی ہو۔"

"کچھ نہیں۔ تم سناؤ آج کیسے یاد آگئی میری؟ اور عدنان کیسا ہے؟ کس کے ساتھ آئی ہو؟"

"ہاں بس مصروف تھی اپنی شادی میں۔ عدنان بہت اچھے ہیں اور شادی کے بعد تو مزید خوبصورت

اور ہینڈسم ہوگئے ہیں اور ہاں میں ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا اور اسادر پہ تو گویا بجلی گرائی تھی۔

"اسادر بیٹا! یہ اسے پکڑو ذرا۔ روئے جارہی ہے۔ میں ذرا چائے بنالاؤں۔" رقیہ بیگم نے ایک گول مٹول سی بچی اسادر کو تھمائی تھی جو ماں کا لمس ملتے ہی چپ ہوگئی تھی۔

ماریہ نے حیرانی سے بچی کو دیکھا تھا جسے اب اسادر اپنا دودھ پلا رہی تھی اور اس کے آنسو بچی کے چہرے پہ گر رہے تھے۔

"یہ بچی تمہاری ہے؟ تمہاری تو ابھی شادی نہیں ہوئی نا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ....."

"بلکہ ایک منٹ اس کا مطلب تم جب اکیڈمی آتی تھیں تو تم پریگننٹ تھی۔

اوہ میرے اللہ کوئی اتنا دھوکے باز کیسے ہوسکتا ہے۔ یعنی تم نے تو حد کردی اسادر۔ میں سمجھتی رہی کہ تم پردہ کرتی ہو اس لیے برقع پہنتی ہو لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ اپنے اس گناہ کو چھپانے کے لیے تم اتنا کھلا برقع پہنتی تھی۔

اور عدنان سے بھی چکر چلا رکھا تھا یعنی تم یہ گناہ، اپنی یہ ناجائز اولاد عدنان کے پلے ڈالنا چاہتی تھیں۔

"نہیں ہے یہ ناجائز، جائز اولاد ہے یہ میری۔"

"اچھا جائز اولاد ہے تو بتاؤ کون باپ ہے اس کا۔ عدنان کے ساتھ تو صرف تمہارا چکر تھا، بتا دیا تھا اس نے مجھے کہ یہ صرف وقت گزار رہا تھا تمہارے ساتھ یہ قسم کھائی تھی اس نے کہ اس کا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ بھی تو پلٹ کے کہیں آیا وہ تم تک۔ شکر ہے وہ تو مجھ سے محبت کرتا تھا۔ ہماری شادی وقت پہ ہوگئی ورنہ تم تو عدنان کو پھنسا لیتیں۔ اللہ اللہ۔ لعنت بھیجتی ہوں میں تم جیسی پہ۔ جارہی ہوں اور بھی اب مجھ سے یا عدنان سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"کوئی چکر نہیں تھا میرا، نکاح کیا تھا عدنان نے مجھ سے، بیٹی ہے یہ عدنان کی۔ جائز اولاد ہے ہماری۔ سمجھیں تم۔"

"اچھا جھوٹ ہے اسادر لیکن نہ میں بے وقوف بنوں گی اور نہ عدنان کو بننے دوں گی۔ اگر تم سے نکاح کیا ہوتا تو مجھ سے شادی کیوں کرتا۔ میرے ساتھ خوش کیوں ہوتا؟ تم سے کیوں نہ رابطہ رکھتا؟"

"تم ایک بدکردار لڑکی ہو اسادر، پتا نہیں کہاں کہاں منہ مارا ہوگا اور اب اپنا یہ گناہ میرے شوہر پر ڈالنا چاہتی ہو لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔" کہتے ساتھ ہی ماریہ نے اسے دیکھ کے تھوکا تھا اور چلی گئی تھی۔

رقیہ بیگم تو ماریہ کی زہر خند باتیں سن کر ہی گر پڑی تھیں۔ ساری زندگی بیوہ ہونے کے بعد بیٹی کو پردے میں چھپائے رکھا، آج کیسے ایک پل میں وہ بدکرداری کا داغ لگوا بیٹھی تھی۔

اسادر تیزی سے بچی کو لیے ماں تک آئی تھی۔ ماں کو آوازیں دی تھیں لیکن بے سود۔ اس کی ماں اس پہ لگے الزام سہہ نہیں پائی تھی اور دل کا درد انہیں موت کے منہ میں لے گیا تھا۔

☆.....☆

پانچ سال بعد۔

"کہاں جارہے ہو تم ہادی کو لے کر۔" عدنان اپنے چار سالہ بیٹے کا ہاتھ تھامے ابھی گاڑی تک آیا ہی تھا جب ماریہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"تم سے مطلب؟ کتنی دفعہ کہا ہے اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ میں کیا کرتا ہوں کہاں جاتا ہوں اس سے تمہارا کوئی لینا دینا نہیں۔ سمجھیں تم۔"

"تم ایسا کیسے کرسکتے ہو عدنان۔ ابھی کل آئے ہو اور آج پھر جارہے ہو اور ہادی کو بھی ساتھ لے جا رہے ہو۔ میں اکیلی کیا کروں گی۔ اتنے بڑے گھر میں پاگل ہو جاتی ہوں میں۔"

"تو میں کیا کروں، یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ تمہیں ہی شوق تھا میری بیوی بننے کا۔ اب رہو اس گھر میں۔"

"تم کیوں کر رہے ہو عدنان۔ بس کردو، میرا بچہ بھی تم نے میرا نہیں رہنے دیا۔ آخر کہاں چلے جاتے ہو۔ میرے بچے کو لے کے۔ پلیز مجھ پہ رحم کھاؤ۔" اس نے عدنان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا۔

لیکن عدنان نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے تھے اور ہادی کو گاڑی میں بٹھایا اور نکلتا چلا گیا تھا۔

☆.....☆

عدنان ایسا کیسے کرسکتا ہے میرے ساتھ۔ پتا نہیں کہاں غائب رہتا ہے۔ ہادی بھی تو کچھ نہیں بتاتا۔ بس بہت ہوگیا اب میں اس کی کسی دھمکی سے نہیں ڈروں گی، آج میں آفس جا کر ہی رہوں گی۔ دیتا ہے طلاق تو دے دے۔ لیکن آفس میں اس کی بیوی بن کر ہی تعارف کرواؤں گی۔

اس نے چادر اوڑھی اور پھر بیگ اٹھایا ہی تھا جب اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ ادھ موئی ہوگئی تھی، اس نے انہیلر سے اپنی سانس کو قابو میں کیا تھا اور پھر اپنے وجود کو آہستہ سے گھسیٹتی باہر نکلی تھی۔

"بات سنیے؟ عدنان کا آفس کس طرف ہے؟" اس نے آفس پہنچ کر ریسپشن پر کھڑی لڑکی سے پوچھا۔ جس نے حیرانی سے اس عجیب و غریب حلیے کی عورت کو دیکھا جو بے تکلفی سے اس کے باس کے آفس کا پوچھ رہی تھی۔

"جی میم آپ کون اور آپ کو کس سلسلے میں ملنا ہے سر سے؟ کیا آپ نے اپائنٹمنٹ لیا ہوا ہے؟" ریسپشنسٹ نے اپنے لہجے کو خوشگوار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میرا نام ماریہ ہے۔ مسز ماریہ عدنان۔ آپ عدنان کو بتائیں کہ آپ کی مسز آئی ہیں۔"

"کیا میڈم نیا طریقہ ڈھونڈا بھیک مانگنے کا؟ اپنا حلیہ دیکھا ہے آپ نے؟ آپ اور سر کی مسز.....! اچھا لطیفہ ہے۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنی مسز کے ساتھ گھر کے لیے نکلے ہیں۔ آج سر کی بیٹی کی سالگرہ ہے تو آج وہ گھر پہ اپنی فیملی کے ساتھ کریں گے۔"

"کیا بیٹی.....! گھر.....؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا آپ مجھے ایڈریس دے سکتی ہیں۔ عدنان کے گھر کا۔"

"شیور میم۔ یہ لیجیے۔" کہتے ساتھ ہی ریسپشنسٹ نے اسے کاغذ پہ لکھ کے ایڈریس دیا تھا جو کہ شہر کی سب سے مہنگی کالونی کا تھا۔

اس نے ایک گلاس پانی پیا تھا سائیڈ پر رکھے کولر سے لے کر اور باہر نکل کر رکشے والے کو پرچی تھمائی۔

وہ گیٹ پہ آئی تھی کہ چوکیدار نے بنا کچھ پوچھے دروازہ کھول دیا تھا جیسے اسے پہلے سے ہدایت دی گئی ہو۔ اس نے گیٹ سے داخل ہوتے ہی گھر کو دیکھا تھا جو کہ ایک انتہائی خوبصورت بنگلہ تھا۔ اس کی صورت ہی اس کی قیمت کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ کروڑوں کا بنگلہ تھا۔

وہ روش پر چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ہال میں رکھے صوفے پہ ایک پانچ سال کی بچی بیٹھی تھی جو کہ انتہائی خوب صورت تھی۔ وہ اپنے پاس بیٹھے ہادی کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور ایک دوسالہ بچہ اچھل اچھل کر ہادی کے ہاتھ میں پکڑی آئسکریم چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آؤ دعا بیٹا۔ آپ کا ٹیبل ریڈی ہے۔" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا جب کسی نے ہال کے دائیں جانب بنے اوپن ائر کچن میں رکھے ڈائننگ ٹیبل سے بچی کو آواز دی تھی۔

جس پہ بچی اپنی فراک سنبھالتی اٹھی۔ تبھی ہادی نے آواز دی تھی۔

''ماما! آپی کا فراک بہت ہیوی ہے۔ بابا سے کہیں نا آپی کو لینے آئیں، میری ہیلپ کریں۔''

''تو بابا کی جان، اپنی آپی کو نہیں سنبھال پائے آپ۔ اوہو سو بیڈ ہادی بیٹا۔''

تبھی عدنان کی بھی آواز آئی تھی۔ ماریہ نے آوازوں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ کھانے کی میز کو سجائے عدنان اور اساور ایک ساتھ کھڑے تھے اور ہادی کو دیکھ رہے تھے جو دعا کا پھیلا ہوا فراک سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ چھوٹا بچہ اسے کامیاب نہیں ہونے دے رہا تھا۔

''عدی جائیں نہ دعا کو لائیں ورنہ سنان نے دعا اور ہادی دونوں کو گرا دینا ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ تینوں بچے گرتے اساور نے عدنان کو بچوں کی طرف دھکیلا تھا۔

عدنان نے دعا کو ابھی تھاما ہی تھا جب اس کی نظر ماریہ پہ پڑی تھی جو بے یقینی سے یہ سب دیکھ رہی تھی اور پھر ایک دم پلٹی تھی اور باہر نکل گئی تھی۔

عدنان نے اسے جاتا دیکھ کر سر جھٹکا اور پھر تینوں بچوں کو سنبھالتا ٹیبل پر لایا تھا۔

☆.....☆

''کیا ہوا؟ بہت صدمہ ہوا تمہیں؟ یہ تو ہونا ہی تھا۔'' ماریہ ریوالونگ چیئر پہ بیٹھی جھول رہی تھی جب عدنان کمرے میں آیا تھا اور اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

ماریہ نے اس کے سوالوں پر خود کو روک کر اسے دیکھا تھا۔

''تم یقیناً یہ تو پوچھو گی نہیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ چلو میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔''

''تمہیں تو پتا ہی ہے کہ میں اساور سے ملتا تھا لیکن تم یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ میری بیوی تھی۔ میں نے پہلی ملاقات پہ ہی اس سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے جو میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔

تم نے مجھے پھنسا کے شادی تو کر لی لیکن اپنی حرکتوں سے خود ہی ثابت کر دیا کہ میں بے قصور تھا، جانتی ہوں مرنے سے پہلے ابا نے مجھ سے کہا تھا کہ تم جو چاہے کرو، چاہو تو ماریہ کو چھوڑ دو۔''

اماں ابا جانتے تھے کہ اساور میری بیوی ہے۔ جس دن تم اساور سے ملنے گئیں تھی نا اور میری بیٹی کو ناجائز بول کر آئی تھیں۔'' ساتھ ہی عدنان نے اسے تھپڑ کھینچ مارا تھا۔

''یہ میری بیٹی کو ناجائز کہنے کے لیے۔ ہاں جب تم اپنا زہر اگل کے آئیں تھی نا تو ڈرائیور نے واپس آ کر سب بتا دیا تھا ابا کو اور اسی وقت ابا میرے ساتھ گئے تھے اور آنٹی کی تدفین کے بعد اساور کو لے آئے تھے۔

یہ تو اساور کا دل تھا کہ وہ مجھے تم سے بانٹ رہی تھی۔ اس نے مجھے روک رکھا تھا تمہیں چھوڑنے سے۔ تمہارے بیٹے کو بھی میں نے اس کا بیٹا بنا دیا۔

دیکھو کیا آیا تمہارے ہاتھ۔ کہا تھا نا میں نے کہ میرے اور اساور کے بیچ نہ آنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ تم نے اسے بدکردار کہا تھا نا دیکھ لو زمانہ گواہی دیتا ہے اس کی پاکبازی کی۔ اور آخری بات..... تمہیں آفس آنے سے منع کیا تھا لیکن تم نے شرط کو توڑ دیا۔ لہٰذا اب میں تمہیں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں۔ یہ ہے تمہاری مات ماریہ۔

یہ گھر تمہارا ہے تمہارا رہے گا۔ جیو یا مرو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ چاہو تو مراد سے شادی کر لینا جس کے سات چھ سال تم نے چکر چلائے رکھا۔ وہ اب بھی تمہارے انتظار میں ہے۔ چلتا ہوں، کبھی پلٹ کے نہیں آؤں گا نہ میں، نہ میرا بیٹا۔ اللہ حافظ!

عدنان کے جاتے ہی اس کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔ آخر کہاں آسان ہوتا ہے ضمیر کا بوجھ برداشت کرنا۔ جب ضمیر جاگتا ہے تو سب ختم ہو جاتا ہے وہ بھی خالی دامن رہ گئی تھی۔

.....☆.....

ایقان علی

میرے مسیحا

زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

چوہدری جہاں داد باہر جا رہے تھے جب پیچھے سے ان کی بیوی نے پکارا تھا۔ ''چوہدری صاحب! ایک منٹ ذرا رکیے مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''میں بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام میں بات ہوتی ہے۔''

''ارے بھاڑ میں گیا یہ ضروری کام!'' وہ ان کو بازو سے پکڑ کر صوفے تک لے آئیں۔ خود بھی ان کے پاس آ بیٹھیں۔

''کل فریقی آئی تھی۔ وہ جو چک 76 کے نمبردار ہیں ناں ان کی بیوی۔''

''76 کے نمبردار؟ اچھا اچھا چودھری صفدر۔''

''ہاں وہی، کافی دیر بیٹھی رہی۔ اشاروں اشاروں میں وہ مجھ سے فاطمہ کا پوچھ کر گئی ہے۔''

چوہدری جہاں داد نے حیرت سے بیوی کی طرف دیکھا۔ ''فاطمہ کا؟ کیا مطلب؟''

''ان کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کے لیے رشتہ ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ مجھ سے پوچھ رہی تھیں فاطمہ کا کہیں کیا کہ نہیں۔''

''اس نے دیکھا ہے فاطمہ کو؟ میرا مطلب ہے اس کی بیماری؟''

قسط نمبر 12

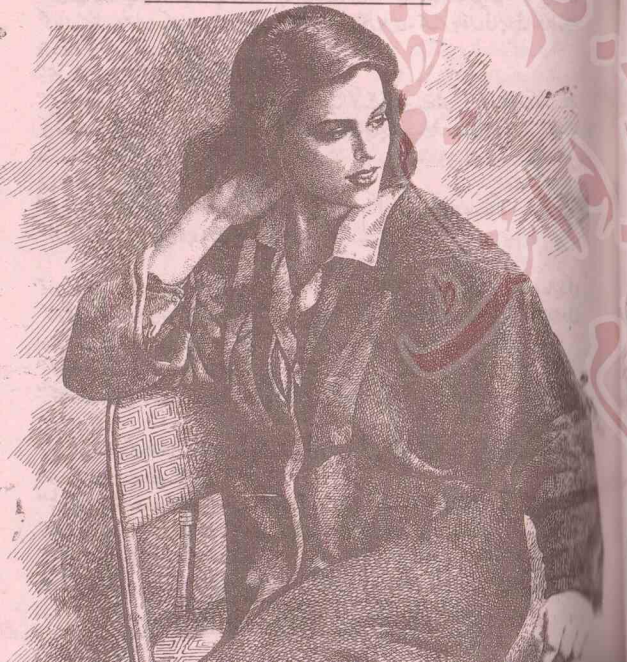

"ہاں ہاں سب پتا ہے، جاتے جاتے صدقے واری ہو رہی تھی فاطمہ پر۔"
چوہدری صاحب سوچ میں ڈوب گئے تھے۔
"سوچ لیں چوہدری صاحب! اتنا اچھا رشتہ آئے گا کبھی بھلا؟"
وہ خاموش رہے۔
"میں نے بھی رقیہ کو ابھی تو ٹال دیا، سوچا پہلے آپ سے بات کروں گی۔" چوہدری جہاں داد کو مسلسل خاموش دیکھ کر وہ چڑ گئیں۔
"کچھ تو بولیں چوہدری صاحب! آپ تو ایسے چپ کر گئے ہیں جیسے میں نے آپ سے گردہ مانگ لیا ہو۔"
"اوہ نیک بخت! تو جانتی ہے نا فاطمہ کو ذہنی حالت بھی پوری سبوری ہے۔ ٹھیک سے بول نہیں سکتی، کسی کی بات سمجھ نہیں سکتی، ایسے میں وہ کیوں مانگ رہے ہیں رشتہ؟"
"اس لیے کہ وہ آپ کی دھی ہے۔ آپ ان کے ہم پلہ ہیں۔ چودھری صاحب! ایک بات سن لیں۔ اگر آپ ابھی بھی اس مسٹنڈے نعمان کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو یہ خیال نکال دیں۔ میں مرجاؤں گی پر اپنی دھی اپنے پتر کے قاتل ——— سے نہیں بیاہوں گی۔"
"ہم نے پہلے بات کی تھی فاطمہ کی ماں بھول گئی؟"
"پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے یہ رشتہ نہیں آیا تھا چوہدری صاحب! کوئلے اور ہیرے میں سے آپ کیوں کوئلہ لینے کی ضد کر رہے ہیں۔ اپنے ہاتھ ہی کالے ہوں گے، لعنت بھیجیں نعمان پر۔ آپ ٹھنڈے دل سے اس رشتے کے بارے میں سوچیں۔"
چوہدری جہاں داد اٹھ کھڑے ہوئے۔
"میں سوچ رہی ہوں چوہدری صاحب! ان کی دعوت کر لیتے ہیں ہم۔ کھل کر بات بھی ہو جائے گی۔"
"چل ٹھیک ہے۔ میں کروں گا چوہدری صفدر کو فون، اس اتوار کو رکھ لیتے ہیں دعوت۔"

☆......☆

تیمور نے پیچھے سے اس کی چٹیا کو جکڑا اور زور سے جھٹکا دے کر اسے کھڑا کر دیا۔ تکلیف کی شدت سے عالیہ کی کراہ نکلی۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی لیکن بنا دی گئی تھی۔ عالیہ کا میکے جانے کا پلان تھا۔ سارے کام نمٹا کر وہ تیار ہوئی اور اجازت لینے پھپھو (ساس) کے پاس آئی تو انہوں نے منع کر دیا۔
"کوئی ضرورت نہیں ہے روز روز منہ اٹھا کر باپ کے گھر جانے کی، چپ کر کے بیٹھ جا، کہیں نہیں جا رہی تو۔"
"پھپھو مجھے دو مہینے ہو گئے ابو سے ملے۔ پلیز جانے دیں، پچھلی بار بھی مجھے آپ کی وجہ سے رکنا پڑا تھا۔" ان کو جیسے کرنٹ لگا۔
"لو جی! یہ احسان بھی دھر دیا تو نے، ارے تو بی بی چلی جاتی۔ میں مرتی یا جیتی تیری بلا سے، تو کیا یہاں رکی تو ملک الموت تیرے ڈر سے مجھے لینے نہ آیا۔"
"پلیز! اا پ ایشو مت بنائیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ کیوں ہر بات کا غلط مطلب نکالتی ہیں۔"
"بھونک رہی ہے میرے آگے، حرافہ۔" انہوں نے جھک کر جوتی اٹھائی اور اسے دے ماری۔
"کتیا دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔"
غصے کی ایک شدید لہر عالیہ کے وجود میں سرایت کر گئی۔ وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی، دیکھ نہ سکی کہ

تیمور کھڑا سب سن رہا تھا اور دیکھ چکا تھا۔ ماں نے رو رو کر سارا محلہ سر پر اٹھا لیا۔ وہ فرماں بردار بیٹا اندر سے بیوی کو بالوں سے گھسیٹ کر باہر لایا۔
"باپ کے گھر جانا ہے؟ جا دفع ہو جا۔ آئندہ کبھی اپنی شکل مت دکھائیو، دفع ہو جا۔" اسے گھسیٹ کر وہ بیرونی دروازے تک لے آیا اور اسے باہر دھکا دے دیا۔

☆......☆

نارنجی شام اب سیاہ پڑنے لگی تھی۔
ابو کو الوداع کہہ کر جب وہ ہوسٹل لوٹا تو مغرب قضا ہو چکی تھی۔ ہر کمرے کی کھڑکی روشن تھی۔ وہ اپنے روم میں آیا تو وہاں ایک اور لڑکا موجود تھا۔ عثمان اندر آیا اور اپنے بیگ ایک طرف رکھے۔
"اوہ ہیلو! کون ہے تو؟"
عثمان گڑبڑا گیا۔ "عثمان۔"
"جونیئر ہے؟"
عثمان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
وہ لڑکا اٹھا اور اس کی طرف آیا۔ نزدیک آ کر مضبوطی سے اس کی گردن دبوچ لی۔ "تجھے تمیز نہیں سکھائی تیرے ماں باپ نے؟ بڑوں کو سلام نہیں کرنا آتا تجھے؟"
عثمان نے خود کو اس کے چنگل سے نکالنا چاہا لیکن اس کی پکڑ زیادہ مضبوط تھی۔
"اوہ ہیلو! یہاں رہنا ہے تو اوقات میں بھی رہنا سیکھ، یہ ایٹی ٹیوڈ، یہ آنکھیں، یہ غصہ کسی اور کو دکھانا سمجھا؟" عثمان نے سر جھکا دیا۔
"اس سے پہلے کہ تجھے میں توڑ دوں، خود ہی ٹوٹ جا۔" ایک جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑ کر وہ واپس اپنی چارپائی پر جا بیٹھا۔
"چل انٹرو دے اپنا۔" عثمان نے گردن کو مسلا تھا۔
"میرا نام عثمان انصاری ہے۔ میں......"
"اوہ! یہ بکواس لگا رکھی ہے۔ میڈیکل اسٹوڈنٹ ہے تو اپنا اناٹومیکل پوزیشن میں کھڑے ہو کر دے۔"
"وہ کیا ہوتا ہے بھائی۔" اس لڑکے نے اپنا سر پکڑ لیا۔
"تیرا (گالی) ہوتا ہے وہ۔"
اتنی گندی گالی عثمان انصاری نے اپنی ساری زندگی میں نہیں سنی تھی۔ ہتک کے احساس سے وہ لال پڑتا چلا گیا۔
"ایکسکیوزمی۔"
اس کی دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ وہ سینئر لڑکا بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆

"آ گئی ستارہ۔"
اس نے ابھی کمرے میں قدم ہی رکھا تھا کہ امی نے سوال کر ڈالا۔ وہ زارا آنٹی سے سر میں تیل لگوا رہی تھیں۔
"نہیں، ابھی نہیں آئی۔ میڈیکل کالج کی بس کے نیچے آ کر قضائے الٰہی سے فوت ہو گئی ہے۔"
اس نے پہلے اپنا بیگ بیڈ پر دے مارا اور پھر خود بھی آ گری۔ امی جی بھر کر بدمزہ ہوئیں۔

"تیرے منہ سے کبھی خیر کا کلمہ نہیں نکلے گا۔ منحوس ستارہ اگر مر کھپ گئی ہے تو تو کون ہے؟ آتما ہے اس کی؟"
ستارہ نے سر اٹھایا۔ بال دونوں طرف سے پکڑ کر آگے کیے اور زور سے دہاڑی۔ "ہاہاہا...... ہاں میں بھوتنی ہوں۔ آپ سب سے بدلہ لینے آئی ہوں۔ نہ آپ اس بے چاری کو زبردستی میڈیکل کرنے کے لیے کہتے نہ وہ خودکشی کرتی۔"
"ڈرامے بند کر۔" زارا آنٹی نے ٹوکا۔ وہ بستر سے اتری اور ان کے پاس آ بیٹھی۔
"ہائے آنٹی اتنی دعائیں کی تھیں میں نے کہ ٹیسٹ کلیئر نہ ہو، پھر یہ کہ میرٹ ہی نہ بنے۔ ایف ایس سی میں سپلی آجائے۔ ہائے میں نے کیا کیا جتن نہ کیے۔"
"ستارہ! یہ ناشکری ہے بیٹا۔" امی نے رسان سے سمجھانا چاہا لیکن سامنے بھلا کون تھی۔ ان کی سب سے چھوٹی ڈھیٹ بلکہ مہا ڈھیٹ اولاد۔
"میں نے نہیں کرنی میڈیکل، اتنی منتیں کیں ابا کی کہ مجھے بی اے میں داخلے لینے دیں، پر نہیں۔ ارے میں نے کون سا ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ اینڈ پر تو شادی کر کے گھر ہی بیٹھنا ہے ناں۔"
"انٹر میں ٹاپ کرنے کے بعد بی اے کرتے تجھے شرم نہ آتی؟"
امی کی بات پر شاید اسے واقعی شرم آ گئی تھی تو زارا آنٹی کے گلے لگ کر بین ڈالنے لگی۔
"اے کمینی! سچ سچ بتا فیس جمع کروا کر آئی بھی ہے کہ نہیں۔ کتنا کہا تجھے کہ کسی کو ساتھ لے جا۔ اے نکل پھپھو کی جھولی سے اور مجھے فیس کی رسید دکھا۔" امی نے اسے کھینچ کر زارا سے علیحدہ کیا۔
"نہیں کرائی جمع فیس، سارے پیسوں سے گول گپے کھا لیے۔"
زارا آنٹی نے قہقہہ لگایا۔ "ویسے بھابی کتنے گول گپے آئے ہوں گے چالیس ہزار کے!!"

☆......☆

اس لڑکی نے سرتاپا عائشہ کا جائزہ لیا اور نخوت سے پوچھا۔ "لاہور سے ہو؟"
عائشہ کا سر نفی میں ہل گیا۔ پوچھنے والی کی آنکھوں میں اچنبھا اترا۔ "پھر؟"
وہ اپنے چک کا بتانے لگی۔ اب کہ پوچھنے والی نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔
"واہ واہ! اب تو پینڈوؤں کے بھی انداز بدل گئے ہیں۔" پھر وہ بشریٰ کی طرف مڑی۔
"تم بھی یقیناً پینڈو ہو۔ اف اللہ! کیسا کچرا بھرتی ہوا ہے اس سال۔ خدا بھی کیسے کیسے نمونوں کا میرٹ بنوا دیتا ہے۔ نہ شکل نہ صورت نہ کلاس نہ رکھ رکھاؤ۔"
بشریٰ کا سر جھک گیا۔ یوں جیسے کہ اس کی غلطی ہو کہ وہ کیوں چن لی گئی۔
"دفع ہو جاؤ۔" وہ لڑکی دہاڑی اور وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔

☆......☆

"ابو مجھے کہتے تھے کبھی مایوس مت ہونا۔ خدا مایوسی کو گناہ سمجھتا ہے۔ وہ کہتے تھے مایوسی بھی ایک طرح سے شرک ہے۔ جو مایوس ہوا سمجھو وہ مشرک ہے۔" وہ ذرا رکا۔ "ماسٹر صاحب! اب جو کچھ میرے ساتھ ہو چکا، اس کے بعد بھی میں مایوس نہ ہوں۔" "میں نے اس سے مدد مانگی اور بار بار مانگی۔ اس نے جواب تک نہیں دیا۔ میں اب بھی ناامید نہ ہوں، میں مانگتا ہوں اور وہ عطا نہیں کرتا، پھر کہہ دیتا ہے میں مشرک ہوں۔"
ماسٹر صاحب ہولے سے مسکرائے اور نعمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ایک تمہاری چاہت ہے اور ایک اس کی چاہت ہے۔

"مجھے کیا پتا وہ کیا چاہتا ہے۔"
انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "تمہیں نہیں پتا، لا الٰہ الا اللہ پڑھنے والے کو نہیں پتا، اس کی کیا چاہت ہے؟"
نعمان ایک ثانیے کے لیے خاموش رہ گیا۔
"باقی سب چھوڑو! ابھی کے لیے تو اس کی یہ چاہت ہے کہ اس کا بندہ اس سے مایوس نہ ہو۔ وہ چاہتا کہ آزمائش کتنی بھی سخت کیوں نہ ہو، اس کا بندہ مشرک نہ بنے۔ جھولی ہر بار مانگنے پر بھی خالی رہے پر وہ مانگتا رہے۔"
ماسٹر صاحب آگے ہوئے اور اس جھکا سر اٹھایا۔ "میرے بیٹے! وہ جھولیاں خالی نہیں رہنے دیتا۔"
نعمان انصاری نے گالوں پر بہتے آنسو صاف کیے۔ "اب میں کیا کروں آگے۔"
"امتحان دو ایک بار پھر۔ مسیحا بننا ہے تو یہ تو کرنا ہی ہوگا۔"
"مجھ سے یہ نہیں ہو پائے گا ماسٹر صاحب۔"
وہ زور سے ہنسے۔ "تم سے ہی تو ہوگا میرے بچے! صرف تم سے۔ جس چیز کو جتنا چاہو گے وہ اتنا تمہارے پاس آتی جائے گی۔ مسیحائی تو تم سے چند قدم کے فاصلے پر آ گئی ہے۔ آگے بڑھو اور لے لو۔"
کالج سے واپس آتے وہ سارے راستے بس یہی سوچتا رہا تھا۔
"میں ایک بار پھر سے کوشش کروں گا۔ ایک آخری بار اپنے لیے، ابو کے لیے مجھے یہ کرنا ہی ہوگا۔"

☆......☆

ہوسٹل کے کوریڈور میں عثمان انصاری مرغا بنا ہوا تھا۔ وہ سینئر لڑکا اس کے پاس کھڑا ایک اور نئے آنے والے جونیئر کو ربڑ کا سلیپر تھما چکا تھا۔
"پوری جان لگا کر پورے سو جوتے مارنے ہیں۔ دیکھ لے اگر جوتے کی آواز سارے ہوسٹل میں نہ گونجی تو پھر تیری آواز سارے ڈی جی خان میں سنائی دے گی۔"
تذلیل کے احساس سے عثمان کا پسینہ بہہ نکلا تھا۔ وہ دوسرا لڑکا جوتا لیے شش و پنج میں تھا۔
"چل شروع ہو جا۔"
ربڑ کا جوتا عثمان کی کمر میں لگا۔ ایک ٹھاہ کی آواز آئی اور پھر دوسری ٹھاہ۔
"اوہ...... (گالی) ٹھہر جا تو۔"
سینئر لڑکے نے اپنا دوسرا جوتا اتارا اور اس فریشر کے دے مارا۔ ایک...... دو...... چار...... دس......"
"چل اٹھ۔ اب دوبارہ مار۔ اب کی بار جو مجھے آواز نہ آئی تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔" دس منٹ بعد عثمان انصاری سیدھا کھڑا ہوا تو اس کی کمر میں بھیانک طریقے سے درد تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ سینئر ہنستے ہوئے اس کے سامنے آیا۔
"آئندہ میرے یا کسی بھی سینئر بھائی کے آگے تو نے چوں بھی کی تو سوچ لینا تیرے ساتھ کیا ہوگا۔"
عثمان نے گردن جھکا لی تھی۔
"اس کالج کے سب سے جونیئر ہو تم لوگ۔ چل بتا مجھے جو گھر میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے اس کی کوئی عزت ہوتی ہے۔ نہیں ناں۔ تو بس یہی بات ہے، آئندہ جو مجھے آنکھیں دکھائیں تو میں تیری آنکھیں نکال لوں گا۔"

☆......☆

علینہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور نیلو نیل چہرہ۔ اوپری ہونٹ سے بہتا خون اور بکھرے بال۔ شمائلہ بھابی پانی کا گلاس لیے عالیہ کو ساتھ لگائے بیٹھی تھیں۔ آصف بھائی بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔
تیمور بھائی ایسے لگتے تو نہیں ہیں۔ اللہ! کیسا ظلم کیا ہے۔" علینہ ابھی بھی بے یقین تھی۔"کوئی اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔"
"تیمور سے مجھے اس رویے کی امید نہیں تھی۔" آصف بھائی بولے تھے۔ ابو ابھی بھی خاموش تھے۔
"شمائلہ اسے اندر کمرے میں لے جاؤ اور کھانے کا انتظام کرو۔"
علینہ باپ کے پاس آ بیٹھی۔ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
آپ کچھ نہیں کہیں گے۔"
"کیا کہوں؟"
"کوئی دلاسا، کوئی مرہم جیسی بات۔"
وہ چپ رہے۔
"بیٹیوں کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے بیٹی! انہوں نے منع کر دیا تھا تو یہ مان لیتی۔"
علینہ نے بے یقینی سے باپ کو دیکھا۔
"کل کو میں مار کھا کر آؤں گی آپ تب بھی یہی کہیں گے؟"
"بکواس کر جا اندر۔" وہ زور سے دہاڑے۔

☆......☆

"السلام علیکم! میں ماہ جبین ہوں۔"
ایمن نے سلام کا جواب دیا اور اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔
"تم فریشر ہو؟"
"جی آپی۔"
وہ مسکرا دی۔
"میں فورتھ ایئر سے ہوں۔ سیٹنگ کر لی تم نے۔"
"جی میں بس کر رہی تھی۔"
"چلو میں ہیلپ کروا دیتی ہوں۔"
ایمن کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ آج کے دن اس کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ وہ لڑکی بھی شاید اس کے تاثرات سے اس کے دل کی بات جان گئی تبھی ہولے سے ہنسی۔ "میرے جیسے کسی اور ہی زمانے کی مخلوق لگتے ہیں ناں۔"
"آپ بہت اچھی ہیں۔"
وہ پھر سے ہنسی۔ "کسی کے بارے میں اتنی جلدی رائے قائم نہیں کرتے اچھی لڑکی۔ کیا پتا میں یہاں سب سے بری ہوں۔"
وہ اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے اس کے لیے جگہ بنا رہی تھی۔
"آپ بری ہوتیں تو میرے ساتھ کچھ برا کرتیں اندر داخل ہو کر مجھ پر سلامتی نہ بھیجتیں۔"
ایمن اب اپنے کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھ رہی تھی۔
"آپ کے ساتھ بھی فولنگ ہوئی ہوگی۔"

"ہاں بہت زیادہ۔"
"پھر! آپ نے سینئر ہو کر بدلے نہیں لیے۔"
وہ مسکرائی۔
"اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہ پسند کرو جو تم اپنے لیے کرتے ہو۔"
"یہاں سب آپ کی طرح نہیں سوچتے۔"
"بالکل! یہاں میرے جیسے گنتی کے آٹھ دس ہوں گے بس باقی سب تو تم جیسوں کے ہوش اڑانے میں مصروف ہوں گے۔"
"ہوش تو میرے آپ بھی اڑا رہی ہیں۔"
ایمن ہنسی۔ "ایک ٹپ دیتی ہوں گرہ سے باندھ لو۔ یہاں رہنا آسان ہو جائے گا۔ کوئی کچھ کہے، کوئی کچھ بھی کرے، خاموشی سے برداشت کر لو۔ تماشا لگے گا تو بات بہت دور تک جائے گی۔ اپنے دشمن مت بنانا۔ پچھتاؤ گی۔"
ایمن نے مہ جبین کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔

☆......☆

آج چودھری جہاں داد کے ہاں دعوت تھی۔ نعمان کو نوکروں سے پتا چلا تھا۔ چک نمبر 76 کے چودھری منصور کے بیٹے سے فاطمہ کی بات طے ہو گئی تھی۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔
"فاطمہ......! لیکن وہ تو ابھی بچی ہے۔ اس کا تو اپنا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔"
بوڑھے نوکر نے لمبی سانس بھری۔ "ادھر ایسے ہی ہوتا ہے جی۔ ادھر شہروں کی طرح لڑکیوں کو گھروں میں بٹھا کر بوڑھا نہیں کیا جاتا۔ لڑکیاں تو جی ویسے بھی پرایا دھن ہوتی ہیں۔ جتنی جلدی انہیں وداع کر دیا جائے اتنا اچھا ہوتا ہے۔"
نعمان نے حیرت سے اس فلسفی کو دیکھا۔
شام کو وہ اپنے میڈیکل ری پیٹ کے بارے میں بات کرنے کے لیے چودھری جہاں داد کے پاس کھڑا تھا۔
"تیرے دماغ سے یہ فتور نکلا نہیں ابھی۔"
اس نے سر جھکا لیا۔
"اتنا تو لائق فائق ہوتا تو پہلی بار میں میرٹ نہ بن جاتا تیرا۔ ہمارے پنڈ کے ہی دین محمد کی... دھی۔ پہلی بار میں ایڈمیشن ہو گیا ہے اس کا۔"
"اب کی بار ہو جائے گا ان شاء اللہ۔"
وہ طنزیہ ہنسے۔ "ہو ہی نہ جائے کہیں۔ اچھا ہو بھی گیا تب؟ تیرا کیا خیال ہے میں تجھے جانے دوں گا کہیں۔"
"انکل پلیز۔"
"بکواس بند کر۔ تو یہاں سے فرار ہونے کی کوششوں میں ہے۔ ایک بات کان کھول کر سن لے، ابھی بھی میں اپنے پتر کے قتل کا کیس عدالت میں لے گیا تو تیرا قاتل بھائی لمبا اندر جائے گا۔ پھر کرتے رہنا ایم بی بی ایس۔"
وہ خاموش رہا۔
"یہ سارے ڈرامے بند کر اور چپ چاپ کام پر لگ۔ میں نے منشی سے کہہ دیا ہے کل سے تو زمینوں پر جائے گا اور ادھر کام کرے گا۔"
وہ بے یقینی سے چودھری صاحب کو دیکھتا رہ گیا۔ "لیکن انکل مجھے پڑھنا ہے۔ پلیز ایسا نہ کریں مجھے پڑھنے دیں۔"

”بس!“ وہ زور سے دہاڑے تھے۔

☆......☆

حسن اور امان ابھی ہوسٹل واپس آئے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی کمرے میں تھے۔ روم کا دروازہ بند تھا۔ حسن نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر دو لڑکے تھے۔
”اوہ! کدھر منہ اٹھا کر آ رہا ہے۔“ ان دونوں میں سے ایک بولا۔
”اپنے روم میں۔“ حسن رعب میں نہیں آیا تھا۔ دوسرا لڑکا اس کا وہی سینئر دوست تھا۔
”اوہ...... (گالی)...... نکل باہر۔“
”کیوں؟ میرا کمرا ہے۔“
”تیری (گالی)۔“
وہ تیزی سے اٹھا اور حسن کی طرف آیا۔ ایک جھٹکے میں اس نے گریبان جکڑ لیا۔
”اوہ (گالی) میرے ساتھ زبان لڑاتا ہے (گالی) تیرا (گالی) میں وہ حشر کروں گا کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔“
جواباً حسن نے دوسرے ہاتھ کا مکا اس کے جبڑے پر دے مارا۔ وہ سینئر لڑکا شاید اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تبھی کچھ قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔
”سالے (گالی)...... تیری تو (گالی)۔“
ماں بہن کی گالیوں کی بوچھاڑ میں وہ دونوں اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ چند قدم پیچھے دروازے میں کھڑا امان دہشت سے کانپ رہا تھا۔

☆......☆

”میں نہیں پہنوں گی یہ سفید اوور آل۔“ ستارہ نے جھرجھری لی تھی۔ وہ صبح کالج جانے کے لیے کپڑے پریس کر رہی تھی۔
”کیوں نہیں پہنے گی۔ سمجھو یونیفارم ہے تمہارا۔“
”استغفار! ازل سے یہ سفید یونیفارم پہن پہن کر دل بھر چکا ہے میرا۔ ابکائی آ رہی ہے مجھے اس کفن کو دیکھ کر۔ اللہ ابھی سے مجھے دوائیوں کی منحوس بو آنے لگی ہے۔“
ماورا (اس کی بڑی بہن) زور سے ہنسی۔
”ڈرامے بند کر۔“ امی نے گھرکا۔
”سچی امی! ابھی بھی وقت ہے مجھے بچا لیں۔ میں بی اے کر لوں گی۔“
وہ مڑی اور ماں سے لپٹ گئی۔ انہوں نے بمشکل کھینچ کر اسے خود سے علیحدہ کیا۔ ”توبہ کیسی جونک سی چمٹ گئی۔“
منہ بسور کر وہ زارا آنٹی کی طرف مڑی۔
”آنٹی! ملک کی مشہور فیشن ڈیزائنر میری پھوپی اور اس کے باوجود میں کالج جاتی ہوں یہ گندا سا سفید لٹھے کا اوور آل پہن کر۔ کتنے افسوس کی بات ہے ویسے۔“
”میری بنو رانی! اگر صدر پاکستان کی بیٹی بھی میڈیکل کالج جائے گی تو اسے بھی یہی پہننا پڑے گا۔“
وہ پھر سے رونی صورت بنائے پریس کرنے لگی۔

”ساری زندگی کے لیے عذاب میں ڈال دیا مجھے۔ ہر بار ایموشنل بلیک میل کر کے اپنا مطلب پورا کر لیتے ہیں۔ ہائے ستارہ تیری قسمت کہ تیرے رشتے دار اتنے خود غرض۔“
”بکواس بند کر۔“ ابو نہ جانے کب سے اس کی بک بک سن رہے تھے۔
”آپ نہ جانے کب سے یوں بے سروپا باتیں بگھار رہی ہیں۔ نہیں پڑھنا بے شک مت پڑھیے لیکن یوں سارا ملبہ ہم پر مت تھوپیے۔ کوئی زبردستی نہیں کی گئی آپ کے ساتھ۔“
”ارے واہ! ایسی شاعرانہ بے عزتی۔“ ابو ایسے ہی تھے۔ شدید غصے میں جب امی ان سے جھگڑتی تھیں تو وہ تب بھی۔ ”دیکھیے آپ یوں زیادتی مت کیجیے“ کر کے بات کرتے تھے۔
”آپ کو سفید رنگ سے مسئلہ ہے تو میں صبح ہی عرضی ڈال آتا ہوں سرکار! آپ بس فرمان جاری کر دیں کہ آپ کو کون سا رنگ چاہیے۔“ ابو نے طنز کیا۔
”کاش ابو یہ تو آپ کر ہی سکتے۔“ طنز کا جواب ان کی نا ہنجار اولاد طنز سے ہی دیتی تھی۔
”ستارہ!“ زارا آنٹی نے گھرکا۔
”پڑھنے جا رہی ہے تو کوئی شوٹنگ نہیں ہو رہی وہاں کہ ست رنگی ساڑھیاں باندھ کر جائے۔ چپ...... چپ......“

☆......☆

”صاف سیدھی بات ہے بھائی صاحب! آپ کی بیٹی ایک نمبر کی منہ پھٹ اور بدزبان ہے۔ جو بات کر لو آگے سے جواب سن لو۔ یہ گز بھر لمبی زبان ہے۔ توبہ توبہ، مجھے تو ماں سمجھا ہی نہیں کبھی چلو، بھاڑ میں جھونکو مجھے پر بی بی خاوند کی تو سن لیا کرے۔“
عالیہ سر جھکائے اور تیمور سر اٹھائے بیٹھا تھا۔ ایک پھپھو بول رہی تھیں اور باقی سب صرف سن رہے تھے۔
”بھائی صاحب! آپ بتائیے میں دشمن ہوں اس کی؟ میں نے کبھی بھی اسے کسی کام سے روکا ٹوکا نہیں ہے۔ اب اگر اس کے خاوند کو روز روز اس کا میکے آنا پسند نہیں ہے تو یہ روز ضد نہ کیا کرے۔“
ابو ہولے سے کھنکارے۔ ”میں شرمندہ ہوں بہن جی۔“
علینہ نے تڑپ کر باپ کو دیکھا۔
”آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ عالیہ نے زیادتی کی ہے۔ یہ معافی مانگے گی۔“
علینہ نے بے قراری سے سب کو دیکھا۔ شمائلہ بھابی خاموش تھیں اور آصف بھائی سر جھکائے ہوئے تھے۔ اس کی بے یقین نظریں اس پر جا ٹھہریں جو مجرم تھی۔ کیسا بڑا گناہ ہوا تھا اس سے۔
”عالیہ! اٹھو اور پھپھو سے معافی مانگو۔“
بلال نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ علینہ کو ذرا اطمینان ہوا کہ کوئی تو اس کے جیسا ہے۔ عالیہ اٹھی اور ساس کے پاس جا بیٹھی۔
”مجھے معاف کر دیں پھپھو۔“
شام میں شمائلہ بھابی باورچی خانے میں برتن دھونے میں مصروف تھیں جب علینہ اندر آئی۔
”واہ بھابی! مان گئی آپ کو۔“ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ غصے سے تلملا رہی تھی۔
”کوئی ایک لفظ بھی نہیں تھا آپ کے پاس جو آپ میری بہن کی حمایت میں بول دیتیں۔ بھابی ہیں آخر سگی بہن تو نہیں ہیں نا۔“

شمائلہ بھابی کو اس کے لفظوں کی سفاکی سے تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھیں عالیہ کے لیے وہ انہیں گالی بھی دے سکتی ہے۔ جھٹ ایسے ہی مشکل فیصلے آسان کروا دیتی ہے۔

"چندا! یہ مردوں کا معاشرہ نہیں ہے۔ یہ ماؤں کا معاشرہ ہے۔ مائیں جو صرف مائیں ہیں اور مائیں جو صرف ساسیں ہیں۔ اس معاشرے کی عورت توازن نہیں رکھتی۔ وہ ایک ماں اور ایک ساس کے کردار کو ایک ہی طریقے سے ادا نہیں کرتی۔ وہ جب ساس ہے تو ماں نہیں ہے۔ اس کا دل مانتا ہی نہیں ماں بننے کو۔"

وہ ذرا رکیں۔

"کل کو اگر پھپھو کی سگی بیٹی بھی یوں عالیہ کی طرح میکے آئے گی تو وہ اس سے بھی عالیہ ہی کی طرح معافی منگوائیں گی۔ ماں اپنی بیٹی کو سر اٹھانا نہیں سکھائے گی تو اپنی بہو کا سر اٹھا کیسے قبول کرے گی۔"

علینہ اکتا گئی۔

"میں یہ سب نہیں جانتی بھابی! میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میری بہن کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔"

شمائلہ بھابی بے بسی سے برتن سمیٹنے لگیں۔

"عورت کے ساتھ تو ہمیشہ سے زیادتی ہو رہی ہے چندا۔ وہ خاموش رہے تو بھی مجرم، آواز اٹھائے تب بھی ملزم۔ گالی خاموشی سے سنے تب بزدل، گالی سن کر گالی دے تو باغی۔ عورت تو چندا ہمیشہ سے زیادتی سہہ رہی ہے۔ اور سارے مسائل کی جڑ یہی ہے۔ مرد سمجھتا ہے عورت کو کچھ سمجھ لیا تو وہ اس کے سر چڑھ جائے گی اگر جو اس نے قبول کر لیا کہ ہاں عورت بھی کچھ ہے تو وہ اس پر حاوی آ جائے گی۔ سو بس دبا دو اس کے وجود کو، اس کی عزت کو، وقار کو، نام کو، وجود کو، ساکھ کو، جب چاہے جیسے چاہے گالی دے دو۔ سن لے گی نہیں بھی سنے گی تو کیا۔ چیخے گی، چلائے گی پر اس کی سنے گا کون۔"

☆......☆

حسن کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور بایاں گال سوجا ہوا تھا۔ سارے جسم پر جو چوٹیں تھیں اس کا حساب نہیں تھا۔ امان نے دیکھا اس کے دونوں سینئرز نے کمرے سے اس کا سامان باہر دے مارا۔

"جہاں مرضی رہے (گالی)۔ یہ کمرا تیرے باپ کا نہیں ہے۔"

شور کی آواز پر اور بھی کئی لڑکے باہر نکل آئے تھے۔ جونیئرز کی آنکھوں میں بے چینی اور سینئرز کی آنکھوں میں استہزا تھا۔ حسن نے خاموشی سے اپنے دونوں بیگ اٹھا لیے۔ امان نے اسے لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں سے ہوسٹل سے باہر جاتے دیکھا تھا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو تم سب! یہاں تمہاری کوئی عزت، کوئی وقار نہیں ہے۔ (گالی) یہاں سب تم سے بڑے ہیں اور تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے آگے تم نے چوں بھی کی تو حشر ایسا ہو گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکو گے۔"

وہ کوئی مسیحا تھا جو فرعون کے لہجے میں بول رہا تھا، کیا وہ جانتا تھا کہ فرعون کیسے غرق ہو جایا کرتے ہیں۔

امان بے بسی سے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

☆......☆

عثمان سر جھکائے سینئر بھائی کے سامنے کھڑا تھا جو استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آ گئی تیری عقل ٹھکانے (گالی) تم لوگوں کو عزت راس ہی نہیں ہے۔ ماں باپ نے کچھ نہیں سکھایا۔"

تبھی دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ عثمان نے سر اٹھایا تو دیکھا وہ وہی لڑکا تھا جسے اس نے دن میں آتے دیکھا تھا۔

"ارے جناب ازرق تشریف لائے ہیں، آئیے آئیے۔" اس کے ہاتھ میں ابھی بھی سگریٹ دبا ہوا تھا۔

"آ جا...... سارا دن کدھر تھا۔ فریشنز کی ویلکم میں بھی نہیں آیا۔"

"لعنت ان کی ویلکم پر۔"

اس نے مغرور نظروں سے عثمان کو دیکھا اور بستر پر آڑھا ترچھا آلیٹا۔ سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھواں کمرے میں آزاد کیا۔

(تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے)

"(گالی) میں ایسے فضول کاموں میں اپنا ٹائم ضائع کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔"

"تو CR (کلاس ریپریزینٹیو) ہے تھرڈ ایئر کا۔ تجھے دوبار پوچھا پرنسپل نے۔"

"بھاڑ میں گیا (گالی) پرنسپل۔"

دونوں نے قہقہہ لگایا۔

"تجھے پتا ہے میں CR کیوں بنا تھا۔ وہ (گالی) کامران کو ہرانے کے لیے الیکشن لڑا تھا میں نے۔ اسے ہرا دیا اب کام ختم۔ (گالی) بھاڑ میں گئی ذمہ داریاں۔"

عثمان خاموش کھڑا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف اسے بھولے نہیں تھے۔ بس انا کو تسکین مل رہی تھی کہ ایک غلام سر جھکائے کھڑا ہے۔

"ماہا آج کل بڑا تیرے آگے پیچھے پھر رہی ہے؟ کیا بات ہے۔"

"ہاں ہاں وہ رہ گئی تھی ناں کلاس میں بس میرے آگے پیچھے پھرنے والی۔"

دونوں پھر سے ہنسے۔ تبھی اس پہلے والے لڑکے نے عثمان کو پکارا۔

"اوہ! اس بھائی کا نام پتا ہے تجھے؟"

عثمان نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"کل کو اسی ٹائم تو اس بھائی کو اس کے روم میں اس کا نام بتانے جائے گا۔ ٹھیک ہے؟"

"(گالی) تو نے ابھی تو مجھے میرے نام سے بلایا تھا جب میں اندر آیا تھا۔ اوہ (گالی) تو بہتر ہے۔ سنا نہیں۔ (گالی) کیا سوچ رہا تھا۔"

عثمان نے سر جھکا دیا۔

☆......☆

"میں اسلم ہوں جی، چودھری جہاں داد کی زمینوں کا ٹھیکیدار۔ یہاں جتنی بھی زمینیں ہیں چودھری صاحب کی وہ میں ہی دیکھتا ہوں۔" وہ پکی رنگت کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ چودھری صاحب نے ایک نوکر کے ساتھ اسے وہاں بھیجا دیا تھا۔

"مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ چودھری صاحب نے آپ کو زمینوں پر کیوں بھیج دیا۔ آپ تو شہری صاحب ہو جی۔ آپ کا ادھر کیا کام۔"

وہ چپ رہا۔

"میں جانتا ہوں جی کہ آپ کون ہو، ادھر کیسے آئے ہو۔ مجھے بڑا افسوس ہے جی۔"

یہ جملہ وہ نہ جانے کتنی دفعہ سن چکا تھا۔

''آپ مجھے بتادیں کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہوگا۔ مجھے سارے کام سکھائیں۔ میں تیار ہوں۔''
''پتر یہ کھیل تماشا نہیں ہے۔ زمین تو بندہ چوس لیتی ہے۔ تو منع کردے چودھری صاحب کو۔''
نعمان نے نفی میں گردن ہلادی۔ وہ بھی چپ ہوگیا۔
گندم کی فصل کے لیے زمین تیار کی جارہی تھی۔ زمین میں ٹریکٹر چلایا جارہا تھا۔ وہ ایک مزارعے کے سپرد کردیا گیا جو اسے سارا کام سکھاتا۔ دور مغرب میں سورج غروب ہورہا تھا۔ ٹریکٹر سے اٹھتا گاڑھا سیاہ دھواں نارنجی آسمان میں معدوم ہورہا تھا۔ وہ جسے مسیحا ہونا تھا۔ کسان ہونے والا تھا۔

☆......☆

الارم کی وائبریشن نے عثمان کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھیں بمشکل فون کی اسکرین پر ڈالیں۔ آٹھ بجنے میں بارہ منٹ تھے اور آٹھ بجے اس کی پہلی کلاس تھی۔ وہ آناً فاناً اٹھا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا اور اس کے دونوں سینئر دوست نیند میں غرق تھے۔ رات اڑھائی بجے کے قریب وہ سوئے تھے۔ اس نے جلدی جلدی چینج کیا اور باہر آگیا۔ کیفے سے اٹھنے والی پراٹھوں اور انڈوں کی خوشبو آنتوں میں گرہیں ڈال رہی تھی لیکن ناشتے کا وقت ہرگز نہیں تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا کالج کی طرف بڑھا۔
پہلی کلاس Goss Anotomy کی تھی اور DH (Disection Hall) میں تھی۔ وہ اناٹومی ڈپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ شیشے کے دروازوں کے پیچھے ڈپارٹمنٹ کی دنیا تھی۔ لمبا کوریڈور جو آگے ایک گول ہال میں ختم ہوتا تھا۔ گول ہال کے اوپر گنبد نما چھت سے آنے والی زرد روشنیاں سارے ماحول کو خوابناک بنارہی تھیں۔ چکنے فرش پر لگائے جانے والے فینائل کے پوچے کی بُو سارے میں رچی تھی۔ بل کھاتی سیڑھیاں چڑھتے اس نے امان کو دیکھا۔
''امان! رک۔''
وہ اس کی طرف آیا۔ ''رک کیا ہوا؟ حسن کدھر ہے؟''
امان کا سر نفی میں ہل گیا۔
''ہیلو! گڈ مارننگ۔'' اس پرجوش زوردار آواز پر سب نے مڑ کر دیکھا۔
وہ ستارہ جہاں تھی جو دروازے کو ٹھاہ سے بند کرکے اندر آئی تھی۔ اس سے دو قدم آگے چلتی ایمن نے اس کی گڈ مارننگ کا جواب سلام سے دیا تھا۔
''کیسی کٹی رات؟ بڑی بری ہوئی ہوگی' ہے ناں۔''
ایمن نے نفی میں سر ہلادیا۔ ''ایک فرشتہ مل گیا رات۔ فی الحال تو اس نے بچالیا۔'' ستارہ نے قہقہہ لگایا۔
''فرشتے نہیں ہوتے بی بی یہاں! کوئی بدروح ہوگی۔ بھیس بدل کر آئی ہوگی۔''
زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہوچکی تھی۔ سارا ڈپارٹمنٹ لوہے کے اسٹول ماربل کے فرش پر گھسیٹنے کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ نئے نئے پرجوش نفوس اپنی اپنی جگہ بیٹھے تھے لیکن ان میں سے حاضر وہاں کوئی ایک آدھ تھا۔ کسی کا دماغ نیند میں تھا۔ کسی کے زخم تھے جو جسمانی تھے کسی کی عزت پر لگے داغ تکلیف دے رہے تھے۔ کسی کو گالی چبھ رہی تھی۔
ہاں وہ سب ایک خواب کی تعبیر تھی۔ بے شک تھی پر بڑی بھیانک تھی۔ سفید اوور آل میں اپنے اپنے سیاہ گھاؤ چھپاتے وہ سو کے قریب طلباء مسیحائی تک لے جانے والے اس سفر کی پہلی کلاس کے لیے تیار تھے۔
دروازہ کھلا اور پروفیسر اندر داخل ہوئے۔ ''ویلکم کلاس، ویلکم ٹو جی کے ایم سی!''

(باقی آئندہ ماہ)

کنیز زہرا

حرفِ شکایت نہ شد

وہ کچن میں برتن دھو رہی تھیں، جب گلی میں کھیلتی دس سالہ فرینہ بھاگتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی اور کچن میں آتے ہی ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔
''اماں! چاچا آرہے ہیں، وہ گلی کے نکڑ پر گاڑی کھڑی کیے بابا سے مل رہے ہیں۔ میں اندر بھاگ آئی۔ مجھے چھپالیں۔ وہ مجھے قتل کرکے بوری میں بند کردیں گے۔ مجھے بچالیں مجھے کہیں چھپالیں۔''
فرینہ کے چہرے پر خوف تھا۔
صالحہ بیگم ایک لمحے کو شرمندہ ہوئیں۔ یہ ڈر انہوں نے ہی تو فرینہ کے ننھے دل میں بٹھایا تھا۔ صابن سے لتھڑے کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے زور سے فرینہ کو اپنے ساتھ لگایا جیسے اس کے چھن جانے سے ڈر رہی ہوں۔ ان کی آنکھوں میں خوف نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔
''چل جا بھاگ کے شارقہ کے گھر چلی جا ان کے آنے سے پہلے، جلدی کر۔'' انہوں نے منا سا دوپٹا جو اس کے گلے میں پڑا تھا اس کے سر پر اچھی طرح جما کے اس کا آدھا منہ چھپادیا۔ وہ ان کی آغوش سے نکل کر باہر کی طرف بھاگ گئی۔ شارقہ دو گھر چھوڑ کر ہی تو رہتی تھی۔ ان کی بہن بنی ہوئی تھی۔ فرینہ اکثر شارقہ کی بیٹی مایا کے ساتھ کھیلنے ان کے گھر جایا کرتی تھی اور ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب بھی احسن آتا تھا وہ فرینہ کو شارقہ کے گھر بھیج دیتی تھی۔
انہوں نے جلدی سے اپنے چہرے کو نارمل کرکے باقی برتن نمٹائے۔ اتنے میں دروازہ بج اٹھا۔
انہوں نے دروازہ کھولا تو احمد اور احسن نے سلام کیا۔ وہ جواب دے کر دروازے سے ہٹ گئیں۔

احمد صاحب احسن کو لے کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے ڈھیلے پڑتے ہاتھوں سے دروازہ بند کردیا۔ کچھ لمحے خود کو سنبھالا پھر اندر کی طرف چل دیں۔

''ارے آپ نے بٹھایا نہیں، بیٹھو نا احسن! میں چائے لاتی ہو۔'' وہ کمرے میں آئیں تو وہ لوگ ابھی بھی کھڑے تھے۔ انہیں بیٹھنے کا کہہ کے وہ کچن میں جانے لگی تھیں جب احسن نے پکارا۔

''بھابی! آپ بیٹھیں، میں اتنی دور فیصل آباد چائے پینے نہیں آیا، آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔ یقین جائیں بھابی میری اولاد ہوتی تو میں کبھی فرینہ کا نام بھی زبان پر نہ لاتا۔''

انگلینڈ سے آنے کے بعد وہ لاہور شفٹ ہوگیا تھا جہاں اس کی دوسری بیوی رافعہ کا میکہ تھا۔ احمد کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ بولا تو صالحہ کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ وہ صوفے پر یوں ٹک گئیں جیسے ابھی اٹھ کے بھاگ جائیں گی۔

''کیا کہنا ہے بولو؟'' لرزتے دل کو سنبھالے وہ بظاہر لاپروائی سے بولیں تو احسن کھول اٹھا۔

'' آپ نہیں جانتیں کہ میں کیوں آتا ہوں؟ آپ جان بوجھ کے انجان بن رہی ہیں۔ فرینہ کو بلائیں، کہاں ہے وہ۔'' اس کی نظریں فرینہ کو تلاش کرنے لگیں تو احمد صاحب نے سر جھکالیا۔

''اگر تم پرانی باتیں دہرانے آئے ہو تو سن لو اب ان کی گنجائش نہیں۔'' سرد لہجے میں قطعی انداز اپناتے ہوئے انہوں نے بات مکمل کی۔

''اتنی کٹھور مت بنو صالحہ! وہ اتنی دور سے ہم سے ملنے آیا ہے۔ اسے فرینہ سے بھی ملنے دو۔'' احمد صاحب کے دل میں بھائی کی محبت جاگی تو احسن بھی نگاہوں میں آس کے دیپ جلائے صالحہ کو دیکھنے لگا۔

''نہیں ...... فرینہ میری بیٹی ہے۔ صالحہ کی بیٹی۔ وہ ایسے شخص سے ملنا نہیں چاہتی جو اسے میری گود میں ڈال کے بھول گیا تھا۔ وہ کہاں ہے میں یہ بھی نہیں جانتی۔ اس سے کہیں چائے پیے اور جائے یہاں سے۔'' دوٹوک انداز میں بات مکمل کرتی وہ کچن میں آگئیں۔ کچن میں آتے ہی وہ شیلف پر ہاتھ جمائے سسک اٹھیں۔ احسن ماں جیسی بھابی کا ایسا رویہ دیکھ کے ٹوٹ سا گیا۔

☆......☆

مایا نے دروازہ کھولا تو گھبرائی ہوئی فرینہ جلدی سے اندر داخل ہوگئی۔ مایا اس کی اس قدر عجلت دیکھ کے پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا تم ڈر کیوں رہی ہو، باہر کتا تھا کیا؟'' وہ اسے لیے اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ کیا جواب دیتی اماں نے کسی کو بھی بتانے منع کیا تھا۔ وہ خاموش رہی۔ شارقہ خالہ نے مایا کو کبھی گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیا تھا۔ ہمیشہ اس کی گنی چنی سہیلیاں ہی ان کے گھر آجاتی تھیں۔ جن میں سرفہرست فرینہ تھی۔

''اچھا کیا تم آگئیں۔ میں گڑیا کے کپڑے سی رہی تھی۔ ماما نے سکھائے ہیں۔ اب تم بتاؤ کس رنگ کے سیوں اور کیا سیوں لہنگا یا شلوار قمیص؟'' بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جوش میں وہ اپنا سوال خود ہی گول کر گئی تھی۔ فرینہ نے شکر منایا۔ ٹیبل پر پڑے جگ سے پانی پیتے ہوئے وہ نارمل ہوچکی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مایا بیڈ پر رنگ برنگی کترنیں لیے بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ لگ گئی۔ کچھ ہی دیر میں جھلمل کرتے ستاروں سے سجا گڑیا کا سوٹ تیار تھا۔

''واہ میری بیٹیوں نے تو بہت اچھی سلائی کی ہے۔'' اندر آئی شارقہ نے دونوں بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرا تو فرینہ کھل اٹھی۔ اسے اس گھر سے ہمیشہ پیار ملا تھا۔

''شکریہ خالہ!'' وہ مسکرا کے بولی۔

''ارے شکریہ کیوں، بیٹیاں ماؤں کو شکریہ کہتی ہیں بھلا؟ پاگل لڑکی اپنوں کو شکریہ نہیں کہتے۔ میں ابھی تم لوگوں کے لیے فرنچ فرائز بنا کے لاتی ہوں۔''

انہیں پچکارتی وہ کچن میں چلی گئی تو دونوں پھر گڑیا میں مگن ہوگئیں۔

''اوہو میں تو ایک پری چھوڑ کے گیا تھا۔ یہ دو کیسے ہوگئیں؟'' سلمان چاچو ابھی ابھی آفس سے آئے تھے۔ وہ مایا کے چاچو تھے اور ان ہی لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ فرینہ سے بھی مایا جتنا ہی پیار کرتے تھے۔ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے مایا بھاگ کر ان کی گود میں سوار ہوگئی۔

''ارے اتنی بڑی گھوڑی ہوگئی ہے۔ ابھی بھی گودی چڑھنے کا شوق نہیں گیا۔ چلو اترو بے چارہ تھکا ہوا آیا ہے۔'' شارقہ اندر کوئی چیز لینے آئی تھیں۔ جب مایا کو گود میں چڑھا دیکھ کے ڈانٹنے لگیں۔ سلمان انہیں ہمیشہ بھائیوں کی طرح عزیز رہا تھا۔ ان کے گھر میں خوشحالی تھی۔ وجہ ان کا آپس میں سلوک تھا۔ سلمان ہر ماہ ایک معقول رقم شارقہ کے ہاتھ پر رکھتا تھا۔ وہ اس قدر اہمیت واحترام پر پھولے نہ سماتی تھیں۔ سوراوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ آج بہت تھکا دینے والا دن تھا۔ سلمان کے چہرے سے ہی تھکن ہویدا تھی۔

''رہنے دیں بھابی! میری پری ہے یہ۔ میں جب اسے دیکھ لیتا ہوں تو میری ساری تھکن اتر جاتی ہے۔'' پیار سے مایا کا ماتھا چومتے ہوئے وہ بولا تو شارقہ مسکرا کر کچن میں چلی گئیں۔ چاچو کی اس درجہ محبت پر فرینہ کی آنکھیں مایا کے چہرے پر جم سی گئیں۔

''کاش میرے چاچا بھی اتنے اچھے ہوتے۔'' حسرتوں بھرے دل سے ہوک سی اٹھی۔ اس کی نظروں میں احسن کا چہرہ گھوم گیا۔ سلمان چاچو سے بھی زیادہ بلند قامت، گندمی چہرے پر خوب صورت سرمئی آنکھیں اور گھنی مونچھوں والے اس کے چاچا بہت برے تھے۔ وہ بچوں کو مار کر بوری میں ڈال کے کوڑے میں پھینک دیتے تھے۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کیں۔

''اور فری! آپ کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟'' مایا کو ساتھ بٹھاتے ہوئے سلمان چاچو نے اس سے پوچھا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی اور انہیں تفصیل سے بتانے لگی۔

☆......☆

آج احمد کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ اس لیے وہ آفس سے چھٹی کیے بیٹھے تھے۔ تب ہی احسن آیا۔ وہ اسے لیے احمد صاحب کے کمرے میں ہی آگئیں۔ وہ حال احوال پوچھتا احمد صاحب کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔ صالحہ پیچ وتاب کھا کے رہ گئیں۔

''دیکھو احسن! فری اسکول سے آنے والی ہے۔ خدا کے لیے چلے جاؤ یہاں سے۔ احمد! اسے کہیں یہ چلا جائے یہاں سے اور پھر کبھی مت آئے۔'' سخت لہجے میں کہتے صالحہ اتنا کہہ کے جانے لگیں تو ضبط کرتا احسن دبے لفظوں میں بول اٹھا۔ آج پھر وہ کئی میل کا سفر کر کے آیا تھا۔ آج پھر وہی سوال تھا۔

''آپ جانتی ہیں میں یہاں کیوں آتا ہوں۔ مجھے میری بیٹی سے ملنے دیں۔ میں اسے لے کے چلا جاؤں گا پھر نہیں آؤں گا۔'' اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ ضد تھی۔ وہ بھی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''کون سی بیٹی تمہاری؟ جسے تم میری گود میں ڈال کے انگلینڈ چلے گئے تھے۔ مڑ کے خبر تک نہیں لی اور اب اتنے برسوں بعد تمہیں یاد آیا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔'' صالحہ جیسے پھٹ پڑیں تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کے رہ گیا۔

''اس کی ماں چند مہینے کی بچی کو چھوڑ کے مرگئی تھی۔ تب میں صدمے میں تھا۔ کیسے سنبھالتا ننھی سی فرینہ کو۔'' ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتاتے ہوئے احسن نے مدد طلب نظروں سے احمد کو دیکھا۔

''مت کرو ایسے صالحہ! فرینہ اس کی بیٹی ہے۔ دے دو اسے واپس، ڈال دو ایک باپ کے دل میں ٹھنڈک۔ ہمارے پاس تو امانت تھی بچی۔'' پیار سے صالحہ کو سمجھاتے ہوئے احمد کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔

آخر وہ بھی باپ تھے۔

”وہ میری بیٹی ہے۔ میں نے اس کے لیے راتیں کالی کی ہیں۔ میں نے اسے اپنے ان ہاتھوں سے پالا ہے۔ چلنا سکھایا ہے، کھانا کھلایا ہے، اس کے ننھے ننھے کپڑے سیے ہیں۔ پیدا کر لینے سے کوئی ماں باپ نہیں بن جاتا۔ قربانی دینا پڑتی ہے اپنے سکھ چین کی، اپنی پوری زندگی کی۔ اس سے پوچھیں اس نے کیا کیا فرینہ کے لیے آج تک؟“ اپنے ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلائے وہ نم لہجے میں بولیں۔ آخر میں ان کا لہجہ چٹانوں سا سخت ہو گیا تو احمد سر جھکا گئے۔ ساری عمر ہر قسم کے حالات میں ان کا ساتھ دینے والی آج دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ ایک نظر احسن پر ڈال کے آنکھیں صاف کرتے اٹھ کر کمرے سے ہی باہر نکل گئے۔ اب احسن کو اپنا مقدمہ تنہا لڑنا تھا۔

”میں جانتا ہوں آپ کا مجھ پر بہت احسان ہے مگر اس کا بدلہ یہ بالکل نہیں جو آپ مانگ رہی ہیں۔ وہ میری اولاد ہے۔“ احسن التجائیہ لہجے میں بولا مگر صالحہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھیں۔

”تم تو وہاں سے شادی کر کے آئے ہو نا۔ تمہاری تو اور بھی اولاد ہو گی۔ کیوں مجھ سے میری بیٹی چھیننے آئے ہو۔ تمہیں رحم نہیں آتا مجھ پر؟“ وہ اس وقت بے بسی کی انتہا پر تھیں۔

”پانچ سال ہو گئے بھابی! میں اولاد سے محروم ہوں۔ گھر جاتا ہوں تو گھر کی تنہائی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ میں کبھی فرینہ کو واپس نہ مانگتا مگر رفیعہ میری بیوی اولاد کی کمی کے غم میں بیمار رہتی ہے۔ میں نے اسی لیے اس کے میکے کے پاس گھر لیا کہ وہ تنہائی محسوس نہ کرے۔“ بات کرتے کرتے وہ اپنے بال نوچنے لگا۔

”جو بھی ہے میں اپنی بیٹی تمہیں نہیں دوں گی۔ اسے ضد سمجھو یا جو چاہے سمجھو۔“ ان کے چہرے پر بلا کی سختی در آئی۔ جملہ مکمل کرتے ہی وہ دھاڑ سے دروازہ بند کرتی باتھ روم میں گھس گئیں۔ احسن ضبط سے سرخ پڑتی آنکھیں لیے گاڑی میں جا بیٹھا۔ وضو کرتے ہوئے وہ جائے نماز بچھائے سجدے میں جا گریں۔ آج کل ان کا ایک ہی کام تھا، سجدے میں گڑگڑا کر احسن کے لیے اولاد کی دعا مانگنا۔ اس طرح تو کبھی انہوں نے اپنے لیے بھی دعا نہیں مانگی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ جب نعمت پاس نہیں ہوتی تو اس کی اتنی کمی نہیں ستاتی مگر جب انسان کے پاس وہ نعمت آجائے تو اسے کھونے کا خیال ہی اس کے لیے موت ہوتا ہے۔ وہ آج سمجھی کہ پانا درد ہے مگر پا کے کھو دینا قیامت کا درد ہے۔ جو پل پل جان لیتا ہے۔ وہ بھی پل پل مر رہی تھیں۔ اگر احسن فرینہ کو زبردستی لے گیا تو......“ یہ ایک ایسا سوال تھا جو کند چھری کی مانند ان کی شہہ رگ کاٹ رہا تھا اور وہ آس و نراس کی کیفیت میں ڈوبی موت و حیات کے فیصلے کے انتظار میں تھیں۔ کئی سالوں سے وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔ سب ڈاکٹرز انہیں لاعلاج قرار دے چکے تھے مگر کلمہ شکر کبھی ان کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہوا۔ فرینہ کی محبت کیسی آزمائش تھی کہ وہ اپنے مقدر سے لڑ رہی تھیں۔

☆......☆

کئی ہفتے یونہی بے کیف سے گزر گئے تھے۔ روز انہیں لگتا آج احسن آ کے فرینہ کو لے جائے گا اور ان کی سونی گود پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سونی ہو جائے گی۔ ہر شام وہ شکر مناتیں کہ احسن نہیں آیا اور احسن واقعی نہیں آیا تھا۔ شاید اسے ان کی بے بسی پر رحم آ گیا تھا۔ اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ بادل ٹوٹ کے برسے تھے۔ چھوٹے سے صحن میں رکھے گملوں کے سب پھول پتے دھل کے نکھر گئے تھے۔ ابھی بھی بادلوں کا آسمان پر ڈیرا تھا۔ کسی وقت بھی بارش دوبارہ شروع ہو سکتی تھی۔

فرینہ کے لیے کارٹون لگا کے صالحہ سبزی کی ٹوکری لے کر صحن میں ہی بچھی چارپائی پر آ بیٹھیں کہ ایکدم باہر کا دروازہ بجا۔

”احمد صاحب کو تو آج دیر سے آنا ہے۔ اس وقت کون آ گیا؟“ ڈھلتی شام کو دیکھ کر خود کلامی کرتے ہوئے انہوں نے دروازہ کھولا اور دروازے پر احسن کو دیکھ کے ساکت ہو گئیں۔ ”فرینہ تو گھر میں نہیں۔“ غیر ارادی طور پر سلام کی جگہ ان کے منہ سے نکلا۔ خدشات سے پر لہجہ ان کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔ احسن مسکرا دیا۔

”بھابی! آج میں فرینہ سے نہیں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے خدا نے نواز دیا ہے بھابی! اولاد کی نعمت ملنے کی خوشخبری دے کر۔“ خوشی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ بتاتے ہوئے اس نے صالحہ کا ہاتھ پکڑ کر چھوٹے سے صحن میں گھما ڈالا۔ تو وہ بھی بے تحاشا خوش ہو گئیں۔ صحن میں بچھی واحد چارپائی پر انہیں بٹھا کر وہ ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔

”بھابی! آپ کے مجھ پہ بہت احسانات ہیں۔ مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ آپ میری ماں جیسی ہیں۔ مجھے بیٹا سمجھ کے معاف کر دیں۔ فرینہ آپ کی بیٹی تھی۔ آپ کی ہی رہے گی۔ میں اب کبھی اسے لینے نہیں آؤں گا۔“ نم آنکھوں میں بلا کی سرشاری تھی۔

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں پاگل! تم جم جم آؤ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ بلکہ اپنے بیوی بچے کو بھی لانا۔“ احسن کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے وہ فرینہ کو آواز دینے لگیں۔

”فرینہ او فرینہ!“

وہ پیروں میں جوتی اڑستی باہر بھاگی تو چاچا کو کرسی پر بیٹھے دیکھ کے الٹے پیروں واپس جانے لگی تو چاچا نے اٹھ کے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس نے مرے مرے انداز میں سلام کیا تو جواب دے کر احسن نے جیب سے چاکلیٹ نکال کے اسے پکڑا دیں۔

”دیکھو میری جان! میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“ لینے سے پہلے اس نے صالحہ کو دیکھا تو انہوں نے سر کے خفیف سے اشارے سے کہا کہ لے لو۔

”تم فرینہ کے ساتھ باتیں کرو میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔“ ان کا اطمینان دیدنی تھا۔ درحقیقت یہ تو ایک بہانہ تھا۔ وہاں سے اٹھنے کا، اصل میں تو وہ سجدہ شکر ادا کرنا چاہتی تھی۔ آخر رب نے ان کی سن لی تھی۔ صالحہ کی بیٹی کو آج سچ میں صالحہ کی بیٹی بنا دیا تھا۔

فرینہ حیران ہوتی رہی۔ آج اماں کے چہرے پر کوئی خوف نہیں تھا اور چاچا بھی تو کتنے بدلے بدلے سے تھے بالکل ماما کے چاچو جیسے۔ ورنہ وہ تو انہیں دیکھتے ہی چھپ جاتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا خوف زائل ہو گیا۔ وہ اماں سے پوچھنا چاہتی تھی کہ چاچا کیسے بدل گئے۔ وہ تو بچوں کو گلا دبا کے پھینک دیتے تھے نا۔ ایکدم اسے اماں کی کچھ عرصے پہلے کی سکھائی ہوئی بات یاد آ گئی۔

”بیٹا! سجدوں میں مانگنے سے رب مل جاتا ہے پھر ہماری خواہشات تو معمولی چیزیں ہیں۔“ تو کیا وہ اتنے عرصے سے سجدوں میں چاچا کی ہدایت مانگ رہی تھیں؟ اس کے پوچھنے پر وہ آنسوؤں سے بھیگے لہجے میں ہمیشہ یہی بتاتی تھیں کہ وہ ایک خاص چیز مانگ رہی ہیں۔

ننھی ننھی بوندیں صحن کو بھگونے لگیں تو احسن نے فرینہ کو گود میں اٹھا کے اندر کی طرف دوڑ لگا دی۔

سچ کہتے ہیں۔ بارشیں رحمت ہوتی ہیں۔ دلوں کے میل تک دھو ڈالتی ہیں۔ ساری کثافتیں مٹا ڈالتی ہیں۔ ایک ایسی ہی رحمت بھری بارش ان کے گھر ساری خوشیاں اور رعنائیاں لے کے برسی تھی۔ کمرے سے آتی فرینہ اور احسن کی کھلکھلاتی آوازوں پر خوش ہوتی صالحہ جائے نماز سمیٹنے لگی۔ احمد بھی آنے والے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کچن کا رخ کیا۔

......☆......

عائشہ ذوالفقار

دل ہے آوارہ

وہ دونوں بچوں کو ہوم ورک کروا رہا تھا جب اس کا سیل بجا۔ عمایہ کی کال تھی۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے اٹینڈ کر لی۔

''عکرمہ آئم سوری، میری وجہ سے آپ کو آفس چھوڑنا پڑا۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''سوری تو مجھے کہنا چاہیے میری وجہ سے تم اپنا شرف کھو بیٹھیں۔'' وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

''وہ شرف شاید ابھی میرے نصیب میں نہیں تھا۔ سوری عکرمہ۔'' وہ پھر بولی۔

''نہیں عمایہ! لوگ تو محبت میں ملک چھوڑ دیتے ہیں، تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے تو صرف آفس ہی چھوڑا ہے۔'' اس نے اسے اس کا وقت یاد کروایا۔ عمایہ چپ رہ گئی۔ ''ابھی تو بہت کچھ چھوٹ جائے گا مجھ سے۔ ابھی تو تمہاری طرح خالی ہاتھ ہونا ہے مجھے۔'' وہ بولا۔

''عکرمہ! قسم سے میں نے یہ سب نہیں چاہا تھا۔'' وہ بولی۔

''تم نے میری محبت تو چاہی تھی نا، بس یہ سب اس محبت کی بھینٹ ہے۔'' وہ ہنسا۔

قسط نمبر 22

”عشوہ نہیں مانی۔“ اس نے پوچھا۔
”اس نے خلع لے لیا ہے۔“ عکرمہ نے صرف اسے بتایا۔ عمایہ سن رہ گئی۔
”اب کیا ہوگا۔“ وہ بولی۔
”ہمیشہ وہی ہوا ہے جو عشوہ نے چاہا ہے۔“ عکرمہ ہولے سے بولا۔
”لیکن آپ کے بچے......!“ اسے دکھ ہو رہا تھا۔
”میرے پاس ہی رہیں گے، میرے جو ہوئے عینیہ کو چھوڑ دو۔ مجھ سے شادی کرلو۔“ وہ بولا۔
”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں مرجاؤں گی لیکن ایسا نہیں کروں گی۔“ وہ بولی۔
عکرمہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ ”بس مجھے یہ ہی سننا تھا۔“
عمایہ نے چپ چاپ کال کاٹ دی۔

☆......☆

رات کے دس بجے عرفان اسے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ ابھی دو دن پہلے ہی گاؤں سے واپس آیا تھا۔
”عارب تو اس وقت...... خیریت تو ہے۔“ عرفان اسے دیکھ کر کافی پریشان بھی ہوگیا تھا۔
”بھائی، بھابی تو ٹھیک ہیں ناں؟“ عارب اندر آگیا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔
”تجھ سے ایک بہت ضروری بات ڈسکس کرنا تھی اس لیے آیا ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔
”تو حویلی میں کرلیتا۔ میں پرسوں ہی تو آیا ہوں۔“ عرفان اس کے پاس بیٹھ گیا۔
”وہاں نہیں ہوسکتی تھی یار۔“ عارب کو پسینے آرہے تھے۔
”ہوا کیا ہے؟“ عرفان آگے کو ہوا۔
”تو وعدہ کر کہ میری پوری بات صبر اور تحمل سے سنے گا پھر میری مدد بھی کرے گا۔“ عارب بولا۔
”اب کیا کردیا تو نے۔“ عرفان بے حد پریشان ہوگیا۔
عارب نے دھیرے دھیرے اسے سب کچھ بتا دیا۔ عالیان کی کال سے لے کر عتبہ سے اس کی آخری بات چیت تک۔ عرفان آنکھیں پھاڑے منہ کھولے اس کی باتیں سنتا رہا۔ عارب اسے ایک ایک لفظ بتا کر چپ ہوگیا۔
”اور اب جب تباہی سر پر آکر کھڑی ہوگئی ہے تو تجھے میں یاد آگیا۔“ عرفان پھٹ پڑا۔ ”مجھے صرف ایک بات بتا دے کہ اس علیکہ زہرہ کے لیے تو کس حد تک جائے گا عارب۔“ ”تو نے اپنی خود غرضی کی خاطر عروج کو داؤ پر لگا دیا۔“ اسے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔
”میں نے یہ سب صرف عروج کے لیے ہی تو کیا عرفان...... اس کا کیا بنتا اگر عالیان نہ آتا تو۔“ وہ بولا۔
”رو دھو کر چپ ہو جاتی۔ صبر کرلیتی۔ اب زیادہ قیامت آئے گی جب اسے پتا چلے گا کہ جس شخص کے ساتھ اس نے تین ماہ گزار لیے وہ عالیان نہیں ہے۔“ عرفان بھڑک کر بولا۔
”اسے کسی طور نہیں بتانا عرفان۔ کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ عتبہ نے اسے پورے طرح قابو کرلیا ہے بلکہ اس نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ سب اس کا یقین کریں گے۔“ عارب جلدی سے بولا۔
”اصلی عالیان کو بلا لیں۔“ پہلا مشورہ۔
”تو میرا کیا ہوگا۔ اماں، جان سے ماردیں گی مجھے۔“ وہ بولا۔

”علیکہ سے بات کرلیتے ہیں۔“ دوسرا مشورہ۔
”وہ مجھے مار دے گی۔ قطعاً نہیں۔ کسی سے بات نہیں کرنی عرفان۔ صرف اس بے ہودہ انسان کو ٹھکانے لگا دے۔“ عارب جلدی سے بولا۔
”جان سے مار دوں کیا؟“ عرفان زور سے بولا۔
”ہاں، جان سے مار دیتے ہیں۔“ عرفان سن کر دنگ رہ گیا۔
”عارب یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔“ وہ بمشکل بولا۔
”یہ ہی آخری حل ہے یار، وہ شخص بہت بے غیرت ہے۔ بہت کمینہ...... وہ عروج کو نہیں چھوڑے گا، اسے تباہ و برباد کردے گا جیسے علیکہ کو کردیا۔ کچھ عرصے بعد کسی اور طرف منہ مارنا شروع کردے گا۔ عروج کی ساری زندگی عذاب کردے گا وہ۔ ہمیشہ یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔ ایک نہ ایک دن سب کو پتا چل جائے گا۔ عتبہ کا کیا ہے وہ تو مجھے آگے کرکے چپ چاپ اپنا راستہ لے گا۔ سب میری ایک نہیں سنیں گے حالانکہ میں نے صرف گھر والوں کو دکھ سے بچانے کی خاطر یہ سب کیا تھا۔ سوچ ذرا اگر تب میں بتا دیتا کہ عالیان نہیں آئے گا تو کیا ہوتا۔ ایک کہرام مچ جاتا۔ اماں غم کی شدت سے مرجاتیں۔ عروج کو روتے ہوئے کیسے دیکھتا میں...... بس سب کی خوشیوں کا سوچ کر میں نے یہ سب کردیا ہے۔ ذرا سا بھی اندازہ نہیں تھا کہ عتبہ مجھے دغا دے جائے گا۔“ وہ کہتا چلا گیا۔
”عارب اگر عروج ماں بن گئی تو؟“ عرفان کی روح لرز گئی۔
”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کام ختم کرتے ہیں اس کا۔ دھرتی پر سے بوجھ کم ہو جائے گا۔ عروج کی بھی جان چھوٹ جائے گی اور علیکہ بھی سکھی ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔
”وجہ تو پھر علیکہ ہوئی نا۔“ عرفان اسے گھور کر بولا۔
”پلیز یار میری مدد کر۔“ عارب آگے کو ہوا۔
”مارنے سے بہتر ہے جیل میں ڈال دیتے ہیں۔“ عرفان بولا۔
”پھر باہر آجائے گا۔ کوئی نہ کوئی اسے باہر نکلوا لے گا۔ مصیبت تو پھر وہی رہے گی نا۔ ختم کروا دے بس۔“ وہ بولا۔
”قتل ہوگا یہ۔“ عرفان ڈر رہا تھا۔
”کوئی نیک پارسا انسان نہیں ہے وہ۔ اس کے مرنے پر کسی کو افسوس نہیں ہوگا۔“ عارب جلدی سے بولا۔
”عروج کو تو ہوگا۔“ عرفان دھیرے سے بولا۔
”میں سنبھال لوں گا اسے۔“ عارب اسے جلد از جلد مردہ دیکھنا چاہتا تھا۔
”پتوکی کے قریب کسی روڈ ایکسیڈنٹ میں ختم کروا دیتے ہیں۔ خس کم جہاں پاک......!“ عارب کے پاس پلان بھی تیار تھا۔
”جب وہ ڈیوٹی سے واپس آتا ہے تو بس مین روڈ پر ایکسیڈنٹ میں اسے مروا دیں گے۔ ایک دو دن بعد گھر والوں کو خود ہی پتا چل جائے گا۔“ عارب جلدی سے بولا۔
”ایکسیڈنٹ کے بجائے فائرنگ کروا دیں گے۔ ڈکیتی کا کیس لگے گا۔“ عرفان جلدی سے بولا۔
”یہ بھی ٹھیک ہے، جلد از جلد کر یار۔“ عارب بولا۔

”میں اس ہفتے گاؤں آتا ہوں تو مل کر قصہ ختم کرتے ہیں۔“ عرفان اس کے ساتھ تھا۔

☆......☆

وہ آج دونوں بچوں کو اس سے ملوانے لے کر آیا تھا۔ ابھی تک خلع کے بارے میں اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔

”ماما! آپ پاپا سے ناراض ہیں؟“ عینا اس کی گود میں چڑھتے ہوئے بولی۔ عشوہ چپ رہی۔

”ماما! آپ پاپا کو معاف کردیں پلیز۔“ عرش باقاعدہ اس کے آگے کھڑا ہو کر دونوں کان پکڑتے ہوئے بولا۔ عکرمہ چپ چاپ دروازے میں کھڑا تھا۔

”یہ سب تم نے سکھایا ہے نا انہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے پتا تھا یہ بھی میرا جرم تصور ہوگا۔“ عکرمہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”پلیز ماما۔“ عینا نے بھی کان پکڑ لیے۔ عشوہ نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چپ چاپ دونوں کان پکڑ لیے۔

بڑے شاطر ہو تم۔ پتا ہے نا میں تمہارا قصور تمہارے بچوں کو نہیں بتا سکوں گی۔“ عشوہ بولی۔

”یہ بچے تمہارے نہیں ہیں؟“ وہ بولا۔

”میرے پاس چھوڑ دینا، بس۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”کتنے گھنٹے رکھو گی اپنے پاس۔“ عکرمہ بولا۔

”تم مجھے یہ مت جتاؤ کہ میں اپنے بچے پال نہیں سکتی۔“ اسے غصہ آگیا۔

”تم مجھے معاف نہیں کرسکتیں۔“ وہ بولا۔

”نہیں۔“ وہ قطعی انداز میں بولی۔

”بچوں کے لیے بھی نہیں؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔ ”عینا نے فوراً اپنے کان چھوڑ دیے۔

”ماما! ہماری کلاس میں جب بچے ٹیچر کی بات نہیں مانتے تو وہ ان سے ناراض ہو جاتی ہیں لیکن جب بچے سوری کریں تو وہ انہیں معاف کردیتی ہیں۔ آپ پاپا کو کیوں معاف نہیں کر رہیں۔“ سات سالہ عرش اس سے سوال کر رہا تھا۔

”کیونکہ یہ آپ کا کلاس روم نہیں ہے بیٹے۔ بہت سارے بچوں کو ماما یا پاپا میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ دونوں کی مرضی۔ جس کے ساتھ مرضی رہو۔“ وہ عرش کو سمجھاتے ہوئے بولی۔ دونوں چپ چاپ عکرمہ کو دیکھ کر رہ گئے۔

☆......☆

عرفان گاؤں آیا تو عارب کے ساتھ مل کر سارا پلان ترتیب دے دیا۔ عتبہ شام چھ بجے تک مین روڈ سے ہو کر گاؤں پہنچتا تھا۔ بس اسی دوران چند لوگوں نے اسے لوٹ کر اسے جان سے مار دینا تھا۔ آگے کے معاملات سنوارنا عرفان کا کام تھا۔ گھر والوں کو اسی رات تک اطلاع ہو جانی تھی۔ سب کچھ ترتیب دے کر عرفان دو دن بعد لاہور واپس آگیا۔

عارب نے اپنے انداز سے عتبہ کو کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ اب اس کی بے ہودگیوں کا دی اینڈ ہونے والا تھا۔ عتبہ نے شادی کے بعد علیکہ کو کال تک کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا یا شاید اسے یہ امید تھی کہ علیکہ اسے کال کرے

گی۔ اس سب میں بھی عارب کا ہی ہاتھ تھا۔ اس نے عتبہ کے ذہن میں علیکہ سے متعلق ایسی ایسی باتیں انڈیل دی تھیں کہ وہ اس سے حد درجہ متنفر ہو گیا تھا۔ وہ ہی ساری باتیں اب اس پر الٹی پڑ رہی تھیں۔ عتبہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ عروج کے حق میں اسے برداشت کرلیتا۔ اگر عتبہ علیکہ کو طلاق دے دیتا تب بھی شاید وہ عارب کے نزدیک قابل معافی ہوتا لیکن......عتبہ واقعی آؤٹ آف کنٹرول ہو رہا تھا۔ سو اس کا وقت آگیا تھا۔

☆......☆

وہ آج کلب آیا تھا۔ دونوں بچوں کو بھی ساتھ ہی لے آیا تھا۔ جب تنہا ہی پالنے تھے تو کیا کلب اور کیا آفس......ہر جگہ ہی ساتھ لے جاتا تھا۔ انسٹرکٹر اسے آتا دیکھ کر ہنس پڑا اور بولا۔

”ان دونوں کو بھی چیمپئن بنانا ہے۔“

”شاید آئندہ آنے والے وقتوں میں۔“ وہ انہیں ایک طرف بٹھا کر ہوم ورک شروع کرواتے ہوئے بولا۔

”یار ایک ریکوئسٹ کی تھی تجھ سے۔“ عون (انسٹرکٹر) نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”مجھے یاد نہیں ہے، کیا کہا تھا۔“ وہ باکسنگ گلوز پہنتے ہوئے بولا۔

”ایک ٹرافی جتا دے یار مارشل آرٹ کی۔“ عون بولا۔

”تیرے پاس چالیس سے زیادہ باکسرز ہیں یار۔“ عکرمہ تڑخ گیا۔

”مارشل آرٹ کا کوئی نہیں ہے۔“ عون آگے کو آیا۔

مارشل آرٹ میں صرف ایک بار چیمپئن بنا ہوں میں۔ جان داؤ پر لگ جاتی ہے۔ مار دو یا مر جاؤ۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا۔“ وہ بولا۔

”یہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ صرف تو ہی ایک مارشل آرٹ کا بندہ ہے اس کلب میں جو مجھے جیت دلوا سکتا ہے۔“ عون کی وہی رٹ تھی۔

”میری بات سن، میری ڈائیورس ہونے والی ہے۔ میرے دو بچے ہیں جو مجھے اکیلے پالنے ہیں۔ مر گیا تو انہیں کون پالے گا؟“ عکرمہ آگے کو آیا۔

”تیری بیوی اور اس کا دوسرا شوہر۔“ عون ہنسا۔

”بکواس نہ کر۔“

”او کچھ نہیں ہوتا تجھے یار۔“ عون ضد کر رہا تھا۔

”عرش یار! اپنے بابا سے کہو نہ ایک میچ جیت کر دکھا دے۔“ عون نے جھٹ عرش کو بیچ میں ڈال لیا۔

”میرے بچوں سے کوئی ڈیل نہیں ہوگی۔“ وہ بولا۔

”اتنے سارے لوگ ہوں گے اسٹیڈیم میں۔ تمہارے پاپا کے لیے بہت ساری تالیاں......نعرے......شور......پھر تمہارے پاپا جیت جائیں گے۔ اخباروں میں، ٹی وی پر ہر جگہ آئیں گے۔“ عون کی زبان چلنا شروع ہو گئی۔

”بس کرو......بس......“ عکرمہ نے اسے جھڑکا۔

”پاپا آپ کھیل لیں نا میچ۔“ عرش آگے کو آیا۔

”اب انہیں یہ بھی بتا کہ کون سا میچ۔“ عکرمہ اسے گھور کر بولا۔

”بس تھوڑے بہت کراٹے کھیلنے ہیں اور کچھ نہیں۔“ عون کندھے اچکا کر بولا۔ عکرمہ کا منہ کھل گیا۔

"تو خود کیوں نہیں کھیل لیتا۔" وہ بولا۔
"میں ہار جاؤں گا۔" وہ جھٹ بولا۔
"اور اگر میں ہار گیا تو؟" عکرمہ آگے آیا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو جیت جائے گا۔" عون پر یقین تھا۔ عکرمہ اسے دیکھتا ہوا رنگ میں اتر گیا۔

☆......☆

"عتبہ!" رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب وہ ایکدم اٹھ بیٹھی۔ سارا بدن پسینے سے شرابور تھا اور تکلیف کے مارے اس کی آنکھوں میں پانی آرہا تھا۔ گرتی پڑتی وہ بمشکل کمرے سے باہر آئی۔ عانیہ پانی پینے اٹھی تھی۔ اسے اپنے کمرے کے دروازے میں گرا دیکھ کر یکدم اس کی طرف آئی۔
"ماما جلدی اٹھیں، آپی کو کچھ ہو گیا ہے۔" اس نے عبیرہ کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔ وہ جلدی سے باہر آئیں۔
علیکہ کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ عکرمہ کو کال کرنے کا وقت نہیں تھا۔
"گاڑی چلا لوگے؟" انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ سہلاتے ہوئے عفان سے پوچھا۔
"جی کوشش کرتا ہوں۔" وہ ان کے ساتھ مل کر اسے گاڑی تک لے آیا۔ علیکہ بے ہوش ہو رہی تھی۔ اپنے حواسوں کو قابو میں رکھتے ہوئے وہ اسے اسپتال لے آیا۔ اسے ایمر جنسی روم تک پہنچا کر عبیرہ نے عکرمہ کو کال کی۔
"ابھی آجاؤں۔" وہ بولا۔
"آجاؤ تو اچھا ہے۔" عبیرہ پریشان تھیں۔ "عانیہ اور عنیزہ کو اپنے بچوں کے پاس چھوڑ کر آجاؤ۔ ابھی عفان ہے میرے ساتھ۔" وہ بولیں۔
عکرمہ نے پہلے ان دونوں کو گھر سے لے کر اپنے گھر چھوڑا۔ دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے پھر فراٹے بھرتا ہوا اسپتال آگیا۔ علیکہ کی حالت بے حد نازک تھی۔
"پری میچور ڈلیوری ہے۔ بلڈ کی ضرورت ہوگی۔" لیڈی ڈاکٹر نے باہر آکر خبر سنائی۔ عکرمہ نے اسی وقت اسے بلڈ دیا۔ تقریباً رات کے دو بج رہے تھے جب لیڈی ڈاکٹر نے سفید کپڑے میں لپٹا وجود لا کر عکرمہ کے بازوؤں میں ڈال دیا۔
"مبارک ہو، اللہ نے بیٹی دی ہے۔" وہ نہ جانے عکرمہ کو کیا سمجھ رہی تھی۔ وہ سن رہ گیا۔ اس کیفیت سے وہ دوبار گزر چکا تھا۔ اپنے وجود کے ٹکڑے کو بازوؤں میں لے کر کھڑے ہونا کیا ہوتا ہے۔" یہ کوئی اس سے پوچھتا۔
"کاش تم اس وقت یہاں ہوتے۔" اسے عتبہ یاد آیا۔
صبح تک علیکہ کو ہوش آگیا۔
"مبارک ہو تمہیں بیٹی۔" اس نے دھیرے سے اس کی بیٹی اس کی گود میں ڈال دی۔
"اسے شاید پتا بھی نہیں ہوگا۔" علیکہ بلک بلک کر رو دی۔
"بس کرو، بے حس لوگوں کے لیے آنسو نہیں بہاتے۔" عکرمہ نے اسے حوصلہ دیا۔
"بس آج کے بعد نہیں روؤں گی اس کے لیے، بس اب چھوڑ دوں گی اسے۔" وہ اسے بے تحاشا چومتے ہوئے بولی۔

☆......☆

صبح کے پانچ بجنے والے تھے اور عتبہ کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔
"واقعی نہر میں نہ گر گیا ہو۔" اس نے پھر سرگوشی کی۔

"لیکن لاش تو ملتی۔ نہر اس قدر لمبی تو نہیں ہے کہ چند گھنٹوں میں بہا کر دور لے گئی۔" عرفان کو کچھ کھٹک رہا تھا۔
چودھری عدنان تھک ہار کر خالی ہاتھ واپس آگئے۔
"بابا! میرا عالیان کہاں ہے۔ اسے ساتھ کیوں نہیں لے کر آئے۔" عروج ان کے قدموں سے لپٹ گئی۔
"عروج وہ نہیں ہے وہاں۔" عارب نے بمشکل اسے قابو کیا۔
"تو کہاں گیا وہ۔" عروج چیخ پڑی۔
"لاش بھی نہیں ملی۔" عاصمہ ان کے پاس آئیں۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"ہو سکتا ہے اسے کوئی اسپتال لے گیا ہو بابا۔ آس پاس کے اسپتالوں میں چیک کروالیں۔" عروج ایک بار پھر ان کے پاس آگئی۔ عارب نے فوراً عرفان کی طرف دیکھا۔
"میں اور عارب چیک کر کے آتے ہیں۔" عرفان فوراً اسے لے کر باہر آگیا۔
"اس کا سارا سامان کہاں ہے۔" عرفان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔
"میرے پاس ہے۔" وہ بولا۔
"کمال ہے، وہ آخر گیا کہاں۔" عرفان پریشان تھا۔
"چھ گولیاں لگی ہیں اسے۔ زندہ کیسے بچ سکتا ہے۔" عارب اس کے مرجانے پر یقین تھا۔ تین چار گھنٹوں تک ان دونوں نے آس پاس کے تمام سرکاری اور پرائیویٹ اسپتال چھان مارے لیکن عتبہ کہیں نہیں ملا۔ وہ دونوں ناکام ہو کر واپس آگئے۔
نہ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔

☆......☆

وہ ان دونوں کی بھرپور فرمائش پر انہیں فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کروانے لے کر آیا تھا۔ ایک طرف بنے ڈانس فلور کو دیکھ کر عینا مچل گئی۔
"بابا ڈانس کریں۔" وہ بے پناہ پرجوش ہو کر بولی۔
"تو کر لو، جاؤ۔" وہ بولا۔
"نہیں بابا اکیلے کرنا ہے۔" وہ بولی۔
"اکیلے مطلب......؟" وہ سمجھ نہ سکا۔
"ان سب سے کہیں وہاں سے ہٹ جائیں۔" وہ ڈانس کرتے ہوئے کپلو کو دیکھ کر بولی۔
"بیٹے ایسے تھوڑی ہوگا۔ ڈانس فلور ہمارا تھوڑی ہے۔" وہ بولا۔
"پاپا پلیز، تھوڑی دیر کے لیے یہ صرف مجھے خرید دیں۔ پلیز بس دس منٹ۔ میں نے اکیلے یہاں ڈانس کرنا ہے۔" عینا کی خواہش سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔
"بیٹے یہ خریدا نہیں جاتا۔"
"پاپا پلیز، میرا بہت دل کر رہا ہے۔" اس کی خواہش اس کے چہرے پر چمک رہی تھی۔ بار بار وہ مڑ کر اس طرف دیکھ رہی تھی۔
"میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کر لو ڈانس۔" وہ بولا۔
"نہیں اکیلے کرنا ہے۔ آپ میری تصویریں کھینچنا۔" اس نے بڑے جوش سے اس کی گردن میں بازو ڈال دیئے۔

"پاپا میں بھی کروں گا۔" عرش بھی آخر بچہ تھا۔

"پلیز پاپا بس دس منٹ۔" وہ ان دونوں کے معصوم چہرے دیکھ کر رہ گیا۔ اس قدر شدت سے یہ عینا کی پہلی خواہش تھی۔

"پاپا! آپ بہت اچھے پاپا ہیں۔" وہ اس کی گود میں ہی چڑھ گئی۔

وہ اسے گود میں لیے کاؤنٹر پر آ گیا۔

"دس منٹ کے لیے یہ ڈانس فلور بالکل خالی مل سکتا ہے۔" اس نے اپنی انتہائی عجیب فرمائش مینیجر کے گوش گزار کی۔

"سوری سر! ہم ان لوگوں کو منع تو نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے کسٹمر ہیں۔" اس نے معذرت کر لی۔

"بس تھوڑی دیر پاپا۔" عینا پھر بولی۔

"آپ قیمت لینا چاہیں تو لے لیں۔" وہ پھر بولا۔ بڑی دیر سوچ بچار اور آپس میں ڈسکشن کے بعد مینیجر اس کے پاس آیا۔

"70 ہزار۔ 10 منٹ کے لیے۔" وہ ایک لمحے کو سن رہ گیا۔ "اس سے کم نہیں سر، ہم ایک منٹ سے 10 ہزار کما لیتے ہیں۔" وہ بولا۔

وہ عینا کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتے نہ دیکھ سکا۔ ان دونوں کو لے کر ATM آیا۔ پیسے نکلوائے اور کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر واپس آ گیا۔

"یہ لیں۔" اس نے 70 ہزار انہیں دے دیے۔ مینیجر اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس لمحے وہ اسے بالکل پاگل لگا۔

"تھینک یو پاپا۔ آپ بہت اچھے ہیں۔" عینا اور عرش اس کے گال چوم کر ڈانس فلور کی طرف بھاگے۔

"پاپا گانا لگوائیں وہ والا نہ نہ نہ نہ۔" عینا کی آواز کھنک رہی تھی۔

"گانا لگا دو بھئی۔" وہ بولا۔

"پاپا تصویر بنائیں۔ ویڈیو بھی بنائیں۔" دونوں بے حد پرجوش ہو رہے تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے ان دونوں کی بے تحاشا تصویریں بنا ڈالیں۔ دونوں ڈانس میں مگن تھے۔ عوریہ کے ہمراہ اندر آتی عشوہ ٹھٹک گئی۔

"ارے عکرمہ......!" عوریہ نے اس کا نام لیا اور پھر ایک دم اس کی طرف بڑھی۔ عشوہ نے اسے روکا۔

"بات سنیں پلیز۔" اس نے پاس سے گزرتے ویٹر کو روکا۔

"یہ ڈانس فلور بک کروایا ہے کسی نے؟" اس نے پوچھا۔

"یس میم۔ ان صاحب نے اپنے بچوں کی فرمائش پر ستر ہزار دیے ہیں۔" سارے ہوٹل میں بات پھیل گئی تھی۔ عشوہ دنگ رہ گئی۔ وہ کسی صورت ایسا نہ کرتی۔ نہ اسے کرنے دیتی۔ وہ اسے گھورتی ہوئی عکرمہ کی طرف آ گئی۔

"واہ ہیرو! کہاں سے آئے اتنے پیسے۔" عوریہ بولی۔

"ڈاکا مارا ہے۔" عکرمہ ہنسا۔

"یہ ہی حال رہا لٹانے کا تو ڈاکوں کی ہی نوبت آ جائے گی۔" عوریہ نے اسے گھرکا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم عکرمہ۔" عشوہ اس کے آگے آ کھڑی ہوئی۔ عینا پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ آ کر عکرمہ کی گود میں چڑھ گئی تھی۔

"دس منٹ میں تم نے ستر ہزار اجاڑ دیے۔ ایسے پالو گے اپنے بچوں کو۔ مہینے کے آخری دنوں میں بھیک مانگنے کی نوبت آ جائے گی۔" اس نے اچھی خاصی بے عزتی کر دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا عرش بول پڑا۔

"ماما آپ پاپا کو نہ ڈانٹیں، آپ کون سا ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ آپ نے کون سا پاپا کو معاف کر دیا۔ اب ہم جو مرضی کریں۔" وہ سات سال کا بچہ اسے چپ کروا گیا۔

"یہ سکھا رہے ہو تم انہیں۔" یہ قصور بھی اسی کا نکلا۔

"اسے کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں ہے عشوہ۔ اکیسویں صدی کے بچے ہیں یہ۔ خود ہی سمجھ جاتے ہیں۔" عوریہ اسے دیکھ کر بولی۔

عکرمہ چپ چاپ عینا کو گود میں اٹھا کر عرش کی انگلی پکڑ کر باہر نکل گیا۔

☆......☆

آج اسے غائب ہوئے چار دن ہو گئے تھے۔ نہ وہ خود ملا اور نہ اس کی لاش۔ چودھری عدنان نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا۔ ہر اسپتال، ہر سرد خانہ، ہر قبرستان لیکن وہ نہیں ملا۔ نہ زندہ نہ مردہ۔ عروج کو رو رو کر بھی صبر نہیں آ رہا تھا۔ عاصمہ اسے خود سے لگائے بیٹھی تھیں جب وہ اور عارب اندر داخل ہوئے۔

"اماں اس نے کچھ کھایا؟" عارب اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"نہیں، بڑی مشکل سے صرف چند گھونٹ پانی کے حلق سے اتارے ہیں۔" عاصمہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولیں۔ عارب کو اس کا اس قدر اجڑا ہوا وجود دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔

"وہ کہیں نہیں مل رہا عاصمہ۔" چودھری عدنان تھکے ہوئے انداز میں بولے۔

"عدیل سے کوئی رابطہ ہوا۔" انہوں نے عارب کی طرف دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"میں سوچ رہا تھا اس کی غائبانہ نماز جنازہ......" عروج نے ایکدم ان کی بات کاٹ دی۔

"بابا جان! آپ نے اس کی لاش دیکھی ہے کیا؟ آپ کو کیسے پتا کہ وہ مر گیا ہے۔" وہ زور سے بولی۔

"لیکن بیٹا زخمی حالت میں بھی نہیں ہے وہ۔ مسلسل اس کی تلاش جاری ہے لیکن وہ نہیں مل رہا۔ اب ایسے حالات میں کیا کریں۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"تھوڑا اور انتظار کر لیں بابا شاید وہ آ جائے۔" وہ بے بسی سے رو پڑی۔ چودھری عدنان چپ ہو گئے۔

مزید ایک ہفتہ گزر گیا لیکن وہ واپس نہ آیا۔ سو آپس کے مشورے اور امام مسجد کے فتوے کے مطابق اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کر دی گئی۔

☆......☆

"مام مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" وہ رات کا کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

"ہاں کہو۔" وہ بولیں۔

"میں اپنے پرانے گھر میں شفٹ ہونا چاہ رہی تھی۔" اس کے کہتے ہی عبیرہ دنگ رہ گئیں۔

"یہاں کیا تکلیف ہے تمہیں۔" وہ بولیں۔

"یہ گھر میرا نہیں ہے مام۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"میرا بھی نہیں ہے لیکن میں بھی تو رہ رہی ہوں نا اور جس کا ہے وہ کم از کم تمہیں یہاں رہنے پر کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہے گی۔" انہیں غصہ آ گیا۔

"مام یہاں رہ کر مجھے لگتا ہے جیسے میں آپ پر بوجھ ہوں۔" وہ بولی۔ "ساری زندگی میں نے ایسے گزاری ہے

کسی کا سہارا لیے بغیر...... کسی کا ساتھ لیے بغیر......اب عجیب سا لگتا ہے آپ سب پر ایک بوجھ بن کر رہنا۔ ویسے بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ میں عیشا کو آپ کے پاس تو نہیں چھوڑ سکتی نا۔ اسے ساتھ لے جایا کروں گی۔ عانیہ اور عنیزہ نے کالج جانا ہوتا ہے۔" وہ کہتی چلی گئی۔

"دیکھو علیکہ تم بے شک اپنی بچی کو ساتھ لے جایا کرنا۔ میرا احسان نہیں لینا چاہتیں تو نہ لو لیکن یہاں رہنے میں کیا ہے۔" وہ بولیں۔

"پلیز مام...... میں ایک دو ہفتوں تک پرانے فلیٹ میں شفٹ ہو رہی ہوں۔ میری کچھ سیونگز بھی پڑی ہیں۔ ایک دو سالوں تک اسے خرید لوں گی۔ ابھی تو عفان چھوٹا ہے لیکن جب آپ اس کی شادی کر دیں گی تو اس کی بیوی کہاں برداشت کرے گی مجھے۔ ٹھوکر کھا کر باہر نکلنے سے بہتر ہے ابھی اپنی مرضی سے نکل جاؤں۔" وہ بولی۔ وہ چاروں چپ چاپ سنتے رہے۔

"اسے آفس ساتھ لے جا کر کیسے پالو گی۔"

"وہ بھی عینا کو بیلٹ لگا کر ساتھ لے جایا کرتا تھا۔" علیکہ دھیرے سے ہنسی۔

"مرضی ہے تمہاری۔" انہوں نے کندھے اچکائے اور ایک ہفتے بعد عکرمہ کے بھرپور منع کرنے کے باوجود وہ عیشا کو لے کر اپنے پرانے فلیٹ میں شفٹ ہو گئی۔

☆......☆

"میں کل لاہور جا رہا ہوں۔ ہیڈ آفس جا کر اطلاع کرنی ہے عتبہ کے مرنے کی۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے ڈیوٹی سے غائب ہوئے۔" عارب دھیرے سے کہتا ہوا اپنے بستر کی طرف آ گیا۔

"بالکل نارمل انداز سے بتانا سب کو۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں کسی کو پتا ہے عروج اور عتبہ کی شادی کا؟" عرفان نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" عارب نے کندھے اچکائے۔

"پتا بھی ہو تو زیادہ بحث نہ کریں بس چپ چاپ رضوی صاحب کو بتا کر واپس آ جائیں۔" عرفان نے پھر کہا۔ عاطف یا علیکہ کے پاس زیادہ دیر رکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ علیکہ کچھ پوچھے بھی تو بس ٹال مٹول سے کام لینا۔ زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔" عرفان اسے بار بار سمجھا رہا تھا۔

"یار میں حیران ہوں آخر وہ کہاں گیا؟" عارب کچھ دیر بعد بولا۔

"بس دعا کرو واپس نہ آئے۔" عرفان آگے کی سوچ رہا تھا۔

"بہت برے پھنسیں گے اگر وہ واپس آ گیا تو۔" عرفان دھیرے سے بولا۔ عارب چپ چاپ لیٹ گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆......☆

"تو آخر تم نے اپنی ضد پوری کر لی۔" وہ آج اس سے ملنے آئی تھیں۔

"ضدی جو ٹھہری اس لیے۔" وہ عیشا کو انہیں پکڑاتے ہوئے بولی۔ کچھ دیر وہ اسے گود میں لیے اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"یہ کس پر چلی گئی؟"

"آپ کے بیٹے پر۔" وہ مسکرا کر بولی۔ عروہ چونک گئیں۔

"یہ ہو بہو عتبہ جیسی ہے۔ ہے ناں؟" اب کے اس نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یعنی وہ تمہیں ابھی تک یاد ہے۔" وہ اسے لے کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"اسے میں مر کر بھی نہیں بھلا سکتی۔" وہ ان کے لیے چائے بنانے لگی۔

"وہیں ہے اب تک۔" انہوں نے پوچھا۔ وہ اس کی دوسری شادی کے بارے میں جانتی تھیں۔

"شاید۔" وہ کندھے اچکا گئی۔

"اب کیا کرو گی تم۔" انہوں نے پھر پوچھا۔

"جو آپ نے کہا تھا۔" وہ انہیں چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے بولی۔

"آپ نے ہی کہا تھا نا کہ زبردستی اسے نہ روکو۔ تو بس میں خود ہی اسے آزاد کر دوں گی۔ ایک دو دنوں تک اسے طلاق کا نوٹس بھجوا دوں گی۔" وہ بولی۔

"اس کا کیا ہو گا۔" وہ بولی۔

"جو میرا ہوا۔" وہ بولی۔

"ہر بچہ خوش قسمت نہیں ہوتا کہ ماں اور باپ دونوں کی محبتیں حاصل کر سکے۔ کچھ اس جیسے کم نصیب بھی ہوتے ہیں جنہیں دونوں میں سے کسی ایک کا پیار ملتا ہے۔ بس اسی پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ عرش اور عینا کو باپ کا مل رہا ہے۔ اسے صرف ماں کا مل جائے گا۔" وہ بولی۔

"یہ بھی بہت ہے کہ ایک کا تو مل جائے گا۔ بہت سوں کو دونوں میں سے کسی کا بھی نہیں ملتا۔ شاید تبھی وہ عتبہ جیسے ہو جاتے ہیں۔" عروہ دھیرے سے بولیں۔

"یہ شاید قسمت کی بات ہے۔" وہ کپ خالی کرتے ہوئے بولی تھیں۔

☆......☆

وہ آج کسی کو بتائے بغیر اس سے ملنے چلی آئی تھی۔

"تم یہاں!" عوریہ اسے دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"میں عشوہ سے ملنے آئی ہوں۔" وہ بولی۔ عوریہ اس کے آنے کا مقصد سمجھ گئی۔

"مل لو ویسے فائدہ کوئی نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"وہ ضد نہیں کر رہی جو تم اسے منا لو گی۔ ناراض ہو کر بھی نہیں بیٹھی کہ تمہاری باتیں سن کر مان جائے گی۔ اس کا دل بھر گیا ہے عمایہ۔ اس کے دل سے عکرمہ کی محبت کا آخری قطرہ بھی اڑ گیا ہے۔ بے حس ہو گئی ہے وہ۔" عوریہ درست کہہ رہی تھی۔

"عکرمہ کو مت بتانا کہ میں یہاں آئی تھی۔" وہ عاطف کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے آفس کی طرف آ گئی۔

"تم مصروف تو نہیں ہو۔" اس نے دھیرے سے پوچھا۔ عشوہ اسے دیکھ کر بالکل حیران نہ ہوئی۔

"آؤ عمایہ!" وہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اتنا سنگین جرم تو نہیں ہے کہ تم پھانسی چڑھانے پر تلی ہوئی ہو۔" عمایہ دھیرے سے بولی۔

"آج اگر عکرمہ کی جگہ عینیہ اور تمہاری جگہ میں ہوتی تو تم اسے پھانسی پر نہ چڑھاتیں۔" عشوہ بولی۔

"وہ اگر مجھ سے سو دفعہ معافی مانگتا تو میں معاف کر دیتی۔" عمایہ دھیرے سے بولی۔

"سب تمہارے جیسے نہیں ہوتے۔" عشوہ نے کندھے اچکائے۔

''تمہارے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں عشوہ۔ ان کے صدقے ہی اسے معاف کردو۔'' عمایہ آگے کو ہوئی۔

''تم اس کی سفارش لے کر آئی ہو؟''

''ہاں۔'' عمایہ فوراً بولی۔

''اس کا جرم پتا ہے تمہیں؟ بے وفائی.....!'' عشوہ آگے کو ہوئی۔

''اسے بے وفائی نہیں کہتے یار، اسے بہک جانا کہتے ہیں اور بہک جانے کی سزا پھانسی نہیں ہوتی۔'' عمایہ بولی۔

''بہک جانا ایک بار ہوتا ہے عمایہ عادل۔ وہ بھی غلطی سے، بار بار نہیں ہوتا۔'' عشوہ نے کہا۔

''میں نہیں جانتی عمایہ کہ تمہارے دل میں اس کے لیے کیا ہے۔ یا کچھ ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اس شخص کے دل میں ایک دفعہ نہیں ہزاروں دفعہ اتر کر دیکھا ہے میں نے۔ وہاں ہر طرف صرف تم ہو۔ اس کی پلکوں کے نیچے نہ جانے کتنے چکر لگائے ہیں میں نے۔ تمہارے علاوہ کوئی نہیں ملا، جن راتوں میں اس کے بازوؤں میں صرف میں ہوتی تھی ان میں اب صرف تمہاری یادیں ہوتی ہیں اس کے پاس جنہیں زبردستی سگریٹ کے دھوئیں میں اڑاتا ہے وہ۔ میں نے ایک دم سے بھاگی کی سزا نہیں سنائی اسے۔ بہت انتظار کیا اس کے سنبھل جانے کا، اس کے لوٹ آنے کا اور وہ لوٹ بھی آیا لیکن کس حالت میں.....؟ نہ اس کے پاس دل تھا نہ دھڑکنیں۔ خالی ہاتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ سر سے لے کر پاؤں تک تمہاری چاہت میں بھیگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں تم تھیں اور دیکھ مجھے رہا تھا۔ وہ میرا نہیں رہا تھا عمایہ۔ وہ تمہارا ہو گیا تھا۔'' عشوہ کہتی چلی گئی۔

''تمہارا ہوا عکرمہ نور میں کیسے لے لوں، کیسے؟'' وہ ضد سے بولی۔

''اگر میرا ہے بھی تو میں نے کون سا لے لیا۔'' عمایہ بولی۔

''تم لو یا نہ لو تمہاری مرضی لیکن میں نہیں لوں گی۔ اب نہیں لوں گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز سے بولی۔ ''میں کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی جس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر کسی اور سے محبت کا دعویٰ کیا ہو۔'' وہ بولی۔

''تم شاید بھول گئیں کہ تم نے اس سے محبت کی تھی۔'' عمایہ بولی۔

''ہاں لیکن تب جب اس نے بھی کی تھی۔'' وہ زور سے بولی۔ ''اور اب یہ مت کہنا کہ وہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جو وہ مجھ سے بولتا ہے۔'' عشوہ فوراً بولی۔ عمایہ چپ رہی۔

''میں جانتی ہوں عمایہ کہ تمہارے آفس کے لوگ تمہیں کیا کہا کرتے تھے۔ عکرمہ کی ویگل۔ جو اسے ہر کیس جتوا دیتی ہے۔ لیکن معاف کرنا تم اسے اس بار نہیں جتا سکو گی۔'' عشوہ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

''تمہیں اپنے بچوں پر بھی ترس نہیں آتا۔'' عمایہ کچھ دیر بعد بولی۔

''وہ عکرمہ سے زیادہ اچھے ہیں۔ اچھی طرح پال لے گا انہیں۔'' عشوہ واقعی بے حس ہو رہی تھی۔

''ایک بات کہوں تم سے۔ آج کل کے دور میں اگر شوہر شادی کے بعد دوسری محبت میں مبتلا ہو جائے اور وہ بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ اس میں دل اور محبتیں اتنی ہی سستی ہیں لیکن اگر کوئی شخص دوسری بار محبت کرنے کے باوجود پلٹ کر پہلی بیوی کے پاس واپس آجائے چاہے مجبوری سے ہی سہی چاہے بچوں کی خاطر ہی سہی چاہے اس لیے ہی سہی کہ اسے دوسری محبت مل نہیں سکی تو یہ بڑی بات ہوتی ہے عشوہ کیانی۔ عورتیں تو وفا کر ہی لیتی ہیں یہ ان کی فطرت ہے لیکن اگر مرد نادم ہو کر وفا کرنا چاہے تو یہ بڑی بات ہوتی ہے۔ عورتیں تو سمجھوتہ کر ہی لیتی ہیں۔ بھی اولاد کی خاطر بھی زمانے کی باتوں کی خاطر بھی اپنے گھر کی خاطر لیکن اگر یہ ہی سمجھوتہ شوہر کرے تو بڑی بات ہوتی ہے چیئرمین صاحبہ۔

تم سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتیں نہ کرو۔ تم اپنے بچوں پر ترس نہیں کھانا چاہتیں تو بے شک نہ کھاؤ۔ تمہیں اپنے بے وفا شوہر پر یقین نہیں ہے تو بے شک نہ کرو لیکن اس کے بے پناہ اجلے اور صاف ماضی کے طفیل ہی اسے معاف کردو۔ ان لمحوں کے صدقے اس کا جرم نظر انداز کردو جن میں وہ صرف تمہارا تھا۔ جن میں تمہاری خاطر نہ جانے کس کس کو ٹھکرا دیا اس نے۔'' عمایہ آخر کہہ گئی۔

کس کس کو ٹھکرا دیا؟'' عشوہ آگے کو ہوئی۔

''شاید اسے جس کی وجہ سے اب خوار ہو رہا ہے اور شاید اسے جس کی خاطر اب زمانے کو دشمن بنا چکا ہے اور شاید اسے جس کی وجہ سے تم اسے معاف نہیں کر رہیں اور شاید اسے جس کی وجہ سے وہ اپنے دونوں بچوں کو تنہا پالنے پر مجبور ہے۔'' عمایہ کو اندازہ نہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر رہی ہے۔

''تمہاری خاطر کس کس سے لڑا وہ بھی تو یاد کرو۔ اپنے باپ سے الجھ پڑا۔ عینیہ سے دشمنی مول لی تمہارے ڈیڈ کے آگے کھڑا ہو گیا۔ تمہیں ہار کر سکون کا سانس لیا تھا نا اس نے۔ پانچ سال صرف تمہارا ہو کر جیا۔ ان پانچ سالوں کی خاطر درگزر کر دو اس کی غلطی۔'' عمایہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔

''وجہ پتا کیا ہے عمایہ؟ میں ایک بیوی اور ایک ماں بعد میں ہوں اور ایک عورت پہلے.....شوہر کو الگ ہوتا دیکھ سکتی ہوں دور ہوتا بھی دیکھ سکتی ہوں لیکن دو حصوں میں بٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔'' وہ بولی۔ عمایہ چپ رہ گئی۔ ''اس کی وفاؤں کے پانچ سال میرے سر آنکھوں پر لیکن میں ایک ایسے شخص کو معاف نہیں کر سکتی جس نے میرے ہوتے ہوئے دوسری محبت کر لی ہو۔'' بہت ساری عورتیں کر دیتی ہوں گی۔ بہت ساری نہیں کرتیں میں دوسری قسم سے ہوں۔ میرے لیے عورت ہونا پہلے ہے ماں یا بیوی ہونا بعد میں۔'' وہ کہہ گئی۔

عمایہ کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اس بار وہ واقعی عکرمہ کو نہیں جتا سکی۔ کچھ دیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی پھر باہر آگئی۔

☆.....☆

دن کے تقریباً دس بج رہے تھے جب وہ رضوی برادرز میں داخل ہوا۔ اسے سب سے پہلے عکرمہ نے دیکھا۔ وہ بھی اسے عاطف کی سیٹ پر بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تم یہاں!'' وہ اس کے پاس آکر بولا۔

''کیوں اگر عتبہ یہاں سے جا سکتا ہے تو میں یہاں آ نہیں سکتا کیا؟'' عکرمہ بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''رضوی صاحب ہیں اندر.....'' اس نے پوچھا۔

''کیوں خیر ہے؟ تمہیں بھی سناؤ جو انہیں سنانے آئے ہو۔'' عکرمہ نے اسے وہیں گھیر لیا۔ حلیکہ بھی اس کی آواز سن کر باہر آگئی۔

''کیسے ہو عارب۔'' وہ اس کی طرف آتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے خود کو نارمل رکھا۔

''اور تمہارا بہنوئی کیسا ہے۔'' عکرمہ مسلسل اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''وہ دراصل.....کچھ دن پہلے عتبہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔'' عارب نے ان کے سروں پر دھماکا کیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

ستارہ احمد

شام ڈھلے

''السلام علیکم!'' سمیع نے کمرے میں داخل ہوتے ہی تیز آواز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ کہاں ہوتے ہو یار، آج کل نظر ہی نہیں آتے۔'' فرحان نے تیزی سے لیپ ٹاپ پر انگلیاں چلاتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''میں تو یہیں ہوں۔ چودھویں کا چاند تو آپ بن گئے ہیں۔'' سمیع دھڑام سے فرحان کے پاس بیٹھا۔

فرحان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کہاں ہونا ہے یار؟ آفس سے گھر اور گھر سے آفس۔ ملا کی دوڑ مسجد تک ہی۔ یہی ہے ہماری زندگی۔'' فرحان نے لیپ ٹاپ کو شٹ ڈاؤن کیا اور جگمگاتی اسکرین غائب ہوگئی۔

''کیا کرتے ہیں آپ آفس میں؟'' سمیع نے شرارتی نظروں سے فرحان کو دیکھا۔

''کام کرتا ہوں۔'' ناسمجھی سے جواب آیا۔

''کون سا کام؟'' سمیع نے شرارت سے پوچھا اور بھاگنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''شریر کہیں کے۔'' فرحان نے بھی بچوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑ لگادی۔

''بھائی میں ہاتھ نہیں آنے کا۔'' سمیع نے آنکھیں نچائیں اور صوفے رکھا کشن فرحان کی جانب پھینکا۔

فرحان نے کشن کیچ کر کے واپس صوفے پر رکھا اور خود بھی وہیں ڈھے گیا۔

''کیا ہوا، تھک گئے نا؟'' سمیع نے سوال کیا اور پھر دلاسا دینے والے انداز میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ بوڑھے لوگ جلدی تھک جاتے ہیں۔''

''بوڑھا ہوگا تیرا بھائی۔'' فرحان نے بے خیالی میں جواب دیا۔

''تو میں نے کیا کہا ہے؟'' سمیع نے معصومیت سے سوال کیا۔

سمیع کی بات سمجھ آنے پر فرحان نے اسے گھورا۔

''صبر کر دتم تو۔'' فرحان نے اُٹھ کر سمیع پر چھلانگ لگادی۔ سمیع اس حملے کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔ وہ اچانک سامنے سے ہٹا اور فرحان زمین پر جا گرا۔

''آہ!'' فرحان کے منہ سے ہلکی سے کراہ نکلی۔

''بھائی۔'' سمیع پریشانی سے فرحان کی جانب تیزی سے آیا اور اپنا پاؤں پکڑے بیٹھے فرحان سے پوچھا۔ ''زیادہ لگ گئی ہے کیا؟''

''نہیں۔ بس ہلکی سی موچ آگئی ہے پاؤں میں۔'' فرحان نے اپنا پاؤں دھیرے سے دباتے ہوئے کہا۔

''سوری بھائی۔'' سمیع نے اپنے کان پکڑے۔

''کوئی بات نہیں چھوٹو۔'' فرحان نے پیار سے سمیع کو گلے لگایا اور تسلی دی۔

''ویسے بھائی ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں پوچھو نا!'' فرحان نے خوش اخلاقی سے اجازت دی۔

''مزا آیا۔'' سمیع نے شرارت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ اور فرحان ہنس دیا۔

''چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے لیکن یہ شریر کبھی نہیں سدھرے گا۔'' فرحان نے ہنستے ہوئے سمیع کو ایک چپت لگائی۔

''بھائی ویسے بھی۔ اب سدھر کر کرنا کیا ہے؟'' سمیع نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ فرحان کوئی جواب دیتا فراز صاحب کی آواز آئی۔ ''اگر دونوں بھائیوں کے ہنسی ٹھٹھے ختم ہو گئے ہوں تو دونوں کھانے کی ٹیبل پر تشریف لے آئیں۔''

سمیع نے فرحان کی جانب ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا اور پھر دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے ٹیبل کی

جانب بڑھ گئے۔

☆.....☆

ایسا ہی تھا دونوں بھائیوں کا پیار۔ دونوں جیسے ایک دوسرے کے بنا ادھورے تھے۔ دونوں کی ایک دوسرے میں جیسے جان تھی اگر ایک کو ذرا سی بھی چوٹ لگتی تو دوسرا بے چین ہو جاتا۔ فراز صاحب اپنے آپ کو خوش نصیب قرار دیتے کہ اللہ پاک نے انہیں ایسے فرمانبردار بچے عطا کیے ہیں۔

فراز صاحب اور زبیدہ بیگم کے بس یہی دو بچے تھے اور ان دونوں میں ان کی جان تھی۔ فرحان تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب ایک کمپنی میں اچھی پوسٹ پر جاب کر رہا تھا جبکہ سمیج ابھی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔ سمیج کا شمار یونیورسٹی کے ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ ماں، باپ کا لاڈلا اور بھائی کی جان تھا وہ۔

☆.....☆

"بس مما بس۔" سمیج ٹوسٹ کا آخری پیس زبردستی منہ میں ٹھونستے ہوئے بولا۔

"تم نے ابھی کھایا ہی کتنا ہے بیٹا جو بس بس کرے جا رہے ہو۔" زبیدہ بیگم نے سمیج کو ڈپٹتے ہوئے کہا۔ فرحان بے اختیار ہنس پڑا اور پھر بولا۔

"مما اس کے اوپر تو کھانا پینا حرام لگتا ہے۔" زبیدہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

"ہاں۔ ہاں ہنستے رہیں آپ لوگ میں جا رہا ہوں یونیورسٹی۔" سمیج نے منہ بنایا۔

"اچھا۔ یہ آخری ٹوسٹ لے لو۔" زبیدہ بیگم بولیں۔

"نہیں مما، بس اور نہیں۔ زیادہ کھاؤں گا تو پیٹ بڑھ جائے گا اور پیٹ بڑھ جائے گا تو موٹا ہو جاؤں گا اور موٹا ہو گیا تو آپ بولو گی۔ ہائے اللہ میرا بچہ کیوں پھولتا جا رہا ہے۔"

زبیدہ بیگم نے سر پکڑ لیا۔ "تم سے بحث میں کوئی نہیں جیت سکتا۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" سمیج نے جلدی جلدی شوز پہنتے ہوئے کہا۔

"یہ آخری پیس لے لو نا سمیج۔ مما کتنے پیار سے بول رہی ہیں اگر تم نہیں کھاؤ گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔" فرحان نے اپنا ٹوسٹ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"ارے بھائی۔ کھا رہا ہوں نا۔ ایک تو آپ ذرا ذرا سی بات پر سیریس ہو جاتے ہیں۔" سمیج نے کہا اور ٹوسٹ اٹھا کر باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ زبیدہ بیگم ایک اور ٹوسٹ پکڑا دیتیں۔

سمیج کی اس حرکت پر فرحان، زبیدہ بیگم اور وہاں موجود فراز صاحب (جو پہلے ہی سمیج کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے) ہنس پڑے۔

☆.....☆

سمیج نے احد کو دور سے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔

"یار، سیمسٹر ختم ہونے پر فنکشن ہو رہا ہے۔ اناؤنسمنٹ ہو گئی ہے۔ سر افغان مجھے حاضری دینے کے لیے بلا رہے ہیں۔" احد نے پاس آتے ہی ایک سانس میں ساری بات بتا دی۔

"یار اس بار تو میرا موڈ نہیں کسی چیز میں پارٹیسپیٹ کرنے کا۔" سمیج نے کہا۔

"ایسا کہنا بھی مت۔" احد نے آنکھیں نکالیں۔ "چلو اٹھ سر کے پاس۔" احد بازو سے پکڑ کر سمیج کو کھینچتے ہوئے لے گیا۔

☆.....☆

"سر اس بار تو میرا کوئی ارادہ نہیں participation کا۔" سمیج نے بیچارگی سے کہا۔

"ایسا بالکل بھی نہیں ہونا چاہیے بیٹا۔ آپ شروع سے کسی نہ کسی چیز میں حصہ لیتے آئے ہو۔ اس بار بھی آپ کو حصہ لینا پڑے گا۔" سر افغان نے صاف کہا۔

"میں آپ کا نام تقریر والے پورشن میں لکھ رہا ہوں۔ آپ انگلش ڈپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹ ہو تو آپ انگلش میں کسی ٹوپک پر اسپیچ (speech) دیں۔"

"اوکے سر۔" سمیج نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

☆.....☆

زور و شور سے فنکشن کی تیاریاں جاری تھیں۔ یونیورسٹی کے ہر ڈپارٹمنٹ سے طلبہ و طالبات نے مختلف ایکٹی ویٹیز میں حصہ لیا۔ سب کی تیاری قابلِ دید تھی۔ سب سے پہلے تمام حاضرین کو ویلکم کیا گیا۔ پھر سب نے اپنے اپنے طریقے سے فنکشن کو قابلِ دید بنا دیا۔ اسٹیج ڈراموں نے بھی سب پر اپنا اثر چھوڑا جن میں اوتھیلو، جو دھا اکبر، سسی پنوں اور بھی کئی ڈرامے شامل تھے۔ انگلش اور اردو ڈیبارٹمنٹس کے اسٹوڈنٹس نے تقاریر کر کے جیسے ماحول گرما سا دیا۔ سمیج نے تالیوں کی گونج میں اپنی تقریر کا اختتام کیا جو کہ

learning of "Benefits
language"English پر تھی۔

اس کے بعد اردو ڈپارٹمنٹ سے ایک طالبہ کا نام پکارا گیا۔ "ہانیہ نثار احمد" جو کہ کتب خانوں کی اہمیت و افادیت کے بارے میں عرض کرنے والی تھی۔

ہانیہ نے اسٹیج پر آتے ہی اپنی دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ حاضرین کی جانب دیکھا اور پھر سلام سے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ سمیج کو ایسا لگا جیسے اس کے آس پاس جلترنگ سے بج اٹھے ہوں۔ وہ لڑکی اپنی مثال آپ تھی۔ اس کے لہجے کے انداز نے سب کو باندھ سا دیا تھا۔ سمیج فراز یک ٹک اسے ہی دیکھے جا رہا تھا جیسے نگاہوں کی راہ سے اس حسین لڑکی کو دل میں بسا لینا چاہتا ہو۔

وہ اپنی تقریر ختم کر کے اسٹیج سے جا چکی تھی اور نہ جانتے ہوئے سمیج فراز احمد کا دل بھی لے گئی تھی۔

☆.....☆

آج فنکشن ختم ہوئے تیسرا دن تھا اور روز کی طرح سمیج کے قدم اردو ڈپارٹمنٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ خود نہیں جانتا تھا اسے ہوا کیا ہے۔ آخر کیوں وہ اس لڑکی کی پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ کیوں وہ اسے ہی دیکھتے رہنا چاہتا ہے۔ سنا تھا اردو ڈیپارٹمنٹ میں وہ کوئی نئی لڑکی تھی۔ اپنے ہی خیالوں میں وہ اردو ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور سامنے سے تیزی سے آنے والے سے ٹکرا گیا۔ جب نظر اٹھائی تو جیسے پتھر کا ہو گیا۔ سامنے وہی تھی جو انجانے میں سمیج کی دھڑکن جان بن بیٹھی تھی۔ اس نے سمیج پر ایک نظر ڈالی اور معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ سمیج کو ہوش کب تھا جو اس کی معذرت کا جواب دیتا۔ وہ وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

☆.....☆

وہ اتنی کوئی حور پری نہ تھی۔ نہ اس کی نشیلی آنکھیں تھیں نہ صراحی دار گردن لیکن وہ پھر بھی دیکھنے والے کو دوسری نظر ڈالنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ بلاشبہ اس کی آواز بہت حسین تھی۔ جو ایک پل میں ہی سمیج کے سینے میں سے دل نکال کر چل دی تھی۔ وہ بے خبر تھی سب سے زیادہ بے چینی کی بات تو یہی تھی۔ اب اسے خبر کون دیتا۔ یہ سمیج کے بس کی بات تو نہ تھی۔

☆.....☆

وقت کا کام ہے گزرنا سو وہ گزرتا چلا گیا۔ سمیج فائنل ایئر بھی مکمل ہو گیا جو جیسا تھا وہ ویسا ہی رہا۔ سمیج اپنے دل کی چوری کی بات اس کے سامنے نہ کر سکا۔

ایک دن کھانے کی ٹیبل پر زبیدہ بیگم، فراز صاحب سے بولیں۔ "سنیے امیر! خیال ہے اب ہمیں فرحان کی شادی کر دینی چاہیے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے بیگم۔" فراز صاحب نے ان کی تائید کی۔

"بھائی کی شادی۔" سمیج کھانا کھاتے ہوئے

بولا۔

"ہاں۔ اب تو ہو ہی جانی چاہیے۔" زبیدہ بیگم نے جواب دیا۔

"کتنا مزا آئے گا مما۔" سمیع خوشی سے بولا۔

"ہاں مزا تو آئے گا۔ کیونکہ میرے بعد اس کی شادی بھی تو ہونی ہے۔ مما سمجھ رہی ہیں نا آپ اس کی خوشی کا مطلب۔" فرحان جواب تک خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا مسکرا کر گویا ہوا۔

"پہلے تو بھابی ہی آئیں گی نا بھائی۔" سمیع بھی کم نہ تھا۔ وہ بھی شوخ ہوا۔

"اب تو آپ کے دوست بھی کافی وقت سے امریکا سے پاکستان شفٹ ہو چکے ہیں۔" زبیدہ بیگم، فراز صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں۔ ان شاء اللہ دو تین دن میں چلتے ہیں ان کی طرف۔" فراز صاحب نے کہا۔

"پاپا۔ بھابی بھی ڈھونڈی ہوئی ہیں آپ لوگوں نے۔" سمیع حیران ہوا کیونکہ وہ اس بات سے بے خبر تھا۔

"ہاں۔ میرا دوست ہے۔ ہم دونوں نے اس کی بیٹی پیدا ہونے پر ایک دوسرے سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔"

"واؤ۔" سمیع کے لیے یہ انوکھی بات تھی جو اس سے پہلے اس کے سامنے ڈسکس نہیں ہوئی تھی۔

"بھائی۔" سمیع نے شرارت بھری آواز میں کہا اور فرحان مسکرا دیا۔

☆.....☆

سمندر کی لہریں آ آ کر اس کے پاؤں چھو رہی تھیں۔ اس کی اداس نگاہیں لہروں پر جمی تھیں۔

"کہاں ہو؟ کی اب تم؟ میں دل لے کر چلی گئی اور خبر بھی نہیں تمہیں کہ کوئی نگاہیں بچھائے تمہارے انتظار میں ہے۔" سمیع نے دکھ سے آنکھیں بند کر لیں۔

"میری ہی غلطی ہے میں تمہیں بتا نہیں پایا۔ بتا دیتا تو شاید تم سمجھ جاتیں۔ دل تو تمہیں ہی پکار رہا ہے لیکن اس کی آواز تم تک کبھی نہیں پہنچ پائے گی۔"

☆.....☆

فرحان کا رشتہ پکا ہو چکا تھا۔ گھر میں شادی کی تیاری زور و شور سے جاری تھیں۔ سمیع کو فرحان ہی کی کمپنی میں جاب مل چکی تھی سو وہ کام کے لوڈ کی وجہ سے بھابی کو دیکھنے نہ جا سکا تھا۔

"مما بھابی کا نام کیا ہے؟" سمیع نے پوچھا۔

"ثانیہ۔"

سمیع ایک دم چونکا۔ "ثانیہ!"

"کیسا اتفاق ہے۔ بھابی کا نام بھی ثانیہ ہے۔" وہ مسکرا دیا لیکن ایک بے چینی نے اس کے گرد احاطہ کر لیا تھا۔ اب وہ جلد از جلد بھابی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اللہ کرے اس کا شک غلط ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔

☆.....☆

آخر شادی کا دن بھی قریب آ گیا۔

"بھائی۔ میں نے اب تک بھابی کو نہیں دیکھا۔" سمیع نے منہ بنایا۔

"کوئی بات نہیں۔ ابھی آنے والی ہیں۔ پھر دیکھ لینا۔" فرحان نے پیار سے سمیع کا گال تھپکتے ہوئے کہا۔

سمیع جلدی جلدی تیار ہوا اور فرحان کے پاس آیا۔

"کیسا لگ رہا ہے آپ کا بھائی۔" سمیع نے پرجوش انداز میں کہا۔ فرحان نے اس کی جانب دیکھا۔

"بہت پیارا لگ رہا ہے میرا چھوٹو۔" فرحان نے پیار سے کہا۔

فرحان بھی تیار ہو چکا تھا۔ بارات ٹائم پر روانہ ہو چکی تھی۔ اس دن سمیع سب سے نمایاں تھا۔ اس کی شرارتوں سے سب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ اس خاندان کے لیے گولڈن ٹائم تھا۔

☆.....☆

"مما! میں نے بھابی کو دیکھا ہے۔ وہ آخر میرے بھائی کے لائق ہیں بھی یا نہیں۔" برات کی واپس آجانے کے بعد سمیع بولا۔ ہال میں گھونگھٹ ہونے کے باعث وہ انہیں دیکھ نہ پایا تھا۔

"سمیع ابھی وہ تھکی ہوئی ہے۔" زبیدہ بیگم نے کہا۔ "صبح منہ دکھائی کے وقت دیکھ لینا۔" سمیع نے منہ بنایا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ کافی دیر تک سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ دل بے چین و بے قرار تھا نجانے کیوں؟ سمیع نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆

"سمیع!" زبیدہ بیگم نے اسے پکارا۔ "تم نے جو کل سے بھابی کو دیکھنے کی رٹ لگا رکھی تھی۔ اب آ کر دیکھ لو۔"

سمیع بھابی کے کمرے کی جانب بڑھا اور اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا۔ "اسلام علیکم بھابی۔"

اور دوسرے ہی پل سمیع کی نظر بھابی پر پڑی اور بجلی سی اس کے اوپر گر گئی۔

"وعلیکم السلام۔" ہلکی سی آواز میں جواب دیا گیا۔

وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ سمیع کا چہرہ زرد ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم سے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔

سمیع کو لگا اس کی آنکھیں جلنے لگی ہوں۔ سامنے وہی تھی جس کی سمیع نے شدید خواہش کی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا تا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆

کمرے کے لائٹس بند تھیں۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ باہر رات تھی جس کا کالا اندھیرا اس کمرے میں بھی اتر آیا تھا۔ دن تو نہ جانے کیسے کٹا تھا لیکن یہ رات زخموں کو اور دہکا رہی تھی۔ وہ کافی دیر سے بستر پر پڑا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھا۔ وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر ہاتھ اٹھا لیے۔

"اے پروردگار! تو ہی پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ ہر چیز تیرے علم میں ہے۔ کوئی چیز تجھ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ میرے مولا! اپنے اس گناہ گار بندے کو ہمت عطا کر۔ تو ہی پاک ہے میرے پروردگار۔ تیرے ہر کام میں مصلحت ہے۔ مجھے تجھ سے کوئی شکوہ نہیں۔ وہ میری نہ ہو سکی۔ پر میری دعا ہے کہ تو اس کی اور فرحان بھائی کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دے اور مجھے ہمت دے۔ مجھے ہمت دے میرے مولا کہ میں اپنا آپ سنبھال پاؤں۔" سمیع دعا کرتا رہا، گڑگڑاتا رہا۔ اس کے لیے بار بار بھابی کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

☆.....☆

"دوپہر ہونے کو آئی ہے۔ سمیع ابھی تک سو رہا ہے کیا؟" زبیدہ بیگم نے فرحان سے پوچھا۔

"اٹھا نہیں وہ ابھی تک؟" الٹا فرحان نے سوال کیا۔

زبیدہ بیگم نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ تو جلدی سونے چلا گیا تھا۔ میں دیکھتا ہوں اسے۔" فرحان نے جا کر سمیع کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ جواب ندارد۔

سب پریشان ہو گئے۔ فرحان جلدی سے جا کر کمرے کی چابی لے آیا اور دروازہ کھولا۔

سمیع وہیں سجدے میں بیہوش ہو چکا تھا۔ جلدی سے اسے اسپتال لے جایا گیا۔

بخار کا کافی بڑھ جانا اس کی بیہوشی کا باعث بنا تھا۔

"آپ کو انہیں لانے میں بہت دیر ہو گئی۔ ورنہ پہلے ہی فیور کو کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

زبیدہ بیگم کا رو رو کر برا حال تھا۔ سمیع ان کی اور

پورے گھر کی جان تھا۔ یہ ایک ہی دن میں نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ کل تک تو ٹھیک تھا وہ۔

رات تک سمیع کو ہوش آچکا تھا۔ زبیدہ بیگم کب سے اسے چومے جارہی تھیں۔ فرحان نے بھی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''کیا حرکت ہے یار چھوٹو۔ سب کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ چل بس اب ٹھیک ہوجا۔'' سمیع مسکرا دیا۔

☆.....☆

اگلی صبح ہی سمیع اسپتال سے واپس آچکا تھا لیکن چہرے کی رونق ختم ہوچکی تھی۔ ایک دن میں ہی وہ کافی کمزور لگ رہا تھا۔ تین دن تو زبیدہ بیگم نے اسے بستر سے اٹھنے ہی نہ دیا۔ وہ بس یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی حالت گھر والوں پر عیاں ہو۔ اس لیے آخر وہ فیصلہ کر کے فراز صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''السلام علیکم پاپا!''

''وعلیکم السلام۔ کیسا ہے میرا بیٹا؟'' فراز صاحب نے شفقت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں پاپا۔ بس آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' سمیع نے ان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بولو بیٹا۔'' فراز صاحب نے مسکرا کر اجازت دی۔

''پاپا میں آگے اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں۔'' سمیع دھیمی آواز میں گویا ہوا۔

''تو کرلو بیٹا۔ کس نے منع کیا ہے آپ کو۔'' فراز صاحب نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''وہ دراصل پاپا میں پڑھنے کے لیے امریکا جانا چاہتا ہوں۔''

''امریکا۔'' فراز صاحب چونکے۔

''جی پاپا۔''

فراز صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

''پلیز پاپا جانے دیجیے۔'' سمیع نے التجا کی۔

''ٹھیک ہے بیٹا، چلے جاؤ اپنی مما سے بھی پوچھ لو۔''

فراز صاحب نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

زبیدہ بیگم نہ نہ کرتی رہ گئیں لیکن سمیع نے انہیں کسی طرح منا ہی لیا۔

☆.....☆

جہاز پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ایئرپورٹ پر سب سمیع سے ملنے آئے تھے۔ سمیع سب سے باری باری ملا۔ فراز صاحب نے شفقت سے اسے گلے سے لگایا۔ زبیدہ بیگم مسلسل روئے جارہی تھیں۔

''مما! ایسے تو نہ کریں نا۔ ورنہ آپ کا بیٹا دکھی ہوکر جائے گا۔'' سمیع نے کہا اور زبیدہ بیگم اپنی ہچکیاں دبانے لگیں۔

فرحان نے اسے زور سے بھینچ لیا۔ ''تو ہم سے دور جارہا ہے چھوٹو۔''

''نہیں بھائی میں آپ لوگوں سے کبھی بھی دور نہیں۔'' سمیع سے ہٹتے ہوئے زخمی مسکراہٹ سے کہا۔

بھابی، فرحان بھائی کے ساتھ ہی کھڑی تھیں۔ سمیع نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔

''اللہ حافظ بھابی۔''

سمیع جلد ہی جانے کے لیے مڑ گیا لیکن آنسوؤں نے سمیع کا ساتھ نہ چھوڑا۔ سمیع نے آنکھوں پر سن گلاسز لگائے اور آگے بڑھ گیا۔ شام ڈھل چکی تھی۔ سورج چھپ جانے کو تیار تھا۔ کچھ ہی دیر میں جہاز پرواز کر گیا اور اس میں بیٹھا سمیع وہاں سے بہت دور چلا گیا۔

.....☆.....

امبر فاطمہ

تیرے نام لکھ دی زندگی

وہ یک ٹک اس شخص کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ وہ وہی تھا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ ویسا ہی تھا۔ اس کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ وہ وہی تھا جس سے اس نے بے پناہ محبت کی تھی۔ آج وہ لوٹ آیا تھا۔ اس کی نظر اس کے ساتھ کھڑی لڑکی پر تھی۔ جس نے چھوٹا بچہ اٹھا رکھا تھا جسے اب شہمیر فاروق نے اس سے لے لیا تھا۔ اسے اپنی

دھڑکنوں کا شور واضح سنائی دینے لگا تھا۔ وہ کسی بے جان وجود کی طرح کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا بھلا، شہمیر فاروق اس کا تھا۔ جسے وہ اب تک اپنے رب سے مانگتی آئی تھی پھر یہ سب..... اسے لگا تھا یہ سب دیکھ کر وہ یہیں ڈھے جائے گی۔ تب ہی عمر کی عصے میں بھری آواز اسے بالکل اپنے قریب سنائی دی تھی۔

"تمہیں اپنے ساتھ لے کر آنا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ نجانے کب سے یہاں بے خبر کھڑی ہو اور میں پورے ایئرپورٹ پر تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ ایئرپورٹ سے باہر لے آیا تھا۔ اسے گاڑی میں بٹھا کر گاڑی لاک کر کے چلا گیا۔

اس نے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی تھی لیکن آنکھیں برسنے کو تیار تھیں۔ اس نے بے دردی سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔

مکمل ناول

☆......☆

ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے وہ ریلنگ پر جھکی باہر کے نظارے دیکھنے میں مگن تھی۔ تب ہی اس نے بوگن ویلیا کی بیل سے ڈھکے اس گھر کی طرف دیکھا جو اکثر ہی اس کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ وہ خوب صورت گھر اسے شروع سے ہی بہت اچھا لگتا تھا لیکن گھر کافی عرصے سے لاک ہونے کی وجہ سے وہ اب تک اس کے اندر نہیں جا سکی تھی۔ اس گھر کے گیٹ کے بالکل سامنے آ کر ایک گاڑی رکی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس دو سال پرانے گھر میں کون آ گیا۔ وہ اپنے ازلی تجسس سے مجبور ہو کر تھوڑا اور آگے کی طرف جھکی۔ گاڑی میں سے ایک سوٹڈ بوٹڈ بندہ نکلا تھا۔ ابھی وہ اس کو دیکھ ہی رہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ خوف کے مارے اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا کپ نیچے جا گرا تھا۔

''نمی کی بچی! جان ہی نکال دی میری۔'' اس نے گھورتے ہوئے نمرہ سے کہا۔ جواب اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اسے خود پر ہنستے دیکھ کر اس نے غصے سے کہا اور نظر ایک بار پھر اس گھر کی جانب کی تھی لیکن نہ تو اب وہاں کوئی بندہ تھا نہ ہی کوئی گاڑی۔ وہ منہ بناتی ہوئی پیچھے کو ہوئی تھی۔

''تم اتنے انہماک سے کیا دیکھنے میں لگی تھیں جو تمہیں میرے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔'' نمرہ نے ریلنگ سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ سب چھوڑو تم بتاؤ یہ بن بلائے مہمان کی طرح کیوں ٹپک پڑی ہو؟''

''اوہ! مت پوچھو کیا بتانے آئی ہوں۔'' نمرہ نے تجسس سے کہا لیکن اس کا دل و دماغ اسی گھر کی طرف تھا۔

''ایمن! میں تمہیں اتنی اہم بات بتانے یہاں آئی ہوں اور تم نجانے کن خیالوں میں گم ہو۔'' نمرہ کو غصہ آیا۔

''میں سن رہی ہوں، کہو تم۔'' وہ اب پوری اس کی طرف گھوم گئی تھی۔

''رہنے دو جب تم اپنی اس عجیب کیفیت سے نکل آؤ گی تو بتا دوں گی۔''

''تم بتاتی ہو یا ابھی یہاں سے اٹھا کر نیچے پھینک دوں۔'' اس نے اسے لائن پر لاتے ہوئے کہا۔

بات اس کے اپنے پیٹ میں کیا رہتی فوراً سیدھی ہوئی۔

''اب بتا بھی دو ایسی کیا بات ہے۔'' ایمن نے اسے دوپٹا دانتوں میں دباتے دیکھ کر کہا۔

''کیسے بتاؤں شرم آ رہی ہے۔'' نمرہ نے شرمانے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

ایمن نے اس کی کمر پر زوردار دھپ رسید کی۔ ''اب اگر تم نے نہیں بتایا تو میں تمہارا گلا دبا دوں گی نہ بتانے کی نوبت آئے گی نہ ہی شرمانے کی۔'' ایمن کو اس کی حرکتوں پر اب غصہ آنے لگا۔

''تم جیسی دوست تو اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دے۔'' اس نے اپنی کمر سہلاتے ہوئے کہا۔ ایمن نے اسے گھورا تھا۔

''اچھا بتاتی ہوں۔'' اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر وہ فوراً بولی۔

''وہ میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ نیکسٹ سنڈے میری شیری کے ساتھ انگیجمنٹ ہے۔''

''کیا۔'' ایمن چیخی تھی۔ ''تم اس کارٹون سے شادی کرنے کا سوچ چکی ہو۔''

''اب اسے کارٹون تو مت کہو، اچھا خاصا ہینڈسم ہے وہ۔'' نمرہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''ہونہہ ہینڈسم، کہاں سے وہ تمہیں اچھا خاصا ہینڈسم لگا۔ پورا کا پورا کارٹون ہے۔ ہنستے ہوئے تو بالکل وہ......''

''بس بہت ہو گیا ایمن تم نے جتنی اس کی انسلٹ کرنی تھی کر لی۔ تم کو کیا معلوم محبت کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔

محبوب کی قدر کیا ہوتی ہے خیر میں تمہیں انوائٹ کرنے آئی تھی آنا یا آنا اب تمہارا مسئلہ ہے خدا حافظ۔''

وہ کہہ کر چلی گئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ شیری کے بارے میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔ اب منانا پڑے گا اسے ورنہ خربوزے جتنا منہ بنا رہے گا۔ اس نے گرل پر دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے خود کی کلاس لی اور نظریں دوبارہ اسی بوگن ویلیا سے ڈھکے گھر کی طرف جما دیں۔

''نجانے کون آیا ہو گا اور اتنی جلدی غائب بھی ہو گیا۔'' وہ گھر ہمیشہ سے ہی اس کے لیے پراسرار رہا تھا۔ اس کے کمرے کی بالکونی سے قدرے فاصلے پر ہی وہ گھر تھا۔ وہ جب بھی بالکونی میں آتی نظریں خود بخود ہی اس گھر کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ گہرا سانس لیتی وہاں سے ہٹ گئی۔

☆......☆

''کیسی ہے میری بیٹی! اتنے دن تم سے دور رہنا بہت مشکل تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے حج کی سعادت نصیب کی۔ بیٹا! کہتے ہیں کہ کعبے پر پہلی نظر پڑتے ہی جو پہلی دعا مانگی جائے وہ ضرور قبول ہوتی ہے اور میں نے اپنی ایمی کے لیے دعا مانگی، تمہاری زندگی میں خوشیوں کی دعا مانگی۔'' منیزہ حسن نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''ممی کچھ اور مانگ لیتیں، مجھ سے تو خوشیوں کا تعلق کب کا ٹوٹ چکا ہے۔ اپنے حصے کی ساری خوشیاں میں کھو چکی ہوں۔''

منیزہ حسن نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ایسے تو مت کہو ایمی، میرا دل پھٹتا ہے تمہاری یہ حالت دیکھ کر۔ آزمائش میں تو خدا پاک اپنے خاص بندوں کو ڈالتا ہے اور بیٹا مجھے یقین ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے، سب زخم بھر دے گا۔'' انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

☆......☆

وہ فون پر بات کر رہا تھا لیکن نظریں اس پر تھیں جو جھاڑیوں میں پھنسے اپنے دوپٹے کو نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے سیل فون کوٹ کی جیب میں رکھا اور اس کی طرف بڑھا اور خاموشی سے آگے بڑھ کر نرمی سے اس کا دوپٹا جھاڑیوں سے نکال کر داخلی دروازے سے باہر چلا گیا۔ وہ حیرت سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی گو کہ وہ اب بھی اس کی جھلک ہی دیکھ پائی تھی لیکن اسے ایسا لگا کہ یہ وہی شخص ہے جسے اس نے اس گھر کے سامنے گاڑی سے اترتے دیکھا تھا۔ وہ بھاگ کر داخلی دروازے کی طرف آئی لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ وہی شخص تھا لیکن گیا کہاں؟ کہیں کوئی بھوت تو نہیں وہ جو ہر بار ہی غائب ہو جاتا ہے۔ اس نے حیرت سے سوچا تھا اندر سے میوزک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

''اس وقت بھی آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اکلوتی دوست ہونے کے باوجود تم سب سے لیٹ پہنچی ہو۔'' نمرہ نے اسے دیکھتے ہی غصے سے کہا تھا۔ اس کے شکوے پر وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اس کے گلے لگ گئی۔

''پیچھے ہٹو۔ سارا ڈریس خراب کرو گی میرا۔'' نمرہ نے اسے خود سے دور کرتے ہوئے کہا۔

''ارے اتنی پیاری لگ رہی ہو تم، آج تو اس کارٹون کی خیر نہیں ہے۔'' نمرہ نے اس کی بات پر غصے سے دانت پیسے تھے۔ اتنے مہمانوں کی موجودگی میں وہ اب اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

''تم پٹو گی مجھ سے ایمن۔''

''ارے اتنا مت بولو۔ تمہارے سسرال والے کیا سوچیں گے تمہارے بارے میں۔'' ایمن نے اس کی حالت

دیکھتے ہوئے مسکراہٹ روک کر کہا۔

''اچھا اب یوں بچوں کی طرح منہ تو نہ بناؤ۔'' ایمن نے اسے منہ بناتے دیکھ کر کہا۔

''تم بھی دل جلانے والی باتیں نہ کیا کرو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ شیری میرے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ محبت کرتی ہوں میں اس سے، جب تم اس کے بارے میں ایسی باتیں کرتی ہو تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ تم دوست ہو میری لیکن میرے جذبات نہیں سمجھ سکتی ہو۔''

اس کی بات پر ایمن نے لب دانتوں تلے دبا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی شیری کو برا بھلا کہتی رہی تھی۔

''سوری یار! میں شرمندہ ہوں اپنی اس غلطی پر، میری دعا ہے کہ تم شیری کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو۔'' ایمن نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

نمرہ نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما۔ ''پتا نہیں کیوں ایمن! میں تم سے ناراض نہیں رہ سکتی چاہے کتنی بھی کوشش کر لوں لیکن ایسا نہیں کر پاتی لیکن جب تم شیری کے بارے میں ایسی باتیں کہتی ہو تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

''اچھا چھوڑو اب ان باتوں کو آئندہ ایسا نہیں ہوگا لیکن اب یہ بتاؤ کہ میں جاؤں گی کس کے ساتھ، بہت دیر ہو چکی ہے۔ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' اسے وقت کا احساس ہوا تھا۔

''اتنی جلدی جا رہی ہو؟ بھی تو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ ویسے بھی تم نے ہی کہا تھا کہ انکل آؤٹ آف سٹی ہیں تو اب کس بات کی ٹینشن۔''

''پاپا گھر پر نہیں ہیں لیکن عمر بھائی تو گھر ہی میں موجود ہیں نا، انہیں تو ویسے بھی موقع چاہیے مجھے ڈانٹنے کا۔ تم پلیز مجھے گھر بھیجنے کا انتظام کرو۔'' اس بات پر نمرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے اردگرد دیکھا۔ اسٹیج سے کچھ ہی فاصلے پر ڈانیال کھڑا تھا۔ اسے بلا کر اسے لے جانے کا کہا تو وہ بھی اس سے مل کر باہر آ گئی۔ وہ بنا دیکھے ہی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر آرام سے بیٹھ گئی۔ لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر ڈانیال کے بجائے کسی اور کو دیکھ کر چیخ مارتی باہر نکلی تھی اور فوراً گھر کے اندر آئی تھی۔ ڈانیال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں کیا ہوا، ایسے کیوں کھڑی ہو۔'' اسے ہونقوں کی طرح کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

''ڈانی! تمہارے گھر میں بھوت ہے اس نے ڈانیال کو بھی بتانا چاہا۔

''تم پاگل ہو۔ اس گھر میں جو انسان رہتے ہیں وہ نظر نہیں آتے اور بھوت نظر آ گئے۔'' اس کا اشارہ اپنی طرف تھا جسے وہ خوب سمجھ گئی تھی۔

''بکومت۔'' ایمن نے اسے گھورا۔

''چلو اب تمہیں دیر ہو گئی تو پھر تم مجھے الزام دو گی۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھا تو وہ بھی اس کے پیچھے چل دی۔ وہ باہر آئی تو وہ گاڑی وہاں موجود نہیں تھی۔ اسے اب پکا یقین ہو چلا تھا کہ وہ یقیناً کوئی بھوت ہی ہے جو صرف اسے ہی دکھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆

''وہ کالج سے گھر آئی تو لاؤنج سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنے روم میں جانے کے بجائے سیدھی وہیں آ گئی۔ پاپا، ممی کے ساتھ پاپا ہی کی عمر کے کوئی انکل بیٹھے تھے۔ اس نے انہیں دیکھ کر فوراً سلام کیا۔ اسے آتے دیکھ کر پاپا کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی، انہوں نے تلخی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

انکل نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''بھابھی! یہ وہی چھوٹی سی گڑیا ہے۔ ماشاء اللہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔'' انہوں نے نمیرہ حسن کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی بھائی صاحب یہ وہی ہے اور بیٹیوں کو بڑا ہونے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے پل میں ہی نظروں کے سامنے ہی بڑی ہو جاتی ہیں۔'' نمیرہ حسن نے حسن احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی آنکھوں میں ایمن کے لیے تلخی دیکھ چکی تھیں۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن ایمن کو دیکھ کر یقین نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو جب آپ اسے تیار کر کے ہماری طرف بھیج دیتی تھیں۔ سارہ میں تو اس کی جان تھی۔ اس کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ اسے اپنے پاس ہی رکھ لے۔'' فاروق صاحب نے اپنی مرحومہ بیوی کا ذکر کیا تھا۔ ایمن خاموشی سے کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''بھائی صاحب بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ ان کے دم سے ہی تو گھر آباد ہوتے ہیں۔'' ممی نے اپنے تئیں ایک بات کہی تھی لیکن حسن احمد کو وہ طنز لگا تھا۔

ایمن خاموشی سے کھڑی حسن احمد کے چہرے کے کھنچے عضلات دیکھ رہی تھی۔

''فاروق! تم بھی کن باتوں کو لے کر بیٹھ گئے۔ اتنے سالوں سے کہاں تھے تم۔ میں نے بہت کوشش کی تھی تمہیں ڈھونڈنے کی لیکن کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یوں خاموشی سے نجانے کہاں چلے گئے تھے۔'' حسن احمد نے بات ہی پلٹ دی۔

ایمن نے ایک شکوہ کناں نظر ان پر ڈالی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''بس سارہ کی وفات کے بعد بچا ہی کیا تھا اس لیے میں ہمیر کو لے کر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ خود کو مصروف رکھنے کی پوری کوشش کرتا رہا لیکن اپنے وطن، اپنے رشتوں کی بہت یاد آتی تھی۔ میرے لیے ہمیر کو سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ وہ سارہ سے بہت اٹیچ تھا۔ میرے لیے اس وقت اس کا ذہن بٹانا بہت ضروری تھا اسی وجہ سے میں نے خاموشی سے جانے میں ہی عافیت جانی اور آج جب میں اسے اپنے برابر کھڑا دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ وقت کیسے گزر جاتا ہے۔ وہاں کینیڈا میں میرا اب دل نہیں لگتا۔ اسی لیے واپس چلا آیا۔ میری کوشش تھی کہ پہلی فرصت میں تم سے ملوں اور آج مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ میری تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں تو بس یوں ہی نئے پڑوسی کا حق ادا کرنے کے طور پر سلام دعا کے لیے آیا تھا۔ کیا خبر تھی کہ یوں تم سے ملاقات ہو جائے گی اور یوں اتنے عرصے بعد میں اپنوں میں موجود ہوں۔'' انہوں نے تفصیل سے بتایا۔

انہیں باتوں میں مصروف دیکھ کر نمیرہ حسن اٹھ کر کچن میں آ گئی تھیں۔

''ممی یہ انکل کون ہیں؟'' وہ کچن میں پانی پینے آئی تھی۔ انہیں وہاں مصروف دیکھ کر پوچھا۔

''تمہارے بابا کے کزن ہیں، کچھ دن پہلے ہی پاکستان شفٹ ہوئے ہیں اور یہیں ہمارے ساتھ والا گھر ان ہی کا ہے۔'' انہوں نے اسے تفصیل سے بتایا۔ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ کا مطلب ہے بوگن ویلیا کے بیل سے ڈھکے گھر میں۔'' اس کے پوچھنے پر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''ممی ان کی فیملی بھی آئی ہے؟'' وہ ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

منیزہ حسن نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا جو بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ ”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پانی کا گلاس اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

”بتائیں نا پلیز۔“ اس نے پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے کہا۔

”ان کا بس ایک ہی بیٹا ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد ہی وہ کینیڈا شفٹ ہو گئے تھے اور اتنے سالوں بعد اب لوٹے ہیں۔“

”اچھا!“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور گلاس لبوں سے لگا لیا۔

”ممی یہ ہیں شمیر، فاروق انکل کے بیٹے۔“ عمر بھائی کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا، اس کا پانی پیتا ہاتھ رکا۔ اک نظر سامنے کھڑے وجود کی طرف دیکھا۔ وہ وہی تھا۔ اس کی پلیٹس جھپکنا بھول چکی تھیں۔ ممی اب اس سے مسکرا کر اس کا حال احوال دریافت کر رہی تھیں اور وہ اپنی گول گول آنکھیں کھولے حیرت سے اسے تک رہی تھی۔

شمیر نے اسے یوں اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ کر ذرا سا مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا، شمیر کے دیکھنے پر بھی اس پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ عمر بھائی اسے اب اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔ اس نے ممی کی طرف دیکھا جو دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”ممی!“ اس نے قریب آ کر پکارا۔ ”ممی وہ بھوت تھا وہ ساتھ والے گھر کا۔“ منیزہ حسن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ممی وہ بھوت تھا۔“ منیزہ حسن کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو ایمن!“ انہوں نے سختی سے کہا۔

”ممی سچ کہہ رہی ہوں۔ میں اسے پہلے بھی دیکھ چکی ہوں اور وہ غائب بھی ہو جاتا ہے۔“ منیزہ حسن نے اس کی بات سن کر افسوس سے سر جھٹکا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں ایمن! تم نے اس گھر کو خود پر اتنا سوار کیا ہوا ہے کہ بس اس کے بارے میں سوچتی رہتی ہو۔“ ان کی بات پر وہ منہ بسور کر رہ گئی۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ چور نظروں سے اپنے ساتھ بیٹھے شمیر کو دیکھ رہی تھی۔ جو سر جھکائے بس کھانے میں مگن تھا جیسے صدیوں کا بھوکا ہو۔

”کون سی کلاس میں ہو بیٹا!“ فاروق انکل نے پوچھا۔

”سیکنڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا پھر انکل کھانے کے دوران اس سے چھوٹے موٹے سوال کرتے رہے اور وہ بخوشی جواب دیتی رہی۔ فاروق صاحب نے اسے شمیر کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو وہی پرانی خواہش دل میں انڈ آئی تھی جس کا اظہار انہوں نے کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے حسن احمد اور منیزہ حسن سے کر دیا تھا۔

”بھائی صاحب! آپ کی خواہش کا ہم احترام کرتے ہیں لیکن ایمن ابھی چھوٹی ہے اور پڑھ بھی رہی ہے۔“ منیزہ حسن نے حسن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ وہ جانتی تھیں کہ حسن احمد ایک پل بھی نہیں لگائیں گے انہیں ہاں کہنے میں لیکن وہ ایمن کے مزاج سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔

”بھابھی میں جانتا ہوں ایمن ابھی چھوٹی ہے، وقت کے ساتھ سمجھ جائے گی سب اور میں وعدہ کرتا ہوں اس کی

پڑھائی کا کوئی حرج نہیں ہوگا اور پھر یہ بات تو میں نے آپ دونوں سے اس کے چھوٹے ہونے پر ہی کہی تھی، حالات ایک دم بدل گئے تو مجھے یہاں سے جانا پڑا لیکن میں اپنی بات نہیں بھولا۔“ فاروق صاحب نے انہیں برسوں پہلے کی بات یاد دلائی تھی۔

حسن احمد نے منیزہ کے بے تاثر چہرے کی طرف دیکھا۔ انہیں بالکل بھی امید نہیں تھی کہ منیزہ، ایمن کی حمایت میں کچھ کہیں گی۔ وہ تو ان کے ہر فیصلے پر ہمیشہ خاموشی سے سر جھکا دیا کرتی تھیں تو آج کیسے ان کے اندر اتنی ہمت آ گئی تھی۔ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے فاروق صاحب کی طرف دیکھا جو جواب طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”فاروق مجھے سب کچھ یاد ہے بس کچھ وقت دو انشاء اللہ فیصلہ شمیر کے حق میں ہی ہوگا۔ جب تک تم بھی شمیر سے بات کر لو، ہم ایمن سے پوچھ لیتے ہیں پھر جلد ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔“ حسن احمد نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی رضامندی ظاہر کی۔ منیزہ حسن نے شاکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ ازل سے ہی اتنے پتھر دل تھے اور ایمن کے معاملے میں تو کچھ زیادہ ہی۔

☆.....☆

”انکل آپ موویز دیکھتے ہیں۔“ ممی نے آج کھیر بنائی تھی جو وہ فاروق انکل کے گھر دینے آئی تھی۔ ایک تجسس اس گھر کو دیکھنے کا بھی تھا جو آج پورا ہوا تھا۔ اس کے آنے پر وہ اتنے خوش ہوئے کہ اسے وہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس سے باتیں کرنا انہیں اچھا لگتا تھا جب وہ اپنی گول گول آنکھیں گھما کر باتیں کرتی تھی۔ انہوں نے اس کے سوال پر قہقہہ لگایا تھا جو دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنائے چہرہ اس میں ٹکائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

شمیر نے بھی سر اٹھا کر فاروق صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ ان دونوں سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا بظاہر اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ میں مصروف نظر آ رہا تھا لیکن دھیان سارا ان دونوں کی ہی طرف تھا۔ وہ بھی ایمن کی رٹ پٹانگ باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”ارے بیٹا! میرے ہی اب وہ عمر کہاں کہ میں موویز دیکھوں۔ مجھے تو اب بکس پڑھنے سے ہی فرصت نہیں۔“

”پھر بھی انکل پہلے بھی تو دیکھتے ہی ہوں گے۔“ وہ نجانے کیا پوچھنا چاہ رہی تھی ان سے۔

”ہاں پہلے دیکھ لیا کرتا تھا کچھ پرانے وقتوں کی جب ہماری انڈسٹری کے فنکار کمال کی اداکاری کیا کرتے تھے لیکن اب بھی اس چیز کو شوق نہیں بنایا۔“ انہوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ایمن نے ان کے سنجیدہ انداز پر مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ ”اس کا مطلب دیکھتے تو تھے تو کبھی پھر کسی ہیرو یا ہیروئن سے امپریس نہیں ہوئے۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ جس طرح اس نے ہیروئن پر زور دے کر کہا۔ شمیر نے اپنی مسکراہٹ روکتے ہوئے ایسے دیکھا جو اس کی موجودگی سے یکسر بے نیاز ہو کر بیٹھی تھی۔ رائل بلیو سوٹ میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ سلیقے سے سر پر دوپٹہ جمائے وہ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔

فاروق صاحب نے مصنوعی غصے سے اس کی طرف گھورا جس پر ایمن دل کھول کر ہنسی تھی۔

”میری بات چھوڑو تم بتاؤ، لگتا ہے کافی موویز دیکھتی ہو۔ تمہیں بھی کوئی ہیرو پسند ہوگا ہی۔“ انہوں نے بال اس کے کورٹ میں ڈالی تھی۔

ان کی بات پر وہ پر اعتماد لہجے میں انہیں دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ”نہیں انکل! مجھے کوئی ہیرو نہیں پسند نہ ہی کوئی ہیروئن مجھے تو ولن کی پرسنالٹی اٹریکٹ کرتی ہے۔“

''وہ کیوں بھئی؟'' انکل نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھیے نا انکل ہیرو کو ہیروئن مل جاتی ہے اور ولن بے چارا اکیلا رہ جاتا ہے اور ساری پٹائی بھی اسی کے حصے میں آتی ہے، میری ساری ہمدردی ولن کے لیے ہے اور آپ نے دیکھا ہے زیادہ رعب دار پرسنالٹی ولن کی ہی ہوتی ہے۔ ہیرو تو بس یوں ہی ہوتا ہے ناچنے گانے کے لیے۔'' فاروق صاحب اس کی عجیب منطق پر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

جب کہ شمیر کے لیے اپنا قہقہہ روکنا محال ہوگیا تھا۔ اس لیے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

''لیکن یہ تو تم ناانصافی کر رہی ہو۔ اکثر ولن دیکھے ہیں تم نے جو رعب دار کم اور ڈراؤنے زیادہ ہوتے ہیں اتنے خوب صورت ہیرو پر تم بھدے سے ولن کو ترجیح دے رہی ہو۔'' انہوں نے اس کی رائے سے اختلاف کیا۔

''اب انکل ہم صرف اس کے بھدے ہونے کی وجہ سے اسے ناپسند کردیں۔ میرے نزدیک تو ولن ہی اچھا ہوتا ہے۔ مووی میں سارا مزہ ہی ولن کی وجہ سے آتا ہے۔'' وہ اپنی بات پر ایسے منجی ہوئی تھی جیسے آج ان سے ہاں کروا کر ہی جائے گی کہ ولن ہی اصل ہیرو ہوتا ہے۔

☆.....☆

''ممی، فاروق انکل واقعی پاپا کے کزن ہیں؟'' ٹی وی دیکھتے ہوئے کچھ یاد آنے پر اس نے پوچھا۔

''ہاں تمہارے پاپا کے فرسٹ کزن ہیں اور بہت اچھے دوست بھی، تم کیوں پوچھ رہی ہو۔'' انہوں نے ٹی وی پر سے نگاہ ہٹا کر اس سے پوچھا۔

''ممی بالکل بھی نہیں لگتا کہ پاپا اور انکل کزن ہیں۔ کتنے مختلف ہیں نا وہ پاپا سے، کتنی ساری باتیں کرتے ہیں وہ، مجھ سے اتنے پیار سے پیش آتے ہیں جبکہ پاپا تو ایک نظر ڈال کر دوبارہ دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے۔ مجھے ممی ایسا کیوں کرتے ہیں پاپا جب کہ عمر بھائی سے تو بہت ہی نرمی سے اور محبت سے بات کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

منیزہ حسن نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''ایسی بات نہیں ہے بیٹا، عمر سارا دن آفس میں ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے شاید اسی لیے آپ کو ایسا لگا ورنہ وہ آپ سے بھی بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کی ہر چیز کا خیال رکھنے کو کہتے ہیں وہ مجھ سے۔'' انہوں نے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ ایمن نے ان کا ہاتھ تھاما اور شکایتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''ممی، مجھے مت بہلائیں، اب میں بڑی ہوگئی ہوں۔ جب بھی میں آپ سے اس موضوع پر بات کرتی ہوں آپ مجھے ایسی جھوٹی باتوں سے بہلا لیتی ہیں۔ آپ نے بھی نمرہ کی فیملی کو دیکھا ہے۔ وہ تین بہنیں ہیں لیکن ان کے پاپا تو ان سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ ہر ویک اینڈ پر انہیں اپنے ساتھ باہر لے جاتے ہیں جب کہ پاپا تو بھولے سے بھی میری طرف دیکھ لیں تو فوراً نظریں پھیر لیتے ہیں۔ ممی کیا میں ان کی بیٹی نہیں جو وہ ایسا کرتے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے رونے لگی۔

منیزہ حسن نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میرے ہوتے ہوئے میری بیٹی کو کسی کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ میں ہوں نا اپنی بیٹی کا خیال رکھنے کے لیے، اس کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے۔'' انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''ممی بتائیں نا آخر پاپا ایسے کیوں ہیں۔'' اس کی سوئی اب تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

وہ اب اسے کیا بتاتیں آخر کیوں کرتے ہیں حسن احمد ایسے۔ وہ اسے کچھ بتا کر حسن احمد کی طرف سے اس کا دل برا نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ بھی نہ جانے کس مٹی کے بنے انسان تھے کہ بیٹی کے لیے دل میں رتی بھر بھی جگہ نہ تھی۔ پہلے تو وہ اسے اپنی باتوں سے بہلا لیتی تھیں لیکن اب وہ بچی نہیں رہی تھی جو اسے بہلایا جاتا۔

''اس میں تمہارے پاپا کا بھی کوئی قصور نہیں، جیسا ماضی ان کا گزرا ہے ان کا رویہ ایسا ہونا ہی تھا۔ چار بہنوں کے اکلوتے بھائی ہونے کی وجہ سے ساری ذمے داری بھی انہی پر تھی۔ تمہارے دادا بہت سخت طبیعت کے مالک تھے۔ تمہارے پاپا سے زیادہ جارحانہ رویہ ان کا ہوا کرتا تھا۔ اپنی چاروں بیٹیوں کے لیے ان کی دیکھا دیکھی تمہارے پاپا بھی ایسے ہی ہوگئے۔ انہیں بھی بہنیں خود پر بوجھ محسوس ہونے لگیں۔ انہوں نے بھی اپنے رویوں پر غور ہی نہیں کیا نہ ہی اپنی سوچ بدلنے کی کوشش کی۔ دو بہنوں کی شادی کرنے کے بعد وہ اب تیسری کی شادی کا سوچ رہے تھے لیکن وہ ایسی جگہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی جہاں اس کی مرضی شامل نہ ہو۔ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ تمہارے دادا اور پاپا کے رویے نے اسے باغی بنا دیا تھا اسی لیے اس نے غلط راہ اپنالی اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ نجانے کہاں گئی جس کی خبر نہ تمہارے پاپا نے بھی لی نہ وہ کبھی پلٹ کر آئی۔''

وہ حیرت سے منہ کھولے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے تو صرف یہ ہی معلوم تھا کہ اس کی تین پھپھو ہیں چوتھی پھپھو کا تو کبھی کسی نے ذکر تک نہیں کیا تھا۔ باقی تین پھپھو بھی پاپا سے کھنچی کھنچی سی رہتی تھیں۔ بھی کسی تقریب میں ہی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ نہ ہی کبھی پاپا ان سے ملنے کی کوشش کرتے نہ انہیں کوئی چاہ تھی بھائی سے ملنے کی۔ وہ ہمیشہ سے ہی نمرہ کی فیملی کو رشک سے دیکھتی تھی۔ ان کے یہاں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا اور آپس میں سب ہی پیار سے رہتے تھے۔ نمرہ کا رشتہ بھی اپنی پھپھو کے بیٹے سے ہوا تھا جس پر وہ خوش اور مطمئن تھی۔

☆.....☆

وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں سے گئی تھی لیکن اس کی خوشبو اسے اب بھی یہاں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ صرف بابا سے ہی باتیں کرتی تھی۔ شمیر کو مخاطب نہ بھی اس نے کیا تھا نہ خود اس نے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اب لاشعوری طور پر وہ اسے ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی عجیب اوٹ پٹانگ باتیں اسے بھی مسکرانے پر مجبور کردیا کرتی تھیں۔ سامنے رکھی فائلز اس کی توجہ چاہتی تھیں لیکن اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ فائلز سمیٹ کر اٹھنے لگا تو بابا وہیں آگئے۔

''بیٹھ جاؤ شمیر مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' انہوں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے کہنے پر وہ فائلز دوبارہ رکھ کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''بیٹا میں تم سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

وہ جو ہونٹوں پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا سیدھا ہو بیٹھا۔ ''بابا یہ سوال آپ مجھ سے کینیڈا میں بھی ہزار بار پوچھ چکے ہیں۔ اُس نے انہیں یاد کروایا۔

''ہاں، لیکن ابھی میرا مقصد تم سے پوچھنا نہیں تمہیں صرف بتانا ہے کہ میں تمہاری شادی ایمن سے کرنا چاہتا ہوں اور اس بارے میں حسن اور بھابی سے بھی بات کرچکا ہوں اور میرا خیال ہے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔'' انہوں نے سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش بیٹھا تھا۔ ان کی بات سن کر اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدلے تھے۔ فاروق صاحب اس کے

بدلتے تاثرات سے کچھ اخذ نہیں کر پائے تھے۔

☆......☆

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے، جو تم ہر روز میرے کالج آجاتے ہو۔'' نمرہ آج کل چھٹی پر تھی اور دانیال کو جیسے موقع مل گیا تھا ایمن سے ملنے کا۔

ایمن کی بات پر اس نے دانتوں کی بھرپور نمائش کی۔ ''کیا کروں!

بڑی بے لگام سے ہو گئی ہیں میری آنکھیں
تیری دید کے مسلسل بہانے ڈھونڈتی ہیں ''

اس نے رومانٹک انداز میں شعر پڑھا تھا۔ ایمن نے ایک مکا اس کے کندھے پر مارا جس پر دانیال نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جلدی بائیک پر بیٹھو تمہیں گھر چھوڑ دوں۔'' دانیال نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں رہنے دو، میں وین پر جاؤں گی۔''

''واہ بھئی، میں اپنی یونی سے بائیک بھگاتے ہوئے یہاں آیا ہوں تاکہ تمہیں پک کر سکوں اور تم وین پر چلی جاؤ گی؟ جلدی بیٹھو۔'' اس نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکالیں۔ ''چلو اب بیٹھ بھی جاؤ۔'' وہ بائیک اسٹارٹ کیے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے وہ خاموشی سے اس کی بائیک پر بیٹھ گئی۔

''سنو!'' وہ بائیک سے اتر کر گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ تب ہی دانیال نے اسے پکارا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ''کہو۔'' وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں سنجیدگی سے اب تمہارے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔'' دانیال نے اس کو اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔

''چھوڑ دو سوچنا۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''سوچ لو، کالج سے پک کر سکتا ہوں تو اٹھوا بھی سکتا ہوں۔''

ایمن نے اس کی بات سن کر قہقہہ لگایا۔ جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔ ''میرے بھائی کو دیکھا ہے جن کے سامنے تمہارا حلق خشک ہونے لگتا ہے۔ وہ تمہیں اٹھوا کر کہیں پھینک دیں گے۔'' اس نے ڈرایا۔

لیکن دانیال کے چہرے پر وہی نرم سی مسکراہٹ تھی۔ ''میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں تمہارے سوا۔''

''اور میں سب کچھ اپنا سکتی ہوں تمہارے سوا۔'' اس نے بھی فوراً جواب دیا۔

دانیال نے اس کی چھوٹی سی ناک پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ''خدا حافظ!'' وہ کہہ کر فوراً گیٹ کھول کر اندر بڑھ گئی۔ یہ دیکھے بنا کہ اسے یوں دانیال کے ساتھ کھڑے دیکھ کر کیا مطلب لیا جائے گا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس لڑکے کے ساتھ وہ آئی تھی، اور جس بے تکلفی سے اس سے باتیں کر رہی تھی وہ اس کے لیے بالکل بھی انجان نہ تھا۔ وہ گہرا سانس لیتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

☆......☆

''کس کے ساتھ آئی ہو۔'' وہ جیسے ہی اپنے کمرے میں آئی، ممی اس کے پیچھے چلی آئیں۔

''دانیال کے ساتھ۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''دانیال کے ساتھ؟ وین میں کیوں نہیں آئیں تم۔'' اسے ممی کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں ممی آپ؟ میں کوئی پہلی بار تو نہیں آئی نا اس کے ساتھ۔''

''آخری بار ہے یہ ایمن۔ آئندہ تم اپنی وین میں ہی آؤ گی، تمہارے پاپا نے دیکھ لیا تو تمہارا کالج جانا بند کروا دیں گے۔ وہ تم سے اتنے بھی بے خبر نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔'' وہ غصے سے کہہ کر کمرے سے چلی گئیں۔ وہ بے بسی کی کیفیت میں وہیں کھڑی رہی۔ ''ممی مجھ پر شک کر رہی ہیں۔'' اسے رونا آنے لگا۔

''ممی، آپ بھی پاپا جیسی ہوتی جا رہی ہیں۔'' اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کس راہ پر چل نکلی ہے ایمن، مجھے اس کے بڑھتے قدم روکنے ہوں گے، ورنہ اگر حسن احمد کو ذرا سی بھنک بھی پڑی اس بات کی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ حسن احمد کے خوف سے ہی لرزنے لگی تھیں۔ صد شکر کہ وہ اس وقت گھر نہیں تھے ورنہ آج نہ جانے کون سی قیامت برپا ہو جاتی۔

جب سے فاروق صاحب نے رشتے والی بات کی تھی وہ ایمن کی طرف سے خاصی محتاط ہو گئی تھیں۔ اسے بہانے بہانے سے گھرداری کے طور طریقے سکھانے کی کوشش کرتی تھیں جسے وہ ہمیشہ کی طرح اگنور کر دیتی۔ حسن احمد نے اس دن کے بعد صاف لفظوں میں ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ ایمن کی شادی شہمیر سے ہی کریں گے اور اس میں ایمن کی مرضی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

''تمہیں اگر شوق ہے اس سے بات کرنے کا تو کر لو لیکن میں اس حق میں نہیں کہ اس کی رضامندی کے انتظار میں اتنا اچھا رشتہ گنوا دوں۔'' ہمیشہ کی طرح انہوں نے کسی کی بھی خوشی کو خاطر میں لائے بغیر اپنا فیصلہ سنایا اور وہ خاموشی سے ان کے فیصلے پر سر جھکا گئیں۔

☆......☆

''شہمیر تم نے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔'' فاروق صاحب نے ناشتا کرتے ہوئے پوچھا۔ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ کل جو اس نے دیکھا وہی اس کے لیے کافی تھا۔ وہ ایک مخلص ساتھی چاہتا تھا اور ایمن ایسی نہیں تھی جیسا اس نے سوچا تھا۔ اس کی اور ایمن کی عمر میں قدرے فرق بھی تھا۔ وہ ایک پریکٹیکل سوچ والا انسان تھا جب کہ ایمن لاابالی سی اپنے اچھے برے سے ناواقف، وہ اپنی زندگی کو کسی تجربے کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فاروق صاحب کی طرف دیکھا جو سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''بابا میں ایمن سے شادی نہیں کر سکتا۔ میری کسی سے کمٹمنٹ ہے اور میں اپنی کمٹمنٹ توڑ نہیں سکتا۔'' اس نے بہانہ تراشا۔

''کیا تمہاری کمٹمنٹ میری خواہش سے بڑھ کر ہے۔'' انہوں نے پوچھا۔ وہ بس خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

''تو شہمیر میری خواہش تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور پھر ایمن میں آخر برائی ہی کیا ہے۔ اچھی لڑکی ہے بیٹا! یہ بات برسوں سے طے تھی۔ میرا تمہیں یہاں لانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ تمہاری کسی سے کمٹمنٹ دو چار سال پرانی ہو گی لیکن میری حسن سے کمٹمنٹ برسوں کی ہے۔ ہمیں اب پاکستان میں ہی رہنا ہے۔ میں تمہیں وہاں اس لیے نہیں لے کر گیا تھا کہ تم وہیں کے ہو کر رہ جاؤ۔'' ان کے لہجے میں اب سختی پنہاں تھی۔ شہمیر سر

جھکائے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ فاروق صاحب آج فیصلہ کرنا چاہتے تھے جس کا اندازہ شہمیر کو ان کے لہجے سے ہو گیا تھا۔

''بابا آپ میری بات نہیں سمجھ رہے۔ وہ مجھ سے کافی چھوٹی ہے عمر میں اور ابھی تو پڑھ بھی رہی ہے۔'' اسے ان کے سامنے انکار کا ہر بہانہ بیکار ہوتا نظر آرہا تھا۔

''عمر کا فرق کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے اور وہ شادی کے بعد بھی پڑھے گی۔ یہ تمہاری ماما کی بھی خواہش تھی۔ آج وہ نہیں ہیں تو کم از کم ان کی خواہش کا ہی احترام کرلو۔'' ان کی بات سن کر ان کی طرف دیکھا جو آنکھوں میں ڈھیروں امید لیے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''بابا ہم اس موضوع کو کچھ عرصے تک ٹال نہیں سکتے۔'' وہ اب ایمن سے خود اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔

''ہم اس موضوع کو بالکل نہیں ٹال سکتے۔ بس ایک دو دن میں حسن کی طرف سے بھی جواب آجائے گا، تو میں تم دونوں کا نکاح کردوں گا۔'' وہ خوشی سے کہہ رہے تھے۔ شہمیر ان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ بالا ہی بالا سب طے کیے بیٹھے تھے۔ اس سے پوچھنے کی تو بس فارمیلٹی نبھا رہے تھے۔

''اتنی جلدی کس بات کی ہے آپ کو۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جارہا۔'' وہ انہیں اکتایا ہوا لگا تھا۔ فاروق صاحب نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

☆......☆

''کہاں جارہی ہو۔'' لاؤنج سے نکلتے ہوئے صبا بھابی کی آواز اسے اپنے پیچھے سنائی دی۔ اس کے چہرے کے زاویے بگڑے۔ ان کی مداخلت اسے کافی ناگوار لگی تھی۔ آج صبح سے ہی اس کا موڈ آف تھا۔ کالج بھی نہیں گئی تھی۔ ممی کا کل والا رویہ اسے پریشان کیے ہوئے تھا۔ ابھی وہ فاروق انکل کے گھر جانے لگی تھی تب ہی بھابی اس کے پیچھے چلی آئیں جو بدقسمتی سے اسی وقت گھر پر ہی تھیں۔ ورنہ تو ان کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزرتا تھا۔

''فاروق انکل کے گھر۔'' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کیوں؟ آخر کیا ہے وہاں جو ہر روز پہنچ جاتی ہو وہاں۔'' انہوں نے ایمن کو سرتاپا گھور کر دیکھا۔

''کیونکہ مجھے وہاں جانا اچھا لگتا ہے۔ آپ کو کوئی پرابلم ہے۔'' اس کا لہجہ صبا بھابی سے بات کرتے ہوئے خود ہی سخت ہو جایا کرتا تھا۔ اسے عمر بھائی کی پسند بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اسی وجہ سے شروع سے ہی ان سے اکھڑی اکھڑی رہتی تھی۔ خود صبا بھابی کو بھی اس کے ساتھ بات کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ اپنا جانے کا ارادہ ملتوی کرتی اپنے کمرے میں آگئی۔

''اچھا خاصا موڈ بنا تھا انکل کے گھر جانے کا۔ ممی کو بھی نہ جانے کیا ہو گیا ہے آج جو مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کررہیں۔'' اسے شدت سے رونا آنے لگا تھا۔ ''سب کچھ میرے ساتھ ہی ہونا ہوتا ہے۔ جسے دیکھو ہر وقت میرے ہی پیچھے ہے ہر کسی کے گھر میں بیٹیاں ہوتی ہیں کوئی کسی کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرتا۔ صرف میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے یہ سب، پاپا مجھ سے پیار نہیں کرتے تو نفرت تو نہ کریں۔ عمر بھائی بھی بالکل انہی کے جیسے ہو گئے ہیں۔'' وہ سب سے ہی خائف ہو گئی تھی۔ وہ غصے میں بھری بیٹھی تھی تب ہی نمرہ اس کے پاس چلی آئی۔

''خیر تو ہے آج تم میرے پاس بقول تمہارے کہ تمہیں اب فرصت نہیں۔ شہری کی پسند کے کھانے بنانا سیکھنے سے۔'' اس نے طنز کیا۔

نمرہ برا مانے بنا مسکرائی تھی۔ ''میں اکیلی نہیں آئی ہوں۔'' اس نے معنی خیز انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔

''کیوں، اپنے ساتھ برات لائی ہو کیا۔'' اس نے چڑ کر کہا۔

''یار تمہیں الہام ہونے لگے ہیں کیا، ویسے بے فکر رہو۔ بارات بھی جلد ہی لے آئیں گے۔'' اس کے انداز میں شرارت تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''ارے میری پیاری دوست، تمہیں میں نے اپنی بھابی بنانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ بس اسی سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔''

''کیا؟'' اسے اس کی بات سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ''منہ دھو رکھے اپنے بھائی سے کہو اپنا، میں نہیں کرنے والی اس سے شادی۔ حرکتیں دیکھی ہیں کبھی اس کی، فلرٹ کرنے سے تو وہ باز نہیں آتا۔'' نمرہ کی بات نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

''کیوں ایسی بھی کیا برائی ہے اس میں۔'' نمرہ کو اس کا یہ کہنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

''تم مجھ سے بہتر جانتی ہو اسے، ہر نئے دن وہ نئے افیئر کے ساتھ ملتا ہے۔ اب میرے پیچھے پڑ گیا۔''

نمرہ نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو انتہا کی منہ پھٹ تھی۔ ''ایمن وہ تمہارے لیے سیریس ہے اسی لیے تو اس نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔''

''پر میں اس کے لیے بالکل بھی سیریس نہیں ہوں۔ اس سے جاکر کہہ دینا کہ میری طرف سے انکار ہے۔'' وہ کہہ کر بالکونی میں آگئی۔ نمرہ کو اس کا انداز عجیب سا لگا۔ آج نہ جانے اسے کیا ہوا تھا جو وہ اس لہجے میں بات کررہی تھی۔

☆......☆

اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ منیزہ حسن کھانا ٹرے میں رکھ کر اس کے کمرے میں لے آئی تھیں۔

''آپ تو شاید مجھ سے ناراض تھیں نا۔'' اس نے انہیں دیکھ کر روٹھے پن سے کہا۔ انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں ناراض نہیں تھی بس اپنی بیٹی کو اس کی غلطی کا احساس دلانا چاہتی تھی۔''

''کیا غلطی کی ہے میں نے۔'' منیزہ حسن نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے اب تک اندازہ نہیں ہوا تھا اپنی غلطی کا۔

''پہلے کھانا کھالو پھر بات کریں گے۔'' انہوں نے کھانے کی ٹرے اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے آپ لے جائیں واپس۔'' وہ کہہ کر رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔

''کھانے سے کیا ناراضی ہے۔ ایمن دیکھو میں نے تمہاری پسند کی بریانی بنائی ہے۔ اب اگر تم نہیں کھاؤ گی مجھے دکھ ہوگا۔'' انہوں نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلانے لگیں اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ اک وہی تو تھیں جنہیں اس کا خیال رہتا تھا۔

''آپ میری کس غلطی پر مجھ سے ناراض تھیں۔'' کھانا کھا لینے کے بعد اس نے پوچھا۔ منیزہ حسن نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ایمن بیٹا! کل جس طرح تم دانیال کے ساتھ اس کی بائیک پر آئیں شکر کہ تمہارے پاپا یا عمر نے نہیں دیکھا۔

بیٹا! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اگر تمہاری وین نہیں آئی تھی تو تم مجھے کال کر دیتیں۔ میں گاڑی بھجوا دیتی۔" انہوں نے نرمی سے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔

"ممی آپ صرف اتنی سی بات پر مجھ سے خفا تھیں۔"

"ایمن یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ اپنا اچھا برا سب سمجھنے کے قابل ہو۔ ایسا کچھ مت کرنا جس کی وجہ سے تمہاری عزت اور میری تربیت پر حرف آئے۔" انہوں نے پیار سے اسے سمجھایا۔ "آج نمرہ اور اس کی امی آئی تھیں اپنے آنے کا مقصد نمرہ نے تمہیں بتایا ہی ہوگا۔" ان کے سوال پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو بیٹا میں یہ نہیں کہتی کہ دانیال یا اس کی فیملی بری ہے لیکن تمہارے بابا ایسا کبھی نہیں چاہیں گے۔ اگر تمہارے دل میں ایسی کوئی بھی خواہش ہے تو اسے یہیں دفن کر دو۔ میں نہیں چاہتی کہ میری تربیت پر کل کوئی حرف آئے۔ عمر اپنی مرضی کر سکتا ہے کیونکہ اس گھر میں بیٹیوں کے لیے وہ اصول نہیں ہیں جو بیٹوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔" وہ خاموشی سے سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"ایمن! فاروق بھائی نے شہمیر کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے اور تمہارے بابا نے انہیں اپنی رضامندی دے دی ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" وہ اسے جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ انہیں نہ جانے کیوں ایمی سے ڈر سا لگ رہا تھا۔

"ایمی کیا ہوا؟" اسے بالکل خاموش بیٹھے دیکھ کر منیزہ حسن نے پوچھا۔ اس نے ان کے کندھے پر اپنا سر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

"ایمن!" انہوں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔

"ممی! میری مرضی یہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کس بھروسے پر انکار کروں۔ ہوگا تو وہی جو بابا چاہتے ہیں۔ آپ تو صرف اپنے دل کی تسلی کے لیے مجھ سے پوچھنے آئی ہیں اور ممی میں نے کبھی دانیال کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ میں اپنی کل والی غلطی پر آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ آپ کا دل دکھاؤں یا آپ مجھ سے ناراض ہوں۔ جس طرح کل آپ کا رویہ میرے ساتھ تھا میں آپ کی طرف سے بھی بدگمان ہونے لگی تھی۔" اب نروٹھے پن سے کہہ رہی تھی۔

انہوں نے مسکرا کر اس کی پیشانی چومی۔ "بس بیٹا وقتی طور پر میں بھی غصہ ہو گئی تھی لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس سے بات کر کے ان کے دل میں پلتے وسوسے ختم ہو گئے تھے۔

"بیٹا! شہمیر اچھا لڑکا ہے جب بھی مجھ سے ملا بہت عزت دی ہے اس نے، وہ بالکل بھی عمر یا تمہارے بابا جیسا نہیں ہے۔ وہ ان سب سے مختلف ہے اور دیکھنا وہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا۔" منیزہ حسن نے اس کے ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے کہا۔

"ممی یہ تو وقت بتاتا ہے کہ کون کیسا ہے۔ میں نے بابا سے بہت سی توقعات لگا رکھی تھیں لیکن میں غلط تھی۔ وہ کبھی نہیں بدل سکتے اور میں اب شہمیر فاروق سے کوئی بھی امید نہیں باندھنا چاہتی۔ جو ہونا ہوگا وہ ہو کر ہی رہے گا آپ یا میں اسے ٹال نہیں سکتے۔" اس کے لہجے میں جو اداسی پنہاں تھی منیزہ حسن سے وہ چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ انہوں نے دل سے اس کی خوشیوں کی دعا کی۔

☆......☆

حسن احمد نے فاروق صاحب اور شہمیر کو آج شام کھانے پر بلایا تھا۔ وہ انہیں اپنی رضامندی تو دے ہی چکے تھے۔

اس وہ اب جلد باضابطہ طور پر کوئی رسم کرنا چاہ رہے تھے۔ وہ سب لاؤنج میں موجود تھے۔ تب ہی دانیال کے گھر والے آئے تھے اور انہوں نے آنے کی وجہ حسن احمد کو بتائی۔ شہمیر خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ ایمن اس رشتے کے لیے رضامند نہیں ورنہ سب کچھ طے ہو جانے کے بعد ان کا اس طرح سے آنا نہیں بنتا تھا۔ فاروق صاحب کی لاکھ منتوں کے بعد تو اس نے اپنی رضامندی دی تھی۔ حسن احمد نے تیکھی نظروں سے منیزہ حسن کی طرف دیکھا۔ وہ اس سارے معاملے سے بے خبر ہی رہتے جو گر آج یہ سب یوں نہ آتے۔ منیزہ حسن مجرموں کی طرح سر جھکائے ان کے سامنے کھڑی تھیں۔

"کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ۔" حسن احمد نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔ منیزہ حسن کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ وہ اسی لمحے کے ڈر کی وجہ سے ان سے سب کچھ چھپا رہی تھیں۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے۔ کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ۔" منیزہ حسن کو خاموش کھڑا دیکھ کر انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

"حسن ہم سب کی طرح ایمی بھی اس بات سے لاعلم ہے۔" انہوں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ حسن احمد کے تیور بتا رہے تھے وہ اب کچھ کر گزریں گے۔ نہ جانے ان لوگوں کے جانے کا انتظار کس طرح کیا حسن احمد نے۔

"قصور کس کا ہے۔ ابھی پتا چل جائے گا۔" وہ کہہ کر اپنے روم سے نکل کر سیدھا ایمن کے روم کی طرف بڑھے۔ منیزہ حسن خوف سے کانپنے لگیں۔ ایمن سب باتوں سے بے خبر ان کا جارحانہ رویہ دیکھ کر سہم گئی۔ وہ سیدھا اس کے سر پر جا کھڑے ہوئے۔ اسے لگا کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شہمیر فاروق سے شادی کی صورت میں بابا کے سامنے اس کا مقام بدل جائے، شاید وہ اس کی اہمیت کا اندازہ کر پائیں لیکن یہاں سب اس کی سوچ کے برعکس تھا۔

"کک...... کیا ہوا...... بابا......؟" الفاظ ٹوٹ کر نکلے تھے۔ تب ہی ان کا ہاتھ اٹھا تھا اور اپنے نشان اس کے گال پر چھوڑ گیا تھا۔ وہ لڑھک کر بیڈ پر گری۔ ایمن نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ حسن صاحب نے بے رحمی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے مقابل کھڑا کیا۔

"کون سا کھیل رچا رہی ہو تم میرے ہی گھر میں میری ناک کے نیچے، کیوں آئے تھے دانیال کے گھر والے؟" انہوں نے اس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔

تکلیف سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے لیکن حسن احمد کو اس وقت لگا تھا کہ وہ ایمی نہیں ان کی اپنی بہن ہے جس نے ماضی میں ان سب کو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ عمر اور بھابی ان کی آواز سن کر ان کے کمرے میں آئے تھے۔ منیزہ حسن دیوار سے جڑی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ ان میں ذرا ہمت نہیں تھی کہ اپنی بیٹی کو بچا سکیں۔ انہوں نے عمر کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا لیکن وہ سینے پر ہاتھ باندھے تماشائیوں کی طرح کھڑا رہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی بابا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر کس کی شہ پر دانیال نے اپنے گھر والوں کو بھیجا تھا۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں آپ میرا یقین کریں میں کچھ نہیں جانتی۔" انہوں نے اس کا بازو جھٹکے سے چھوڑا تھا۔ وہ لڑکھڑائی۔

"دیکھ لوں گا میں اس دانیال کو بھی۔" وہ اس پر ایک قہر بھری نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ عمر اور بھابی ان کے ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔

منیزہ حسن نے ایمن کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کے پاس آئیں۔

''ایمی!'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا۔

''ممی یہ سب کیا ہو گیا۔'' وہ سرخ آنکھیں لیے ان سے پوچھ رہی تھی۔

اور وہ خاموش کھڑی اس کے چہرے پر حسن احمد کی انگلیوں کے چھپے نشان دیکھ رہی تھیں۔

☆.....☆

''بابا آپ پلیز انکل کو انکار کر دیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ایمن کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے۔'' وہ جب سے وہاں سے آیا تھا کافی بے چین تھا جب کہ اس کے برعکس فاروق صاحب قدرے پرسکون نظر آ رہے تھے۔

''کیوں انکار کر دوں اور حسن نے مجھے تسلی دی ہے کہ ایمن کی رضامندی سے ہی یہ رشتہ طے پایا ہے اور اگر آج ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے یہ سب سوچ رہے ہو تو یہ فضول باتیں سوچنا چھوڑ دو۔ وہ لوگ ایمن کا تم سے رشتہ طے ہو جانے والی بات سے بے خبر تھے اسی لیے آئے ورنہ شاید نہ آتے اور حسن مجھے کہہ چکا ہے کہ وہ ایمن کی شادی جلد کرنا چاہتا ہے۔ جس پر مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' انہوں نے تفصیل سے اسے سب بتایا۔

وہ وہیں لان میں بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح فاروق صاحب کو بتائے کہ اس نے خود ایمن کو دانیال کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ کیسے انہیں سمجھاتا، اس کا خود کا دل اس رشتے پر رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایمن کو شیری کی منگنی پر پہلی بار دیکھا تھا جہاں وہ اپنے دوپٹے سے الجھ رہی تھی۔ اس کے بعد اسے دانیال کے ساتھ بھی دیکھ چکا تھا۔ شیری کی اس سے ملاقات ایک بزنس میٹنگ میں ہوئی تھی تب ہی اس سے اچھی علیک سلیک ہو گئی تھی اور اس نے اپنی منگنی پر بھی اسے انوائٹ کیا۔ وہ خاموش بیٹھا یہ ہی سوچتا رہا۔

☆.....☆

وہ یک ٹک اپنے سامنے رکھے اس عروسی لباس کو دیکھ رہی تھی جو کچھ دیر پہلے ہی صبا بھابی اس کے سامنے رکھ کر گئی تھیں۔ اسے شدت سے رونا آیا تھا اپنی قسمت پر، کیا قصور تھا پاپا میرا جو آپ اتنے سنگ دل ہو گئے ہیں۔ اس دن کے بعد سے عمر بھی اس سے کترا رہا تھا اور صبا بھابی کا ہر انداز طنز بھرا تھا۔ منیزہ حسن الگ اس سے نظریں چرا رہی تھیں۔

''پاپا آپ اتنے پتھر دل کیوں ہیں؟''

''تم اب تک تیار نہیں ہوئیں یہاں مہمان تمہارے انتظار میں بیٹھے نہیں رہیں گے۔ جاؤ اور جا کر تیار ہو۔'' بھابی نے ڈریس اس کے ہاتھ میں تھما کر باتھ روم کی طرف دھکیلا۔

اگر یہ سب عام حالات میں ہوتا تو وہ قبول کر لیتی لیکن اب جب اس پر الزام تراشی کی جا رہی تھی تو پاپا کو اور کوئی راستہ نہ سوجھا سوائے اس کی شادی کر دینے کے۔ منیزہ حسن خود کو مصروف رکھنے کے بہانے کاموں میں مصروف تھیں۔ ان میں ہمت نہیں تھی کہ اس سے تسلی کے دو بول ہی کہہ سکیں۔ آناً فاناً نکاح ہوا۔ نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے اس کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ غائب دماغی سے وہ یہ سب ہوتا دیکھ رہی تھی۔

منیزہ حسن نے حیرت سے اس کے سوگوار حسن کو دیکھا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ان کی چہیتی ایمی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے کھینچ کر اسے خود سے لگایا تھا وہ جو کب سے خود پر ضبط کیے بیٹھی تھی ان کی محبت پا کر زار و قطار رو پڑی۔

☆.....☆

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پورا کمرا سرخ پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ اسے اس ماحول سے وحشت ہونے لگی تھی۔

بستر سے اٹھ کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ مسلسل رونے کی وجہ سے آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ میک اپ بھی مٹا مٹا سا تھا۔ اتنے دنوں کی ذہنی اذیت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایک ایک کر کے اس نے اپنی ساری جیولری اتارنا شروع کی تب ہی دروازہ کھول کر شمیر فاروق کمرے میں آیا۔ اسے بیڈ پر موجود نہ پا کر اس نے پورے کمرے میں نظر دوڑائی تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ دروازہ کھلنے پر بھی اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وہ خاموشی سے اندر آیا اور ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ ایمن نے ایک نظر ڈریسنگ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا پھر وہیں رکھی چیئر پر بیٹھ کر اپنی چوڑیاں اتارنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں شمیر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کتنی ہی دیر وہ خاموشی سے کھڑا اس کے جھکے سر کو دیکھتا رہا۔ ایمن کو اب اس کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر نظریں خود بہ خود جھک گئی تھیں۔ شمیر نے گہرا سانس لیا۔

''سوچ رہا ہوں تمہیں منہ دکھائی میں پہلے کیا پیش کروں۔ چلو یہ دے دیتا ہوں ورنہ اس کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔'' شمیر نے چوڑیوں کا خوب صورت کیس اس کی جھولی میں پھینکا۔ ایمن نے نظر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے شمیر فاروق کو دیکھا جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ ''یہ لو، تمہارا ہی ہے۔ غلطی سے تمہاری بالکونی میں گرنے کے بجائے میرے گھر کے لان میں آ گرا تھا۔''

ایمن نے حیرت سے اس کے طنز پر اسے دیکھا۔ شمیر کی آنکھوں میں جو پہلے کبھی اس کے لیے نرمی ہوا کرتی تھی اب وہ وہاں نہیں تھی۔ ہونٹوں پر جو دستانہ مسکراہٹ ہوتی تھی اب اس کی جگہ طنز نے لے لی تھی۔ شمیر نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس کی طرف بڑھایا جسے ایمن نے کانپتے ہاتھوں سے تھاما تھا۔ اس نے کھولا تھا وہ دانیال کا خط تھا۔ اتنی ٹھنڈ میں بھی اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔ نہ جانے اس نے اپنی کون کون سی محبتوں کا اسے یقین دلایا تھا۔ کال نہ اٹھانے کا شکوہ کیا تھا۔ وہ اس تمام عرصے میں اسے لاتعداد کال کر چکا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اپنا سیل بھی آف کر دیا تھا اور اب اس کا یہ خط..... اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے شمیر فاروق کو دیکھا جو قہر بھری نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ایک اور آزمائش؟ ممی تو اسے یہی کہتی رہی تھیں کہ شمیر ان سب جیسا نہیں ہے۔ وہ بہت کھلے دل کا مالک ہے۔ تمہارا بہت خیال رکھے گا لیکن اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کتنے کھلے دل کا مالک ہے یہ شخص۔ اپنی صفائی میں کہنے کے لیے اس کے پاس ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ جو گناہ اس نے کیا ہی نہیں تھا اس کی سزا وہ بھگت رہی تھی۔

''انا ہی شوق تھا اگر یہ سب کرنے کا تو میری زندگی تباہ کرنے کیوں چلی آئیں تم اس کے ساتھ اتنا آگے تک آ گئی تھیں تو کچھ ہمت کر کے سب کے سامنے بھی کوئی اسٹیپ لے لیتیں۔ کم از کم میں تو سکون میں ہوتا۔'' وہ اب غصے سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

اس کی باتوں سے ایمن کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''کوئی جگہ نہیں ہے ایمن میرے دل میں اب تمہارے لیے کاش کہ میں تمہیں پہلے ہی جان جاتا۔ بہتر ہو گا کہ اب تم میرے سامنے نہ آؤ۔ وہ رہا اسٹڈی روم، خبردار جو مجھے اپنی شکل بھی دکھائی تو۔'' وہ انگلی اٹھا کر اسے وارن کر رہا تھا۔ وہ حیرت سے اس کا یہ روپ دیکھ رہی تھی۔ وہ چکراتے سر کو تھام کر اٹھی۔ جھولی میں رکھا جوڑیوں کا

کیس نیچے گر گیا۔ دوپٹا سر سے اتر کر آدھا کندھے پر آدھا زمین پر جھول رہا تھا۔ وہ من من بھاری قدم اٹھاتی اسٹڈی روم کی طرف بڑھی تھی۔ شمیر کے ان الزامات نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

''دانیال میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرا مکمل روشن تھا۔ اس نے کہنیوں کے بل اٹھ کر دیکھا سامنے کی کھڑکی کھلی تھی جس کی وجہ سے کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ واپس لیٹ گئی۔ رات روتے روتے نجانے کب آنکھ لگ گئی تھی۔ اب وہ خود میں اٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ جسم کا ہر عضو دکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر یونہی لیٹے وہ چھت کو گھورتی رہی۔ کل رات جو شمیر کا رویہ تھا وہ کسی بھی طور بھلانے والا نہ تھا۔ اتنی اذیت اتنی ذلت شاید ہی کبھی ملی تھی۔ گزری رات کا منظر آنکھوں میں ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ شمیر فارق میں تمہیں زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔ اس نے پہتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

''تمہیں بخار ہے۔'' ممی نے اس کی کلائی تھامی تو انہیں اندازہ ہوا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے انہیں بنا دیکھے جواب دیا۔

''ایمن کیا تم مجھ سے بھی ناراض ہو جو یوں بے اعتنائی برت رہی ہو۔'' منیزہ حسن اس کی یہ حالت دیکھ کر کرک کر رہ گئی تھیں۔ ویسے کی تقریب کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی بس خاموش ہی بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا ہے کچھ تو کہو۔'' منیزہ نے اس کے چہرے کا رخ اپنی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہوں ممی میں آپ پر یشان نہ ہوں۔'' اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ حقیقتاً اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور چلی جائے جہاں کوئی اس پر الزام لگانے والا نہ ہو۔ بھابی کی بدولت اس کی جلد شادی کا خاندان بھر میں سب ہی کو علم ہو گیا تھا۔ ہر طرف اس کے نام کے ساتھ دانیال کا نام جوڑا جا رہا تھا۔ ویسے کی تقریب میں بھی یہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ کل رات کے بعد شمیر نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ دکھ تو اسے اس بات کا تھا کہ اس کی بات سنے بنا کیسے اس شخص نے اسے اتنی سخت سزا سنا دی تھی۔

☆.....☆

اس نے کالج جانا ترک کر دیا تھا۔ فاروق صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

''کالج کیوں نہیں جا رہیں تم۔'' انہوں نے چائے کا کپ اس سے لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ کندھے اچکا کر ان کے پاس رکھی چیئر پر بیٹھ گئی۔

''کہو بھئی کالج نہیں جانا کیا۔'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''دل نہیں چاہتا۔'' اس نے یہ کہہ کر چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔

''ایمن بیٹا جو کچھ ہوا میں جانتا ہوں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے اور پھر یہ کیا بات ہوئی کہ تم اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دو۔ اتنے دن سے تم کالج نہیں گئیں کتنا حرج ہوا ہے تمہاری پڑھائی کا میں چاہتا ہوں ایمن کہ تم اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ چھوڑ دو لوگوں کی باتوں پر دھیان دینا یہ جو آج تم پر انگلی اٹھا رہے ہیں وہی لوگ کل کسی اور کو اپنا نشانہ بنائیں گے پھر کسی کی تضحیک کریں گے۔ ان سب کی باتوں پر دھیان مت دو اور رہ گیا شمیر تو بیٹا اسے کچھ وقت دو

میں نے اسے بہت سمجھایا ہے لیکن وہ وہی دیکھ رہا ہے جو اب تک اسے دکھایا گیا ہے لیکن دیکھنا وہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اسے پیار سے سمجھا رہے تھے اور وہ چائے کا کپ ہاتھوں میں تھامے بغور ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''پاپا، انکل جیسے کیوں نہیں ہیں؟'' ہمیشہ کی طرح یہ سوال پھر ذہن میں آیا تھا۔ وہ جب بھی ان سے باتیں کرتی یہی سوچتی رہتی کہ پاپا ان کی طرح اس کے لیے فکرمند کیوں نہیں ہوتے، کیوں نہیں وہ بھی اس کے لیے کسی سایہ دار شجر کی طرح کھڑے رہے۔ حسن احمد نے ایمن سے مکمل طور پر بات چیت بند کر دی تھی۔ وہ اگر منیزہ حسن سے ملنے چلی بھی جاتی تو حسن احمد کی جانب آس سے دیکھتی رہتی کہ اب وہ اسے سینے سے لگائیں گے لیکن یہ سب کچھ اس کی سوچ تک ہی رہتا۔ وہ روتی ہوئی واپس آجاتی۔ یہ عہد کر کے اب بھی وہاں نہیں جائے گی لیکن پھر منیزہ حسن کی یاد ستاتی تو ہر بات بھلا کر ان کے پاس چلی جاتی۔

''بتاؤ ایمن کل سے تم کالج جاؤ گی نا؟'' فاروق صاحب نے اسے سوچوں میں غرق دیکھ کر پوچھا۔ ایمن نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ان کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی اسی لیے جلد ہی مان گئی۔

☆.....☆

زندگی دوبارہ اپنی روٹین کی جانب پلٹ آئی تھی۔ وہ پھر سے اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ شمیر سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔ اس نے اسٹڈی روم کو ہی اپنا کمرا بنا لیا تھا۔ شمیر کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی وہ اسٹڈی میں چلی جاتی۔ وہ اب خوش نہ بھی تو زیادہ غمزدہ بھی نہیں تھی۔ انکل اکثر اسے اپنے ساتھ باہر لے جاتے تھے۔ اس سے ڈھیر ساری باتیں کرتے۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ ان ہی کے ہی کہنے پر اس نے نمرہ سے بات چیت شروع کر دی تھی۔ اس واقعے کے بعد اس نے نمرہ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ انکل کے سمجھانے پر اسے احساس بھی ہوا تھا کہ اس سب میں نمرہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔

☆.....☆

اسے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ غلطی پر ہے۔ بابا بھی ہر وقت اسے یہی سمجھاتے رہتے تھے کہ ایمن نادان ہے۔ اگر اس کی کوئی غلطی ہے بھی تو تم فراخ دلی کا ثبوت دو۔ اتنے تنگ ذہن مت بنو۔ لیکن وہ مرد تھا اس کی انا کو یہ کہاں گوارا تھا کہ وہ جھکے۔ اب بھی وہ ایمن کی طرف سے ہی پہل کا منتظر تھا۔ وہ جھکنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا دل اسے جھکنے پر مجبور کر رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے اس کی تیاری کا جائزہ لے رہا تھا جو کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ وہ جیسے ہی کچھ اٹھانے کے لیے جھکی اس کے گھنے بال کسی آبشار کی طرح اس کے گرد پھیلے۔ شمیر آنکھیں کھولے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ آج پہلی بار اس نے اسے ایسے دیکھا تھا اور نہ وہ جب بھی اس کے سامنے آئی تھی دوپٹا ہمیشہ اس کی پیشانی تک کو چھپائے رکھتا تھا۔ بال دیکھنا تو دور کی بات تھی۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس کی جانب دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی تیاری کو آخری ٹچ دے کر جیسے ہی کمرے سے نکلنے لگی تب ہی شمیر نے اسے پکارا۔ ایمن نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ سو رہا ہے اسی لیے بڑے آرام و سکون سے وہاں موجود تھی۔

''رکو میں چھوڑ دیتا ہوں تمہیں کالج۔'' وہ کھڑا ہوا۔ ایمن کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا اس نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا کہاں یہ شخص اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں تھا اور اب یہ مہربانی!!

''میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس نے سرد مہری سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

☆.....☆

شمیر کا ارادہ اسے کالج سے پک کر کے لنچ پر لے جانے کا تھا۔ اسی لیے وہ آفس سے جلدی نکل آیا تھا۔ ایمن کالج کے گیٹ پر ہی کھڑی تھی جب کہ اس کے ذرا ہی فاصلے پر دانیال اپنی بائیک پر تھا۔ شمیر نے ان دونوں کو دیکھ کر گاڑی قدرے فاصلے پر روکی تھی۔ دانیال کو دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ سر ہلا کر ایمن سے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا جب کہ ایمن اپنی بکس سینے سے لگائے بے تاثر چہرہ لیے اپنے آگے دور دیکھ رہی تھی۔ شمیر کا سارا دھیان ایمن کے چہرے کی طرف تھا۔ دانیال اور بھی نجانے کیا کچھ کہہ رہا تھا جس اس کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ تب ہی نمرہ آئی اور دانیال کے ساتھ بائیک پر بیٹھ گئی اور دانیال نے بائیک آگے بڑھا لی۔ ان کے جاتے ہی شمیر نے گہرا سانس لیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھا ایمن کے سامنے لا کر روکی۔ ایمن اسے سامنے دیکھ کر چونکی کیونکہ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس کے کالج آیا تھا۔ شمیر نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور فرنٹ ڈور کھولا، وہ ڈرتے ڈرتے گاڑی میں بیٹھی تھی۔ دانیال ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو یہاں سے گیا تھا ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ شمیر نے اسے دیکھا نہ ہو۔ اس نے ایک دو بار شمیر کی طرف دیکھا کہ ابھی وہ اسے کچھ کہے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کالج سے گھر تک کا راستہ خاموشی میں ہی کٹا تھا۔ وہ اسے گھر کے باہر ہی چھوڑ کر خود چلا گیا تھا۔ ایمن اس کے رویے پر حیران تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ شمیر اسے کچھ کہے گا، غصہ کرے گا لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ شاید انہوں نے دانیال کو دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ یہی سوچ کر مطمئن ہوگئی۔

ایمن چینج کر کے آئی تو فاروق صاحب کھانے پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب باتیں بھول کر ان کے ساتھ کھانے میں مصروف ہوگئی۔ وہ اپنے کالج کی ساری ہی باتیں ان سے شیئر کرتے لگی تھی۔ اس نے جب انہیں بتایا کہ کالج کا ایک گروپ ایک ہفتے کے لیے نادرن ایریاز جا رہا ہے تو فاروق صاحب نے اسے بھی جانے کے لیے رضامند کر لیا لیکن شمیر نے سنا تو اس نے فوراً منع کر دیا۔

''تم سے رائے کس نے لی ہے۔ ایمن کی تیاری میں نے کروانی ہے، خود تم اسے اپنے ساتھ کہیں لے کر نہیں جانا چاہتے اور اب اس کے لیے آؤٹنگ کا اچھا موقع ہے تو تم منع کر رہے ہو۔''

''بابا اس کا جانا کوئی ضروری تو نہیں ہے۔'' اس کے انداز سے واضح طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس کے جانے پر ناخوش ہے لیکن فاروق صاحب بھی اپنی بات کے پکے تھے۔ اس کی کسی بھی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایمن کو بھیج دیا۔

اسے یہاں آئے تین روز گزر چکے تھے۔ انکل سے تو روز ہی اس کی بات ہو جاتی تھی لیکن شمیر نے ایک بار بھی اسے فون نہیں کیا تھا۔ وہ یہاں آ کر لاشعوری طور پر صرف شمیر ہی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس کا شمیر سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس دن دانیال کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ خود بھی غصہ ہوگئی تھی۔ وہ اپنے گزشتہ رویے پر اس سے معافی مانگ رہا تھا لیکن وہ اس کی ہر بات ان سنی کیے خاموش کھڑی تھی۔ اسی شخص کی بچکانہ حرکتوں کی وجہ سے ہی تو اس کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کیسے اسے معاف کر دیتی۔ نمرہ سے اس کی بات چیت ہوتی تو تھی لیکن وہ پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔ جس بے تکلفی سے وہ پہلے بات کرتی تھی اب نہیں کرتی تھی۔ وہ اس وقت پہاڑی علاقوں میں تھے جہاں برف باری کی وجہ سے موبائل کے سگنل کا پرابلم ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ گھر بات ہو جائے لیکن ایسا ممکن ہی نہیں ہو رہا تھا۔

☆.....☆

وہ واپس آئی تو ایک قیامت اس کی منتظر تھی۔ منیزہ حسن نے اسے جب فاروق صاحب کی اچانک وفات کا بتایا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے دیوار کا سہارا لیا تو منیزہ حسن نے اسے پکڑ کر چیئر پر بٹھایا تھا۔

''کیسے ہوسکتا ہے ممی! میں انہیں بالکل ٹھیک چھوڑ کر گئی تھی۔'' وہ بے یقینی کی کیفیت میں ان سے پوچھ رہی تھی۔

''بیٹا! ان کا بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ان کے سر میں شدید چوٹیں آئی تھیں جس کی وجہ سے وہ بہ مشکل چند ہی گھنٹے جی پائے۔ بیٹا ہم نے بہت کوشش کی کہ تم سے رابطہ ہو سکے لیکن تمہارا فون مسلسل آف جا رہا تھا۔''

اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ انکل اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں ہمیشہ کے لیے۔ ایک وہی تو تھے جو ہر وقت اس کے لیے سایہ بنے رہتے تھے۔ سب کے سرد رویے اسے اب اذیت نہیں دیتے تھے۔ ان کا رویہ اتنا محبت سے پُر ہوتا تھا کہ اسے کوئی کمی کبھی نہیں لگتی تھی۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆.....☆

وقت اپنے گہرے اثرات چھوڑ گیا تھا۔ شمیر جو پہلے کچھ بول لیا کرتا تھا اب تو بالکل ہی گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایمن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے بات کر سکے وہ ہر وقت انکل کو ہی یاد کرتی رہتی۔ وہی ایک واحد شخص تھے جو اسے خود سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھتے تھے۔ دونوں ہی خاموشی سے ایک ہی دکھ کاٹ رہے تھے۔ شمیر نے خود کو آفس میں اتنا مصروف کر لیا تھا کہ رات کو بھی دیر سے گھر آتا۔ ایمن خود کو یہاں مصروف رکھتی کالج سے واپس آنے کے بعد سارا دن گھر پر ہی رہتی۔ انکل کو یاد کرتی، ان کی باتوں کو سوچتی اور آبدیدہ رہتی تھی۔

☆.....☆

وہ کچن میں اپنے لیے کھانا گرم کر رہی تھی تب ہی ملازمہ نے اسے بتایا کہ شمیر نے اسے بلایا ہے۔ وہ ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی۔ اس وقت شمیر اکثر گھر پر نہیں ہوتا تھا۔ وہ کھانا وہیں چھوڑ کر اس کے کمرے میں آئی جہاں وہ اپنی پیکنگ کرنے میں مصروف تھا۔ اسے بیٹھنے کا کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایمن اس کی بات کو نظر انداز کیے خاموشی سے کھڑی اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ شمیر نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ آج نہیں کل تو اسے یہ بات بتانا ہی تھی تو ابھی کیوں نہیں۔

''ایمن ہمارے درمیان صرف کاغذی رشتہ ہے اور یہ رشتہ بھی بس بابا کی خواہش پر ہی رہا۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو میں اس کاغذی رشتے کو اور نہیں نبھا سکتا۔ میں واپس کینیڈا جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں رہ سکتی ہو یا اپنے گھر واپس جا سکتی ہو۔ یہ طلاق کے پیپرز ہیں۔ تم سائن کر دو پھر میں بھی کر دوں گا۔'' شمیر نے پاس رکھے پیپرز اٹھا کر اس کی طرف بڑھائے۔ ایمن نے اس سنگدل کی طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز پر شمیر نے نظریں چرا لیں۔

وہ پیپرز ہاتھ میں لیے اس کی طرف بڑھا۔ ایمن نے اس کے ہاتھ سے پیپرز لے کر ایک ہی لمحے میں انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

''آپ کو جانا ہے تو شوق سے جائیں لیکن جو رشتہ انکل کی وجہ سے ہمارے درمیان ہے وہ یونہی رہے گا تاعمر۔''

وہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔

وہ پٹن میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آج ہی تو وہ سوچ رہی تھی کہ وہ شہیر سے بات کرے گی۔ اپنی ساری غلطیوں پر اس سے معافی مانگے گی جو اس نے دانستہ یا نادانستہ کی تھیں لیکن اس نے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ تو اپنی طرف سے اس کے لیے آزادی کا پروانہ لیے کھڑا تھا۔ وہ تو محبت کرنے لگی تھی اس شخص سے جو اس کی طرف نظر بھر کر دیکھتا تک نہ تھا۔ وہ اس کے لیے خود کو بھلا رہی تھی اور وہ کتنی آسانی سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ رشتہ اب مزید نہیں رکھنا چاہتا۔

☆.....☆

وہ جب اپنا بیگ گھسیٹتے ہوئے گھر میں آئی تو منیزہ حسن اور صبا بھابی لاؤنج میں ہی موجود تھیں۔ اسے یوں بیگ سمیت آتے دیکھ کر منیزہ حسن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا یوں اچانک۔" انہوں نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔ انہیں ایمن کے یوں اچانک سامان سمیت آنے نے خوف زدہ کر دیا تھا۔

"شہیر کینیڈا جا رہے تھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں تو میں یہاں آگئی۔" وہ ان کے سوال کا جواب دے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ایک آس ایک احساس
میری سوچ
اور بس تم
ایک سوال ایک مجال
تمہارا خیال اور بس تم
ایک بات ایک شام
تمہارا ساتھ.....اور بس تم
ایک بات کی ایک فریاد
تمہاری یاد
اور بس تم
میرا جنون میرا سکون
بس تم.....
اور بس تم.....

☆.....☆

وہ چھت پر موجود تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار کی جگہ اب تیز بارش نے لے لی تھی۔ خود سے بے نیاز وہ بارش میں بھیگ رہی تھی۔ اس کی سوچوں کا مرکز صرف اور صرف شہیر فاروق ہی تھا۔ وہ اسے بھولنا چاہتی تھی لیکن بھول نہیں پا رہی تھی۔ وہ اسے یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن وہ ہر بار یاد آ رہا تھا۔ ان گزرے پانچ سالوں میں اس کی محبت میں بالکل بھی فرق نہیں آیا تھا۔ خیالوں میں وہ اسے اپنے سامنے محسوس کرنے لگی تھی۔ منیزہ حسن اسے بلانے کے ارادے سے چھت پر آئیں تو اسے یوں بارش میں بیٹھے دیکھ کر وہیں رک گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اب ان کے

بلانے کا اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ یونہی بارش میں بھیگتی رہے گی چاہے وہ اس کی لاکھ منتیں ہی کیوں نہ کر لیں۔

☆.....☆

بارش میں بھیگنے کی وجہ سے وہ اب بخار میں چھنک رہی تھی۔ منیزہ حسن اس کے پاس بیٹھی سارا وقت اس پر کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ وہ غنودگی میں بھی صرف شہیر فاروق کا ہی نام پکار رہی تھی۔ منیزہ حسن اس کی یہ حالت دیکھ کر کڑھ گئی تھیں۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ جا کر شہیر فاروق کا گریبان پکڑ کر اس سے اپنی بیٹی کا قصور پوچھیں۔ کیوں کر گیا وہ اس کی یہ حالت ان کے کھلتے گلاب کو کملا دیا تھا اس شخص نے۔

☆.....☆

"کیوں کرتی ہو ایمن، ایسے کیوں مجھے تنگ کرتی ہو میرا قصور کیا ہے۔" انہوں نے سوپ کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ممی! آپ بتائیں کہ میرا کیا قصور ہے جو میں میرے ساتھ یہ سب ہوا۔"

"بیٹا یہاں قصور کسی کا نہیں ہوتا سب ہی کسی نہ کسی کی دی ہوئی سزا بھگت رہے ہوتے ہیں۔ تمہارے پاپا چاہتے ہیں کہ تم اپنی پڑھائی پھر شروع کرو، انہیں اب اپنی غلطیوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ منیزہ حسن نے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"ممی اب مجھے میری مرضی سے جینے دیں پلیز، پاپا نے جو کچھ بھی کیا میرے ساتھ، میں کبھی بھی ان سے خفا نہیں ہوئی۔ آپ ہی تو کہتی ہیں وہ باپ ہیں میرے۔ جو بھی فیصلہ کریں گے میرے حق میں وہی بہتر ہوگا۔ اب تو آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ ان کا فیصلہ میرے حق میں کتنا بہتر رہا ہے۔" اس نے آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ایمن میں نہیں چاہتی کہ تم اپنا دل ان کی طرف سے خراب کرو۔ مجھے بھی تو دیکھو میں بھی تو وہ رہی ہوں یہاں ہر بات نظر انداز کر کے جہاں میرا بولنے کا بھی حق ہے وہاں بھی خاموش کروا دیا جاتا ہے۔ بیٹا ایک عورت کو نجانے کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے ہر دکھ سہنا پڑتا ہے۔ پہلے باپ بھائی پھر شوہر اور اس کے بعد بیٹے کی تابعداری کرنی پڑتی ہے اور عمر یونہی گزر جاتی ہے۔" منیزہ کی باتوں نے باہر کھڑے حسن احمد کا سر شرمندگی سے جھکا دیا تھا۔ وہ نہ تو اچھے شوہر بن سکے تھے نہ ہی اپنی بیٹی کے لیے اچھے باپ۔ ان میں اب اندر جا کر ایمن کی طبیعت پوچھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ دروازے سے ہی پلٹ آئے تھے۔

☆.....☆

"آج کسی نمبر سے ایمن کے لیے کال آئی تھی۔ کوئی لڑکا تھا۔ اتنی بے تابی سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا جیسے نجانے کب سے جانتا ہو اسے۔" سب ہی لاؤنج میں موجود تھے۔ تب ہی صبا بھابی نے بلند آواز میں یہ بات عمر کو بتائی تھی۔

تسبیح پڑھتی منیزہ حسن نے رک کر صبا کی جانب دیکھا۔ حسن احمد اور عمر نے بھی اپنا رخ صبا کی طرف کیا۔ "نجانے اس عورت کو میری بیٹی سے کیا بیر ہے جو اسے سکون سے جینے نہیں دیتی۔" منیزہ حسن کو اس کی یہ بات سخت ناگوار گزری تھی۔ تب ہی اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"کون تھا وہ؟" عمر نے غصے سے بیوی سے پوچھا۔

اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ "مجھے کیا معلوم، اپنی بہن سے ہی پوچھو جس نے اسے گھر کا نمبر دیا

ہے۔" صبا کی باتیں سنتے حسن احمد ضبط کیے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"ایمن!" عمر چلایا۔ منیزہ حسن کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ کر گری تھی۔ اب نجانے کیا قیامت آنے کو تھی۔ ایمن جو کچن میں تھی عمر کی آواز پر فوراً آئی۔
"کون شخص ہے جس سے تم رابطے میں ہو۔ اتنی شہہ دے دی تم نے کہ وہ آرام سے گھر کے نمبر پر کال کر کے تمہارے بارے میں پوچھ رہا ہے۔"
ایک اور الزام......! ایمن کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس نے عمر کی طرف دیکھا جو سخت تیور لیے اسے گھور رہا تھا حسن نے افسوس سے صبا کی جانب دیکھا جو ان کے گھر میں فتنہ پیدا کرنے کا باعث بنی تھی۔ وہ اٹھ کر ایمن کے برابر آ کھڑے ہوئے تھے۔
"صبا ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول رہی ہے۔ فون شہمیر کا تھا جو کہ میں بھی ایکسٹینشن سے سن چکا ہوں اور شہمیر کے سامنے بھی صبا نے غلط بیانی کی تھی کہ ایمن تو گھر پر ہی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔" حسن احمد کی بات پر جہاں صبا کا رنگ فق سے اڑا تھا وہیں ایمن نے چہرہ حسن احمد کی جانب موڑ کر بے یقینی سے دیکھا تھا۔ عمر کا رخ اب صبا کی جانب تھا جس کی وجہ سے اسے آج پہلی بار پاپا کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ منیزہ حسن اپنی جگہ سن کھڑی تھیں۔ شہمیر کی واپسی کی کتنی دعائیں مانگی تھیں انہوں نے۔
"آئندہ میری بیٹی پر کوئی الزام لگانے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر دونوں ہی کو وارن کیا اور ایمن کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

☆......☆

ایمن حیرت سے ان کا بدلا ہوا روپ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے اپنی تمام غلطیوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ "پاپا میں کبھی بھی آپ سے ناراض نہیں ہو سکی۔ آپ نے جو بھی کیا اپنی دانست میں بہتر کیا۔ قصور تو میرے نصیب کا تھا جو ایسے ہی لکھا تھا۔" وہ ان کے کندھے پر سر ٹکائے کہہ رہی تھی۔
"نہیں بیٹا! شاید اس وقت میں ایک باپ بن کر نہیں صرف ایک مرد بن کر سوچ رہا تھا۔ اسی لیے تمہارے ساتھ اتنی زیادتیاں کر بیٹھا لیکن بیٹا اب ہر فیصلہ تمہارا ہی ہوگا۔ شہمیر وطن واپس آ گیا ہے۔ وہ مجھ سے ملا تھا بیٹا! وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے وہ جان گیا کہ غلطی اس کی تھی۔ اس وقت جذبات میں آ کر وہ فیصلہ اس نے کیا لیکن وہ اب تم سے ملنا چاہتا ہے۔ بات کرنا چاہتا ہے تم اس سے مل لو پھر جو تمہارا فیصلہ ہوگا وہ مجھے منظور ہوگا۔" حسن احمد کی بات پر وہ بس خاموشی سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔

☆......☆

منیزہ حسن پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ ایمن کو زبردستی تیار کرتے وہ اسے ہر زیور پہننے کو دے رہی تھیں۔ ایمن نے اکتا کر چوڑیوں سے بھرے اپنے ہاتھ کو اور پھر ممی کو دیکھا۔
"ممی آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ وہ میری تیاری دیکھنے آ رہا ہے۔" وہ اس وقت ان سب چیزوں سے واقعی اکتائی ہوئی تھی۔ منیزہ حسن نے گھبراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔
"ایمی بیٹا! جب مرد اپنی انا مار کر آتا ہے نا تو حقیقتاً وہ اپنی محبت کو امر کرتا ہے اور آج شہمیر فاروق اتنے لمبے عرصے کے بعد اپنی انا ہی تو مار کر آیا ہے۔ اب تم عورت بن کر جھک جانا۔ اب اگر تم نے اپنی انا کی دیوار بلند کی تو پچھتاوے کے سوا ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ بیٹا اس وقت پرانی باتوں کا ذکر کر کے خود کو اذیت مت دینا اور بدظن

مت ہونا۔ اس کا واپس آ جانا خدا کی طرف سے تمہارے لیے ایک انعام ہے اور اس انعام سے منہ موڑ کر ناشکری مت بننا۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات۔" منیزہ حسن کے پوچھنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆

کھانے کی ٹیبل پر سب ہی موجود تھے سوائے اس کے۔ اس کی نگاہیں اپنے اردگرد کا طواف کر رہی تھیں کہ شاید وہ کہیں نظر آ جائے لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ منیزہ حسن اس کی ہر حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ کھانے کے فوراً بعد وہ اسے اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ انہوں نے ایمن کے کمرے میں دیکھا جہاں وہ انہیں کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔ شہمیر نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا تو وہ مسکرائیں۔
"شہمیر فاروق! اس نے ہر موسم تمہاری یاد میں یونہی تنہا گزارا ہے۔ آج پانچ سالوں بعد تم لوٹ کر آئے ہو تو یہاں بہت کچھ بدل گیا ہے سوائے ایمن کے۔ تم جیسا اسے چھوڑ کر گئے تھے وہ آج بھی ویسی ہے۔ آج اگر وہ تم سے ناراضی میں بدلحاظی سے پیش آئے تو اسے اس بات کی سزا مت دینا کیونکہ اتنا حق تو وہ رکھتی ہی ہے۔" انہوں نے نرمی سے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"اب جاؤ وہ چھت پر موجود ہوگی۔"
ان کے کہتے ہی اس نے اپنا رخ سیڑھیوں کی سمت موڑا، تب ہی منیزہ حسن نے اسے روکا اور اپنے شانوں پر پڑی شال اتار کر اسے تھمائی۔
"یہ لے جاؤ، موسموں سے لڑنا اسے پسند ہے بہت لیکن ہمیشہ اس کوشش میں ناکام ہو کر بیمار پڑ جاتی ہے۔"
ان کی بات سن کر وہ دھیمے سے مسکرایا اور شال تھام کر اوپر چلا آیا۔ اس کی جانب سے پیٹھ کیے وہ آسمان پر موجود چاند کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ وہ دبے قدموں اس کے برابر آ کھڑا ہوا تھا۔ ایمن نے اس کی آہٹ پر بھی اس کی جانب نہیں دیکھا۔ شہمیر نے ذرا کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا تھا لیکن وہ یونہی بت بنی آسمان پر نظریں مرکوز کیے کھڑی تھی۔
"کیا اس ٹھٹھرتی سردی کو مات دینے کا ارادہ ہے تمہارا؟" اس نے شال اس کے شانوں پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ اب کے اس کا تسلسل ٹوٹا تھا۔ اثر شہمیر کے لمس کا تھا جو کہ شال کے ساتھ اس کے شانو پر ہی رہ گیا تھا۔ ایمن نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا جو اپنی چمکتی آنکھوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔
"ایمن!" اس نے پکارا۔ "میں اپنی ساری غلطیوں پر دل سے شرمندہ ہوں تم یقین نہیں کر سکتیں کہ میں نے یہاں سے جانے کے بعد ہر دن اذیت میں گزارا۔ بابا کی ساری باتیں مجھے یہاں سے جانے کے بعد سمجھ میں آئی تھیں لیکن میں خود میں ہمت ہی نہیں کر پایا تھا۔ تمہارے پاس واپس آ جانے کی۔" وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ ایمن نے ایک نظر اس کے جھکے سر کو دیکھا اور آنکھوں میں آئے آنسو کو صاف کیا۔ یہ شخص اکیلا ہی اس کی ساری محبتوں کا وارث تھا لیکن اس کے دل میں موجود شک کے [illegible] نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔
"معاف کر دو مجھے پلیز۔" اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ایمن رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ شہمیر نے ایک نظر اسے دیکھا اور اس کے برابر آ کر اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلایا۔ ایمن کا ضبط اب جواب دینے لگا تھا۔ وہ اسے اس وقت مسمرائز کر رہا تھا۔
"تو اب کیوں آئے ہیں آپ! اب کون سا آپ کو میری پاکدامنی کا ثبوت مل گیا جس کی بنیاد پر آپ کو لگا کہ آپ کو اب واپس چلے جانا چاہیے۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔ شہمیر اس کے ہر سوال پر خاموش کھڑا رہا۔ کتنے ہی لمحے

خاموشی کی نذر ہو گئے۔

''میں جانتا ہوں کہ میں غلطی پر ہوں۔ اس وقت اگر میں جذباتیت کا مظاہرہ نہ کرتا تو شاید آج یہ حالات نہ ہوتے اور رہی بات تمہارے کردار کی تو وہ روز اول کی طرح میرے لیے شفاف ہی ہے۔ میں نے تم پر کبھی شک نہیں کیا۔ بس ایک غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ان آنکھوں نے وہی دیکھا جو اس وقت دکھایا جا رہا تھا۔ اس وقت ساری باتیں تمہارے خلاف ہی جاری تھیں تو مجھے لگا کہ تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو یا تمہارے ساتھ کوئی زبردستی کی گئی ہے۔'' شہمیر فاروق اس کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔ جو شخص کبھی دو بول بولنا بھی گوارا نہیں کیا کرتا تھا۔ وہ آج اپنی تمام تر زیادتیوں پر نادم کھڑا تھا۔

''میں نے ایک ایک پل اذیت میں گزارا ہے شہمیر آپ کی یاد میں..... پانچ سال کا عرصہ کوئی کم نہیں ہوتا لیکن جب آپ کو اس دن ایئرپورٹ پر دیکھا تھا کسی اور کے ساتھ تب لگا کہ میں مر جاؤں گی۔''

''واٹ..... ! کون لڑکی۔'' شہمیر اس کی بات سن کر چونکا تھا۔ ایمن نے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے اسے گھورا۔

''مجھے اب تک اس کی شکل اور وہ بچہ بھی یاد ہے جو آپ کے ساتھ تھا۔ اس کے لہجے میں موجود سختی شہمیر نے واضح محسوس کی تھی اور دھیمے سے مسکرایا۔

''تو محترمہ کو پانچ سال کی جدائی سے زیادہ اس لڑکی اور اس بچے کا دکھ ہے۔'' اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''تم آج بھی اتنی ہی بے وقوف ہو جتنی کہ پہلے تھیں۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو میں یہاں تمہارے پاس نہ کھڑا ہوتا۔ وہ جہاز میں میرے ساتھ ایک مسافر تھی جس کی مدد کی خاطر میں اس کے ساتھ کھڑا تھا اور تم اپنے اس چھوٹے سے دماغ سے نجانے کیا کیا کچھ سوچ کر بیٹھ گئیں۔'' اس نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

ایمن اپنی بے وقوفی پر مسکرائی اور نظر آسمان کی جانب کی تھی جہاں چاند اپنی پوری روشنی پھیلائے ہوا تھا۔

''ایمن!'' شہمیر نے اس کے کان کے قریب پکارا۔

''ہوں!'' اس نے بنا دیکھے کہا۔

''میں سوچتا ہوں کہ اس دن تم نے ہمت نہ کی ہوتی اور وہ پیپر زیوں پھاڑ نہ دیے ہوتے تو ہم کبھی نہ مل پاتے۔'' ایمن نے مسکرا کر اس کے شانے پر اپنا سر رکھا۔

''وہ ہمت نہ جانے مجھ میں کہاں سے آئی تھی جس نے مجھے اپنا حق لینے پر مجبور کیا تھا یا شاید وہ محبت تھی جو میرے دل میں آپ کے لیے پیدا ہو چکی تھی۔'' وہ ممی کی باتوں کو سمجھ گئی تھی اسی لیے اپنی انا کو مار کر محبت جیتنا چاہ رہی تھی۔ وہ محبت جس کے لیے وہ یکسر بدل چکی تھی۔ اس محبت نے تو اسے مضبوط بنایا تھا۔

''ایمن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تا عمر یونہی تمہارے ساتھ رہوں گا اور اپنی دی گئی سب اذیتوں کا ازالہ کروں گا۔'' شہمیر نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہ آج بے حد خوش تھی۔ اس کی دعائیں قبول ہوئی تھیں۔ یہ سخت آزمائش جو بہت جان لیوا تھی اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے رب کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔ وہ سارے درد سارے آنسو دھول بن کر رہ گئے تھے۔ زندگی ایک حسین راہ گزر بننے کو تھی۔

.....☆.....

سیما شاہد

ہم ہار گئے جاناں

ساحل سمندر پر چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا اس کے وجیہہ چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ ابھرتے سورج کی نرم کرنیں اس سمے ٹریک سوٹ میں ملبوس جاگنگ کرتے ہوئے روحان کو بھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ رات دیر تک وہ کنسرٹ

میں بزی تھا لیکن صبح ہوتے ہی تھکا ہارا ہونے کے باوجود وہ اپنے وقت پر جاگنگ کرنے آ گیا تھا۔ فٹنس کے معاملے میں وہ کمپرومائز نہیں کرتا تھا۔ رات ایک گھنٹہ جم اور صبح ایک گھنٹہ جاگنگ اس کا معمول تھا۔ گھنٹہ پورا ہوتے ہی وہ سامنے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ بیک سیٹ سے پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔

ساحل سمندر کے قریب ایک پر تعیش علاقے میں موجود، اس عالیشان بنگلے کے باہر سیکیورٹی گارڈز چوکس بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح کا وقت تھا جب ایک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار تیز رفتاری سے نزدیک آئی۔

''روحان بابا ہیں جلدی سے گیٹ کھولو انہیں انتظار پسند نہیں۔'' ایک سینئر گارڈ جلدی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

دونوں گارڈز کے دروازہ کھولتے ہی وہ سرخ فراری تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ پورچ میں گاڑی کے رکتے ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور اس میں سے ایک لمبا، کسرتی جسامت کا حامل، گھنے بالوں کی چھوٹی سی پونی بنائے، ہاتھ میں بینڈز پہنے تقریباً پچیس چھبیس سال کا ہینڈسم مردانہ وجاہت کا شاہکار ٹریک سوٹ میں ملبوس نوجوان نیچے اترا۔

قسط نمبر 1

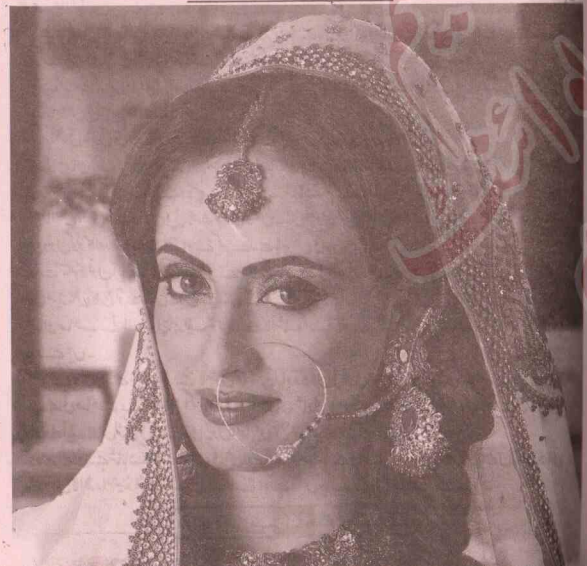

"سلام روحان بابا!" ملازم نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا اور گھر کی مین اینٹرینس کا دروازہ بڑے ادب سے اس کے لیے کھولا۔ وہ سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

ناشتے کا وقت تھا۔ سلیمان صاحب (اس کے ڈیڈ) شاہانہ بیگم (اس کی ممی) اور انیتا (اس کی کزن) سب ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔ اسے دیکھتے ہی شاہانہ بیگم نے آواز لگائی۔

"روحان ادھر آؤ بیٹا۔ کبھی ہمارے ساتھ بھی بریک فاسٹ یا لنچ کر لیا کرو۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"مما پلیز! صبح صبح تو آر گومنٹس! میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"روحان کم ہیئر سن! ایک کپ چائے پی لو پھر آرام کر لینا۔" سلیمان صاحب نے مداخلت کی۔

"او کے ڈیڈ!" وہ بحث سے بچنے کے لیے کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"روحان کل تمہارا کنسرٹ کیسا ہوا؟ میں نے تو اتنی کوشش کی تھی پر پورا کنسرٹ ہی سولڈ آؤٹ تھا۔ اتنا غصہ آیا نا میرے کزن کا کنسرٹ اور میرے پاس ہی ٹکٹ نہیں۔" انیتا نے جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے شکایت کی۔

"نیکسٹ ٹائم تم میرے مینجر کو ٹائم سے بول دینا وہ ایڈوانس میں ٹکٹ ارینج کروا دے گا۔" روحان نے روکھے لہجے میں جواب دیا پھر سلیمان صاحب کی جانب مڑا۔ "او کے! ڈیڈ میں اب چلوں۔ تھوڑا آرام کروں گا پھر شام میں ایک ایڈ کی شوٹنگ بھی ہے۔" وہ چائے کا کپ واپس رکھ کر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے بیڈروم کی طرف چلا گیا۔

"آپ دیکھ رہی ہیں؟ یہ شوبز اسے ہم سب سے دور کر رہا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ روک لیں اسے ورنہ آپ سر پکڑ کر روئیں گی۔" سلیمان صاحب نے شاہانہ بیگم کو وارن کیا۔

"آپ فکر مت کریں میرا بیٹا سمجھدار ہے اور یہی تو عمر ہوتی ہے، کرنے دیں اسے اپنا شوق پورا بعد میں تو اسے بھی آپ کا بزنس ہی سنبھالنا ہے۔"

"بیگم! شوق، شوق ہی رہے تو بہتر ہے۔" انہوں نے گہرے لہجے میں بہت کچھ جتایا تھا۔

"اللہ! سلیمان آپ یہ بھی تو دیکھیں وہ کتنا بڑا سپر اسٹار بن چکا ہے۔ انڈیا تک سے اسے آفر ہیں جن جن فلموں میں روحان نے پلے بیک کیا ہے وہ سپر ہٹ گئی ہیں۔" شاہانہ بیگم نے روحان کی طرف داری کی۔

"اچھا انکل، آنٹی آپ دونوں اپنی بحث جاری رکھیں۔ میں چلوں میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔" انیتا نے بیچ میں ان دونوں کو ٹوکا اور خدا حافظ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"رات سلیم کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا علیزے میڈیکل پڑھنے کی ضد کر رہی ہے۔ اب سوات کے اس گاؤں میں کوئی میڈیکل کالج تو ہے نہیں۔ اس لیے میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ ادھر کراچی میں اس کا ایڈمیشن کروا دے۔" سلیمان صاحب نے ملازم کو اپنا بریف کیس لانے کا اشارہ کرتے ہوئے تفصیل بتائی۔ شاہانہ سمجھ گئیں کہ وہ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔

"علیزے کو بچپن سے ہی ڈاکٹر بننے کا شوق تھا لیکن کیا وہ گاؤں کی لڑکی کراچی جیسے شہر میں ایڈجسٹ کر سکے گی؟ آپ بھائی صاحب سے کہیں انٹر اگر ہو گیا ہے تو اس کی شادی کا سوچیں۔ اب ادھر آ کر وہ کیا کرے گی ہم بھلا خواہ مخواہ ایک جوان لڑکی کی ذمہ داری کیوں اٹھائیں؟" شاہانہ بیگم نے نخوت سے جواب دیا۔

"وہ میرا بھائی ہے شاہانہ بیگم اور اگر اس کی بیٹی ادھر آ کر پڑھنا چاہے گی تو میں ہرگز بھی انکار نہیں کروں گا اور نہ ہی کچھ سنوں گا انڈر اسٹینڈ!" وہ انہیں سختی سے ٹوکتے ہوئے آفس جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔

☆......☆

چاروں جانب سبزہ ہی سبزہ تھا۔ صبح کا وقت تھا سورج کی کرنیں وادی سوات کا حسن دوبالا کر رہی تھی وہ دونوں تیزی سے چلتی ہوئی پھولوں سے ڈھکے مکان کے آگے آ کر رکیں۔ دروازہ حسب معمول کھلا ہوا تھا وہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئیں سامنے ہی ایک خوب صورت باوقار خاتون شال لپیٹے قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم خالہ، علیزے کدھر ہے؟" صبا اور سائرہ نے باآواز بلند سلام کیا۔

"وہ تو فجر پڑھ کر پھر سو گئی تھی۔" زیبا بیگم نے ان کی تیاری کو بغور دیکھا۔

"اللہ! خالہ آج ہمیں کالج جلدی جانا تھا اور یہ ابھی تک سو رہی ہے؟" صبا پریشانی سے بولی۔

"تم لوگ اندر تو آؤ۔" زیبا نے انہیں اندر بلایا۔

"چلو تم چل کر اسے اٹھاؤ۔ میں تب تک تم سب کے لیے گرم گرم بادام والا دودھ تیار کرتی ہوں۔" وہ انہیں علیزے کے بیڈروم کی طرف جانے کا کہہ کر کچن میں آ گئیں۔

یہ سوات کا ایک نواحی گاؤں تھا، جہاں سردیوں کے موسم میں صبح سات بجے بھی ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ سستی سے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ جب اس کے کانوں میں اپنی دوستوں کی آواز پڑی۔

"علیزے!"

"علیزے کی بچی!"

"اف! خدایا یہ لڑکی کتنی سست ہے؟" سائرہ پیشانی پر ہاتھ مار کے چیخی۔

"علیزے شرافت سے اٹھ جاؤ ورنہ اب میں پانی کا جگ تم پر ڈالنے والی ہوں۔" سائرہ نے دھمکی دی۔

"کیا ہے یار؟ سونے بھی نہیں دیتی ہو۔ پتا ہے! میں خواب میں ہارٹ کا آپریشن کر رہی تھی۔" وہ منہ بسورتے ہوئے اٹھی۔

"محترمہ! صبح کے سات بج گئے ہیں۔ دیکھنا آج پھر ہم سلیم سر کی کلاس میں لیٹ ہوں گے اور ڈانٹ الگ پڑے گی۔" صبا نے اس کا لحاف اٹھاتے ہوئے پیشن گوئی کی۔

"واقعی! سات بج گئے؟" وہ چونکی اور تیزی سے الماری سے یونیفارم نکال کر واش روم کی طرف بھاگی۔

علیزے کپڑے بدل کر باہر آئی لمبا سا کوٹ پہنا اور بال بنانے لگی۔

"یار یہ سات آج اتنی جلدی کیسے بج گئے؟" وہ بڑبڑائی۔

"علیزے کی بچی! سات اپنے ٹائم پر ہی بجے ہیں۔ اب تم ہی ہوش میں نہیں تھیں تو وقت کا کیا قصور؟ جب دیکھو ڈاکٹر بنی اسپتالوں میں آپریشن کر رہی ہوتی ہو۔ یار! اب اتنے خواب بھی مت دیکھا کرو۔" صبا نے اسے لیکچر دیا۔

"میں صبح فجر پڑھ کر لیٹ گئی تھی اور اب تم دونوں یہ فضول باتیں بند کرو۔ نکلو یہاں سے ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" وہ اسکارف پہن کر بیگ اٹھا کر باہر نکلی۔

"قسم سے تو لاعلاج ہے۔" سائرہ اس کی پشت کو گھورتے ہوئے صبا کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے تیزی سے اس کے پیچھے نکلی۔

"لڑکیو! یہ دودھ تو پی لو۔" زیبا نے ان تینوں کو باہر نکلتے دیکھ کر روکنے کی کوشش کی۔

"امی واپس آ کر پی لیں گے۔ اللہ حافظ!" علیزے نے رک کر جواب دیا اور گھر سے باہر نکل گئی۔

☆......☆

وہ تینوں تیزی سے چلتی ہوئی کلاس روم کے دروازے پر آ کر رک گئیں۔

''یار! ہم پورے پندرہ منٹ لیٹ ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' صبا بڑبڑائی۔

''کچھ نہیں ہوتا، میں ہوں نا، چلو ایک ساتھ اندر چلتے ہیں۔'' علیزے انہیں ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہوئی۔

''مے آئی کم ان سر!'' اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔

انگلش کے بارعب سے پروفیسر سلیم صاحب نے لیکچر روک کر عینک اتاری اور دروازے میں معصومیت سے اندر آنے کی اجازت مانگتی علیزے اور اس کی دوستوں کو دیکھا پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا وہ پورے پندرہ منٹ لیٹ تھیں۔

''آپ نے کلاس کو مذاق سمجھ رکھا ہے؟ جب دل کیا منہ اٹھا کر آ گئے۔ وقت کی پابندی کا آپ کو کوئی احساس ہے؟'' وہ غصے سے بولے۔

''سوری سر!'' علیزے نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''واٹ سوری بی بی! اگر آپ کو پڑھنے سے دلچسپی نہیں ہے تو گھر بیٹھیں۔''

''سوری سر آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' علیزے کی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی تھی۔ پوری کلاس دم سادھے اسے ڈانٹ پڑتے دیکھ رہی تھی۔

''اوکے اس بار میں کلاس میں آنے کی اجازت دے رہا ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے، انڈر اسٹینڈ!'' انہوں نے خفگی سے وارن کیا۔

''یس سر!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آنسو پیتی ہوئی اندر آ کر بیٹھ گئی۔

لیکچر دوبارہ شروع ہو چکا تھا اب وہ پوری توجہ سے سر کو سن رہی تھی۔ کلاسز ختم ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کر باہر نکلی اور اپنی دوستوں کا انتظار کیے بغیر واپس گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ گھر پہنچی تو زیبا صحن میں چارپائی بچھائے دھوپ سینکتے ہوئے مٹر چھیلنے میں مصروف تھیں۔

''آج اکیلی آئی ہو۔ تمہارے بابا کدھر ہیں؟'' زیبا بیگم نے اس کے پیچھے سلیم صاحب کو نہ آتے دیکھ کر پوچھا۔

''امی!'' وہ دھپ سے ان کے پاس آ کر بیٹھی۔

''امی آج بابا نے مجھے سب کے سامنے ڈانٹا، تھوڑا سا بھی بابا ہونے کا لحاظ نہیں کیا۔'' وہ منہ بسورے شکایت لگا رہی تھی۔

''اچھا! ایسا کیا کیا ہے بابا نے؟'' انہوں نے مٹر کے دانوں سے بھری ٹوکری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں مانتی ہوں غلطی میری تھی۔ میں لیٹ ہو گئی تھی لیکن سوری بھی تو کیا تھا نا! پھر بھی انہوں نے سب کے سامنے اتنا ڈانٹا۔'' وہ بولتے ہوئے روہانسی ہو گئی۔

''تو بیٹا آپ غلطی کرتی ہی کیوں ہو؟''

''امی میں اتنی ناراض ہوں اور آپ مجھے سیریس ہی نہیں لے رہی ہیں۔ بس مجھے نہیں پتا! اب آپ کو بابا کو ڈانٹنا ہے اور بہت سارا ڈانٹنا ہے۔'' وہ ناراضی سے بول رہی تھی جب سلیم صاحب اپنی موٹر سائیکل دروازے کے پاس روک کر اس کے نزدیک آئے اور اس کے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

''بٹیا جی تم لیٹ ہوتی ہی کیوں ہو؟ کتنی بار کہا ہے صبح میرے ساتھ چلا کرو لیکن تمہیں بھی ضد ہے دوستوں کے ساتھ آنے کی۔''

''بابا! میں آپ سے ناراض ہوں بس۔'' وہ ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

''ارے واہ! ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔ یہ بتاؤ تم میری پروفیسر سلیم کی بیٹی ہو کر اتنی لیٹ کلاس میں کیوں آئیں؟ تم سے یہ غلطی کیسے ہوئی؟'' وہ رعایت دینے کے موڈ میں نہ تھے۔

''بابا میں خواب میں ہارٹ اسپیشلسٹ بنی ہوئی تھی۔ اتنا سیریس آپریشن کر رہی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور آنکھ بھی نہیں کھلی۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''بٹیا! خواب دیکھنا اچھی بات ہے لیکن خوابوں کو سر پر سوار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تمہیں اس لیے ڈانٹا کہ میں نہیں چاہتا لوگ کہیں کہ یہ اپنی بیٹی کو فیور دیتا ہے۔ میرے سارے طالب علم میری نظر میں برابر ہیں۔'' انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

''سوری بابا، اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''گڈ گرل! چلو اب کچن میں جا کر اپنی ماں کا ہاتھ بٹاؤ۔''

علیزے کے کچن میں جاتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ اٹھ کر فون اسٹینڈ تک آئے۔ کراچی سے فون تھا۔ علیزے کا ڈاؤ میڈیکل یونیورسٹی کی پہلی لسٹ میں میرٹ پر نام آ گیا تھا۔

☆......☆

رات کے کھانے کے بعد علیزے، زیبا کے ساتھ برتن دھلوا رہی تھی جب سلیم صاحب عشاء کی نماز پڑھ کر اندر داخل ہوئے۔

''علیزے بٹیا! آج وقت سے سو جانا۔ کل اگر پھر دیر سے اٹھیں تو ڈانٹ سننے کے لیے بھی تیار رہنا۔'' وہ کچن کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''ویسے بابا!'' علیزے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ان کے پاس آئی۔

''جب میں چلی جاؤں گی تو آپ کس کو ڈانٹا کریں گے؟'' اس نے شرارت سے پوچھا۔

''اللہ! اللہ! لڑکی کیسے منہ کھول کر اپنی شادی کی بات کر رہی ہو۔ ہم اتنی جلدی تمہیں کہیں نہیں بھیجنے والے۔'' زیبا نے اسے ٹوکا۔

''امی آپ بھی نا......! میں شادی کی بات نہیں کر رہی۔ میرا مطلب جب میں میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے بعد ہاسٹل چلی جاؤں گی، تب بابا کیا کریں گے اور آپ پتا نہیں کیا سمجھ رہی ہیں؟'' وہ جلدی سے صفائی دیتے ہوئے بولی۔

''علیزے میں تمہیں اتنی دور کہیں نہیں بھیجنے والی۔ ویسے بھی اب ادھر کالج میں ایڈمیشن ہو گیا ہے، یہی کافی ہے۔'' زیبا نے سختی سے انکار کیا۔

''امی آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں نے بورڈ میں ٹاپ کیا تو آپ مجھے ڈاکٹر بننے سے نہیں روکیں گی۔ بابا آپ بولیں نا کچھ!'' اس نے اصرار کیا۔

''میں کچھ نہیں جانتی تم لڑکی ذات ہو۔ میں تمہیں ایسے کیسے گھر سے، خود سے اتنی دور بھیج دوں؟ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولتی ہوئیں اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

''بابا......!'' وہ روہانسی ہوئی۔

''بیٹا تم پریشان مت ہو۔ وہ ماں ہے، مان جائے گی۔ تم جاؤ جا کر آرام کرو۔'' وہ اسے کے سر پر ہاتھ رکھ کر گھر کی

لائٹ آف کر کے دروازے کی کنڈی چیک کرنے کے بعد اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو سامنے ہی زیبا بیگم خاموشی سے جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے بستر پر بیٹھے ہی تھے کہ دروازہ ناک کر کے علیزے اندر داخل ہوئی اور سیدھی جا کر زیبا بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔

"امی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اس نے زیبا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔

"ناراض مت ہوں پلیز!"

"علیزے بیٹا میں نے اور تمہارے بابا نے تمہیں بڑے پیار سے پالا ہے۔ آج تک تمہاری چھوٹی سے چھوٹی، بڑی سے بڑی خواہش پوری کی ہے۔ اب تم خود سوچو میں اگر تمہیں روک رہی ہوں تو کیوں روک رہی ہوں؟" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"کیوں امی؟" وہ الجھی۔

"کیونکہ میں اپنی بیٹی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ تم ہماری اس چھوٹی سی جنت کو چھوڑ کر کہیں دور جاؤ اکیلی رہو۔" وہ کسی طور راضی نہ تھیں۔

"امی میں آپ کی بات سمجھتی ہوں لیکن بس چار سال کی تو بات ہے۔ میں نایا ابا کے پاس رہوں گی۔ ہر چھٹی پر گاؤں آیا کروں گی اور دیکھئے گا جب ڈاکٹر بن کر آؤں گی تو پورے گاؤں میں آپ کا اور بابا کا سر اونچا ہو جائے گا۔" وہ جوش سے انہیں سمجھاتے ہوئے بولی۔

"پر بیٹا تمہارے تایا تائی بریوں سے تو ادھر آئے نہیں ہیں اور جو بھی ہو وہ ماں باپ کی جگہ تو نہیں لے سکتے۔ بس میرا دل نہیں مانتا، گھبراتا ہے تمہیں کہیں دور بھیجتے ہوئے۔ اتنا آسان نہیں ہوتا اپنی اولاد کو خود سے دور کرنا۔ تم بیمار ہو جاؤ، اداس ہو جاؤ اور میں تمہیں گلے سے بھی نہ لگا سکوں تمہارا خیال نہ رکھ سکوں۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"سوری امی!" علیزے نے تیزی سے ان کی آنکھیں صاف کیں اور ان کے گلے لگ گئی۔

"پلیز! آپ مت روئیں۔ ٹھیک ہے میں میڈیکل نہیں پڑھوں گی۔ اب کبھی بھی باہر جا کر پڑھنے کی ضد نہیں کروں گی۔ بس آپ خوش رہیں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔" وہ انہیں ہاتھ پکڑ کر جائے نماز سے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"بیٹا اب تم بھی آرام کرو تمہاری امی کو سمجھا دوں گا۔" سلیم صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"بیگم!" سلیم صاحب نے سنجیدگی سے انہیں مخاطب کیا۔

"جی!"

"کیا بات ہے اتنی پریشان کیوں ہیں آپ؟ علیزے کا مستقبل آپ کو محفوظ نہیں ہے کیا؟" انہوں نے سوال کیا۔

"سلیم صاحب، علیزے ابھی چھوٹی سی ہے اور سلیمان بھائی صاحب کے گھر کا ماحول نہ جانے کیسا ہو؟ کالج کا ماحول کیسا ہو؟ بس میں کیا کروں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ماں ہونا اتنا مشکل ہوگا۔" وہ پریشانی سے بولیں۔

"تم نے ہمیشہ وہی کیا ہے جو میرے لیے، علیزے کے لیے، اس گھر کے لیے صحیح ہے۔ ہماری ہر خوشی کا خیال رکھا ہے۔ علیزے کی خوشی کس میں ہے ہمیشہ یہ بات پہلے سوچی ہے اور مجھے پورا یقین ہے ابھی بھی تم وہی فیصلہ کرو گی جس میں ہماری بیٹی کی بھلائی ہوگی اور یقین کرو تم جو بھی فیصلہ لو گی میں ہر دم تمہارے ساتھ ہوں۔" سلیم صاحب نے انہیں مکمل یقین دلایا تھا۔

"ٹھیک ہے مجھے کچھ سوچنے کا ٹائم دیں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

☆.....☆

عالیشان بیڈروم میں بیڈ پر اوندھے منہ لیٹا وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ جب اس کا سیل فون بجنا شروع ہوا، جو بھی تھا وہ بڑی مستقل مزاجی سے اس فون پر فون کیے جا رہا تھا۔ روحان نے کوفت سے کروٹ بدلی اور سائیڈ میز پر پڑا سیل فون اٹھایا۔ سلیمان صاحب کی کال آ رہی تھی۔

"جی! ڈیڈ کیا بات ہے؟" وہ بیزاری سے بولا۔

"سنو! دو دن بعد تمہارے چچا چچی پہلی بار کراچی آ رہے ہیں۔ میں پہلے ہی بتا رہا ہوں کہ تم دو دن بعد گھر میں ہی نظر آؤ۔ کوئی شوٹ یا کنسرٹ نہیں رکھنا ہے۔" سلیمان صاحب نے تنبیہی سے اسے ہدایات دیں۔

"ڈیڈ آپ نے اس بات کے لیے مجھے نیند سے اٹھایا ہے۔" وہ ٹھیک ٹھاک تپ اٹھا۔

"ہاں! اب اٹھ ہی گئے ہو تو ذرا آفس کا چکر بھی لگا لو۔" سلیمان صاحب نے سنجیدگی سے کہہ کے فون رکھ دیا۔

"کیا مصیبت ہے اب بندہ اپنی مرضی سے سو بھی نہیں سکتا ہے۔" وہ جھنجھلایا۔ نیند تو اس کی ٹوٹ ہی چکی تھی وہ بستر چھوڑ کر تیار ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

بلیک جینز پر لیدر جیکٹ پہنے اپنے بالوں کو اسٹائل سے سیٹ کیے ہاتھ میں بیش قیمت گھڑی پہن کر، خود پر پرفیوم چھڑکنے کے بعد وہ آفس جانے کے لیے تیار تھا۔ اس کا ارادہ اپنے شوٹ پر جانے کا تھا وہ باہر نکلا تو باوردی ڈرائیور اس کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے چابی اس کے ہاتھوں سے لیتا ہوا خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر تیز رفتاری سے گاڑی نکالے ہوئے روانہ ہو گیا۔

آفس پہنچ کر وہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا ہی تھا کہ پورا اسٹاف اسے دیکھ کر الرٹ ہو گیا۔ وہ سر کے اشارے سے سب کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے ڈیڈ کے روم کی طرف بڑھا۔

"ہیلو ڈیڈ!" اندر داخل ہو کر وہ آرام سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ تم کس حلیے میں آفس آئے ہو؟"

"کیوں ڈیڈ اب میرے حلیے کو کیا ہوا؟"

"روحان! یہاں کوئی فیشن شو نہیں ہو رہا، تمہیں ڈریس کوڈ میں آنا چاہیے تھا۔"

"پلیز ڈیڈ تین گھنٹے میں میرا شوٹ ہے، اوپر سے آپ نے بلوا لیا اب مجھے بور مت کریں کام بتائیں۔" وہ جھنجھلایا۔

"او کے یہ فائل چیک کرو۔" انہوں نے شاہ منزل کی فائل اس کی جانب کھسکائی۔

"میں چاہتا ہوں یہ پراجیکٹ تم ڈیل کرو۔ آج سے ہی چارج سنبھال لو۔" انہوں نے کہا۔

"میں.....!!" روحان نے کوفت سے انہیں دیکھا۔

"ہاں تم!"

"ڈیڈ میرا یورپ میں پورے تین دن کا کنسرٹ طے ہے۔ آپ پلیز ابھی اسے خود دیکھ لیں۔"

"روحان تم کبھی بھی بزنس کو وقت نہیں دیتے ہو ہر وقت فلاں کنسرٹ، فلاں شوٹ.....!! بیٹا کبھی یہ بھی سوچا ہے کل اگر میں نہ رہا تو یہ بزنس کون سنبھالے گا؟"

"ڈیڈ نو لیکچر پلیز۔"

"واٹ نو لیکچر! تم کیا میرے مرنے کے بعد سیریس ہو گے؟ بس کینسل کرو یہ کنسرٹ وغیرہ اور یہ پراجیکٹ

سنبھالو۔" وہ طیش میں آگئے۔ ان کا سانس پھولنے لگا تھا۔

"ڈیڈ ری لیکس!" روحان نے تیزی سے انہیں تھام کر کرسی پر بٹھایا اور پانی کا گلاس ٹیبل سے اٹھا کر ان کے منہ سے لگایا۔

"آپ ایک کام کیجیے بس مجھے ایک ویک کی چھٹی اور دے دیں پکا وعدہ اس کنسرٹ کے بعد پہلے آپ کا پراجیکٹ کروں گا پھر اپنا کوئی کام کروں گا۔" اس نے ریکوئسٹ کی۔ جو بھی تھا وہ اپنے ڈیڈ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

"کب جا رہے ہو؟" سلیمان صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پرسوں صبح کی فلائٹ ہے اور ٹھیک چھ دن بعد پیر کو آپ کے ساتھ آفس میں پایا جاؤں گا۔" وہ مسکرایا۔

"ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد میں مزید اور کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گا۔ انڈر اسٹینڈ؟" انہوں نے یقین دہانی چاہی۔

"ڈیڈ میں سنگنگ نہیں چھوڑ رہا، بس ایک پراجیکٹ آپ کے ساتھ کروں گا پھر اپنے نئے البم پر بھی کام کرنا ہے، آپ بھی یہ یاد رکھیے گا۔"

☆.....☆

سلیم صاحب، علیزے کے ساتھ کراچی کے کینٹ اسٹیشن پر اتر چکے تھے۔ سامان لے کر وہ باہر نکلے ہی تھے کہ انہیں سلیمان صاحب سامنے ہی ان کا انتظار کرتے ہوئے نظر آئے وہ گرم جوشی سے ان کی طرف بڑھے۔

"السلام علیکم بھائی صاحب!" کہتے ہی وہ ان سے بغلگیر ہو گئے۔

علیزے نے دلچسپی سے دونوں بھائیوں کے ملنے کا منظر دیکھا اور مسکرانے لگی۔

"کیسے ہو سلیم!"

"میں ٹھیک ہو بھائی صاحب، علیزے بیٹی ادھر آؤ اپنے تایا کو سلام کرو۔" انہوں نے پاس کھڑی علیزے کو مخاطب کیا۔

"السلام علیکم تایا ابا!" علیزے نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! ارے گڑیا تو ماشاء اللہ اتنی بڑی ہو گئی۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"چلو بھئی جلدی سے گھر چلتے ہیں تمہاری آنٹی انتظار کر رہی ہیں۔" وہ ڈرائیور کو ان کا سامان گاڑی میں رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ان دونوں کو لے کر اندر بیٹھ گئے۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد گاڑی ایک عالیشان بنگلے کے اندر آ کر رکی۔ علیزے حیرت سے اس گھر کی شان و شوکت دیکھ رہی تھی۔

"چلو بیٹی اندر چلیں!" سلیمان صاحب نے پیار سے گڑیا سی علیزے کو مخاطب کیا اور انہیں اپنی معیت میں لے کر گھر کے اندر داخل ہوئے۔

"شاہانہ بیگم! کدھر ہیں آپ!" انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔

"سلیمان پلیز! گھر میں چلایا مت کریں۔ نوکروں پر برا اثر پڑتا ہے۔" اپنی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے شاہانہ بیگم لیونگ روم میں داخل ہوئیں۔

"اسلام علیکم بھابی!" سلیم صاحب نے خوشدلی سے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام کیسے ہو سلیم؟ زیبا نہیں آئی۔" انہوں نے بیٹھتے ہوئے چبھتی سی نظر علیزے پر ڈالی اور سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

"بس بھابی! اس کی طبیعت ٹرین کے سفر کے لحاظ سے ٹھیک نہیں تھی اگلی بار علیزے کو لینے آؤں گا تو ضرور ساتھ لاؤں گا۔" وہ نرمی سے بولے۔

☆.....☆

دو دن کیسے گزر گئے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ سلیم صاحب علیزے کو ڈھیروں نصیحتیں کر کے واپس چلے گئے تھے انہیں گاڑی تک چھوڑ کر وہ واپس اندر آئی تو سامنے ہی شاہانہ بیگم ملازمہ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"علیزے اوپر جاؤ اور اپنا سامان لے کر جلدی سے نیچے آؤ۔" انہوں نے اسے دیکھتے ہی ہدایت کی۔

"سامان.....! آنٹی؟" وہ حیران ہوئی۔

"چلو تم سامان چھوڑو وہ میں ملازمہ کے ہاتھ بھجوا دوں گی اور چلو۔"

"کدھر آنٹی!" وہ حیران تھی۔

"دیکھو لڑکی تمہیں ایک دو دن تو ادھر رہنا نہیں ہے پورے چار سال گزارنے ہیں اور تمہاری پڑھائی ڈسٹرب نہ ہو اس لیے تمہاری رہائش کا انتظام انیکسی میں کیا گیا ہے اور آج انیتا بھی واپس آ رہی ہے سو اس کا کمرا تو خالی کرنا ہی ہے۔" انہوں نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

وہ علیزے کو لے کر گھر کے ساتھ بنی انیکسی میں داخل ہوئیں جو کسی ماہر آرکیٹیکٹ کے ہاتھوں کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ دو کمروں کی اس انیکسی میں پرتعیش فرنیچر اور دنیا جہاں کی ہر آسائش موجود تھی۔

"تم سامنے والے کمرے میں اپنا سارا سامان سیٹ کر لو میں تب تک ملازمہ کے ہاتھوں چائے بھجواتی ہوں۔" وہ اسے ہدایات دے کر جانے کے لیے پلٹیں پھر رکیں۔

"تمہیں جب بھی بھوک لگے یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹر کام کر دینا فضول میں اُدھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے، اوکے!" انہوں نے اسے ہدایات دیں۔

علیزے نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ واپس چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی علیزے نے انیکسی کا جائزہ لینا شروع کیا۔

"اللہ کتنی خوب صورت جگہ ہے۔" وہ گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد اپنا سامان سوٹ کیس سے نکال کر سیٹ کرنے لگی۔ صبح اس کے میڈیکل کالج کا پہلا دن تھا اس نے اپنے ڈاکومنٹس نکالے کپڑے تیار کیے اور عشاء کی نماز پڑھ کر سونے لیٹ گئی۔

نئی جگہ تھی کچھ اکیلے پن کا احساس بھی تھا کروٹیں بدلتے بدلتے وہ کب سوئی اسے خود بھی پتا نہیں چلا۔ وہ گہری نیند میں گم تھی جب الارم بجنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے آنکھیں کھول کر الارم بند کیا اور حسب عادت دوبارہ سونے لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد مسلسل بجتے انٹر کام سے اس کی آنکھ کھلی اس تے جلدی سے انٹر کام اٹھایا۔

"علیزے!" شاہانہ بیگم کی سنجیدگی سے بھرپور آواز گونجی۔

"جی آنٹی!"

"کیا تمہارے پاس سیل فون نہیں ہے جو تمہاری ماں ادھر گھر پر فون کر کے پریشان ہو رہی ہے۔" انہوں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

"نہیں آنٹی وہ تو نہیں ہے میں آتی ہوں آپ امی کو ہولڈ کروا دیں۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"تم کالج کے لیے ریڈی ہو جاؤ پھر کالج سے واپس آ کر گھر سے انہیں فون کر لینا۔" انہوں نے کہتے ہی فون بند کر دیا۔

"کیا ہوا آنٹی صبح صبح اتنا غصہ۔" انیتا نیچے اترتے ہوئے انہیں دیکھ کر بولی۔

"انیتا آج یونیورسٹی سے واپسی پر اس گنوار لڑکی کے لیے ایک سیل فون لیتی آنا۔"

"سیل فون؟ کیوں اس کا فون ٹوٹ گیا ہے کیا۔" انیتا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"پتا نہیں کس قدیم زمانے کے لوگ ہیں یہ تمہارے انکل کے رشتہ دار گاؤں سے اٹھ کر شہر آ گئے ہیں اور زمانے کا کچھ پتا نہیں ہے۔ اب بتاؤ بھلا اس لڑکی کے پاس سیل فون تک نہیں ہے اور میں نہیں چاہتی۔ وہ اپنے گھر فون کرنے کے بہانے ادھر گھسی رہے ابھی تو روحان گھر نہیں تھا جو میں نے برداشت کر لیا لیکن میں نہیں چاہتی وہ گنوار روحان کے سامنے آئے، اسی لیے اسے اس کے باپ کے جاتے ہی انیکسی میں شفٹ کر دیا تھا۔" وہ تلخی سے زہر اگل رہی تھیں۔

"شکورن...... شکورن۔" انہوں نے ملازمہ کو آواز لگائی۔

"جی بیگم صاحبہ!" ایک ادھیڑ عمر ملازمہ جلدی سے کچن سے نکل کر ان کے پاس آئی۔

"انیکسی میں ناشتا بھجوا دو اور اس لڑکی سے کہنا کالج سے واپس آ کر اپنے گھر فون کر لے اور ہاں ڈرائیور سے کہوں اسے راستہ، بس روٹ سب آج ہی سمجھا دے اور بتا دے کہ کل سے وہ خود آیا جایا کرے گی۔"

"جی بیگم صاحبہ۔" وہ تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے اپنے صاحب کی بھتیجی پر دل ہی دل میں ترس کھاتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

☆......☆

علیزے ڈرائیور کے ساتھ راستہ سمجھتے ہوئے واپس آ گئی تھی۔ آج کا پورا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ کالج میں بھی وہ اپنی سادگی کی وجہ سے سب سے الگ اور چپ چاپ ہی رہی تھی انیکسی میں آ کر اس نے اپنی سفید شال اتار کر تہہ کر کے رکھی اور پھر اندر گھر میں داخل ہوئی۔ صبح سے اس کا دل اپنی ماں کی فون کال میں اٹکا ہوا تھا پتا نہیں انہوں نے فون کیوں کیا تھا؟ ان کی طبیعت تو ٹھیک تھی، وہ سوچتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی ہی تھی کہ سامنے ایک ستر سالہ ایکٹیو سی بزرگ خاتون شکورن سے بات کرتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ انہیں دیکھ کر جھجک سی گئی تبھی ان کی نظر اس پر پڑی۔

"کون ہو تم؟ کیا انیتا کی دوست ہو؟" ان کی بارعب سی آواز ابھری۔

"السلام علیکم!" علیزے نے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے حیرت سے اس سادہ سی لڑکی کو دیکھا اس گھر میں تو ہیلو، ہائے ہی گونجتا تھا اور یہ لڑکی کتنے ادب سے سلام کر رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" بزرگ خاتون نے عینک درست کرتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

"آنٹی میں علیزے ہوں۔" اس نے اپنا نام بتایا۔

"کون علیزے؟ بھئی مکمل تعارف کراؤ۔" انہوں نے اسے گھورا۔

"علیزے سلیم، پروفیسر سلیم کی بیٹی سوات سے آئی ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"ارے تم اپنے سلیم کی بیٹی ہو، کب آئیں، سلیم اور زیبا کدھر ہیں؟" وہ پرجوش ہوئیں۔

"جی ابا چار دن پہلے چھوڑنے آئے تھے اب تو واپس سوات چلے گئے ہیں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"بالکل اپنی ماں پر گئی ہو ویسی ہی گوری چٹی، بڑی بڑی آنکھیں، جبھی تو مجھے دیکھتے ہی اپنی اپنی سی لگی تھیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"جی!" علیزے کی سمجھ نہیں آیا کیا جواب دے۔

"تم ادھر کیسے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"آنٹی! میرا ادھر شہر میں میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا ہے پڑھنے آئی ہوں۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"پہلی بات! تم مجھے نانو بولو، جیسے میں روحان اور انیتا کی نانو ہوں ویسے ہی تمہاری بھی، مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی تمہاری ماں میری چچازاد بہن کی بیٹی ہے اور تم اتنے دن سے ادھر ہو اور مجھ سے ملی بھی نہیں۔" انہوں نے شکایت کی۔

"سوری نانو مجھے آپ کا پتا نہیں تھا اور آپ مجھے گھر میں نظر بھی نہیں آئیں۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"کوئی بات نہیں ویسے بھی میں اپنے گھر میں رہنا پسند کرتی ہوں، یہ برابر والا گھر میرا ہے اگر تمہارا دل کرے تو کبھی کبھی آجایا کرو۔" وہ نرمی سے بولی۔

"جی نانو۔" علیزے نے تابعداری سے سر ہلایا۔

"بیٹی تمہارے لیے یہ نئی جگہ ہے نئے لوگ ہیں اگر کبھی بھی کوئی پرابلم ہو تو سیدھی میرے پاس آنا۔" انہوں نے شفقت سے اسے دیکھا۔

"جی نانو ضرور۔" علیزے نے تشکر بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

اتنے دنوں میں پہلی بار اسے اس شہر میں، اس گھر میں اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

☆......☆

تین دن کا ٹرپ ایک ہفتے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے سارے کنسرٹ سولڈ آؤٹ تھے۔ لندن، نیویارک، ٹورنٹو مسلسل سفر کی وجہ سے وہ بہت تھک چکا تھا لیکن چونکہ ڈیڈ سے جلد واپسی کا وعدہ کیا تھا اس لیے وہ آخری شو ختم کرتے ہی رات کی فلائٹ سے پاکستان واپس پہنچ چکا تھا گھر اطلاع نہیں کی تھی ارادہ ڈیڈ کو سرپرائز کرنے کا تھا۔ اس کے شو کی لیڈ سنگر ثانیہ بھی اس کے ساتھ فلائٹ میں تھی۔

"ہیلو روحان سر! ویلکم بیک۔" اس کا دوست پلس سیکریٹری فہد اسے لینے ایئرپورٹ آیا ہوا تھا۔

"ہمم!" وہ اشارے سے جواب دیتا ہوا اسے سامان گاڑی میں رکھنے کا کہہ کر خود پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ ثانیہ تیز رفتار سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

"روحان ڈیئر! میرا ڈرائیور نہیں آیا، لگتا ہے اسے میرا میسج نہیں ملا، کیا تم مجھے میرے فلیٹ تک ڈراپ کر سکتے ہو؟" وہ منت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"شیور، کیوں نہیں۔" روحان نے اسے اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ثانیہ کے بیٹھتے ہی فہد نے گاڑی کے دروازے بند کیے اور گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پر لے آیا۔

"فہد پہلے مس ثانیہ کو ان کے گھر تک چھوڑنا ہے۔" روحان نے اسے ہدایت دی۔

"اوکے سر!" فہد نے اثبات میں سر ہلا کر ثانیہ سے اس کا ایڈریس پوچھا اور گاڑی سی ویو کی طرف موڑ لی۔

ثانیہ کا فلیٹ سمندر کے کنارے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی اس نے روحان کے بازو پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھا۔

"روحان! آؤ نا چائے پی کر جانا۔" اس نے روحان کو چائے کی دعوت دی ویسے بھی وہ پورے ٹرپ میں وہ روحان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس کا ڈرائیور ایئرپورٹ پر اسے لینے کے لیے موجود تھا

لیکن روحان کو اپنے حسن کے جال میں پھنسانے کی ایک اور کوشش کرنے کے لیے اس نے ڈرائیور کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔

”ثانیہ پھر کبھی سہی، ابھی میں گھر جا کر تھوڑا آرام کروں گا۔“ روحان نے بےزاری سے اسے ٹالنا چاہا۔

”میں ایک ہفتے بعد گھر واپس آئی ہوں۔ ممی بھی لاہور گئی ہوئی ہیں۔ مجھے اکیلے اوپر جاتے ڈر لگ رہا ہے کہیں گھر میں کوئی چور اچکا چھپا ہوا نہ ہو، تم پلیز بس مجھے اوپر فلیٹ تک چھوڑ دو باقی میں مینیج کر لوں گی۔“ ثانیہ نے ریکوئسٹ کی۔

”اوکے!“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی سے اترا۔ رات کے نو بج رہے تھے وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا لفٹ کے ذریعے ساتویں فلور پر پہنچا، سامنے ہی ثانیہ کا پینٹ ہاؤس تھا۔ ثانیہ نے دروازے پر رک کر اپنے پرس میں سے چابی نکال کر لاک کھولا۔

”روحان پلیز ابھی مت جانا پہلے میں اندر چلی جاؤں اور لائٹس جلا لوں۔“ وہ ڈرے سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کم آن ثانیہ اب اتنا بھی کیا ڈرنا۔“ روحان نے اسے ہاتھ سے ایک کونے پر ہٹاتے ہوئے اس لگژری فلیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

ثانیہ اس کے پیچھے اندر داخل ہوئی پرس اتار کر میز پر پھینکا اتنے میں روحان اس کے پورے فلیٹ کی لائٹس آن کر چکا تھا۔

”اچھی طرح چیک کر لو، تسلی کر لو پورا گھر خالی ہے کوئی بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔“ روحان نے اسے گھورا۔

”بس تم دو منٹ ادھر بیٹھو میں کچن اور چیک کر لوں۔“ وہ تیزی سے بولتی ہوئی کچن میں آئی۔

روحان اس وقت کا سب سے مشہور ہاٹ سنگر پلس ماڈل تھا۔ اس کی وجاہت، اس کا ایٹی ٹیوڈ اسے سب سے الگ سب سے منفرد بناتا تھا۔ نئی نسل کو اس کا کریز تھا۔ ثانیہ کافی عرصہ سے روحان کے ساتھ افیئر کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ ہاتھ ہی نہیں آتا تھا اور آج اسے موقع مل گیا تھا، وہ اسے اپنے گھر تک لانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

اس نے فریج سے کوک نکال کر گلاس میں ڈالی اور اس میں نشے کی گولی شامل کر کے برف ڈالنے کے بعد اپنی جینز کی پینٹ سے فون نکالا۔ ”جنید تم رپورٹرز کو میرے فلیٹ بھیج دو۔ بریکنگ نیوز بنانی ہے۔ ”مشہور سنگر روحان اپنی گرل فرینڈ ثانیہ کے ساتھ“ اور سنو اس معاملے میں میرا نام نہیں آنا چاہیے۔“ اس نے جلدی سے فون بند کیا اور گلاس اٹھا کر باہر آ گئی۔

”روحان یہ لو ٹھنڈا پیو۔“ اس نے گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

”اس کی ضرورت نہیں، میں اب چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہوا۔

”پلیز تھوڑا سا تو لو میرے گھر پہلی بار آئے ہو ایسے سوکھے منہ تو نہیں جانے دوں گی۔“ وہ ناز سے بولتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

روحان نے اس کے ہاتھ سے گلاس تھاما اور ایک سانس میں پی کر خالی گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”لو پی لیا اب چلتا ہوں۔“ وہ روڈلی بولا۔

”کچھ دیر تو رکو۔“ ثانیہ نے اسے روکنے کی کوشش کی پر وہ بنا کچھ سنے اس کی ساری پلاننگ پر مٹی ڈالتے ہوئے تیزی سے باہر نکل کر لفٹ میں داخل ہو چکا تھا۔

”او گاڈ! یہ لفٹ میں ہی ہوش نہ کھو بیٹھے۔“ وہ جلدی سے باہر نکلی اور بٹن دبا کر لفٹ کے اوپر آنے کا انتظار کرنے

لگی دس سیکنڈ میں دوسری لفٹ اوپر آ چکی تھی اس نے اندر داخل ہو کر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا۔

روحان لفٹ سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے فہد نے جب اسے اس طرح نشے میں ڈولتے ہوئے دیکھا تو تیزی سے اتر کر اس کے پاس آیا۔

”روحان سر......! کیا ہوا؟“ فہد نے اسے سہارا دیا اور جلدی سے اپنی ناک پر ہاتھ رکھا۔

”سر آپ نے کیا پیا ہے؟“ وہ حیران تھا۔

”فہد یار تم مجھے دو دو کیوں نظر آ رہے ہو؟“ روحان نے اسے گھورنے کی کوشش کی۔

”آپ چلیں ادھر سے۔“ فہد اسے گاڑی میں بیٹھا ہی رہا تھا کہ ثانیہ دوڑتی ہوئی اس کے نزدیک آئی۔

”سنو مجھے لگتا ہے روحان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید لمبے سفر کی تھکان ہے تم اسے اوپر میرے بیڈروم میں لے کر چلو میں نے ڈاکٹر کو کال کی ہے وہ آتا ہی ہوگا۔“ ثانیہ نے اسے روکنے کے لیے اپنا آخری حربہ آزمایا

”میں سر کو ڈاکٹر کے پاس خود لے جاؤں گا آپ فکر مت کریں۔“ فہد نے سختی سے اسے ٹوکا اور گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے ریورس کرتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

ثانیہ دانت پیستے ہوئے روحان کی گاڑی کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ غصے سے اس کا برا حال تھا۔

”ڈیم اٹ پھر ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب میں ان فوٹوگرافروں سے کیا کہوں گی۔“ وہ پریشان ہوئی پھر اس نے اپنا فون نکالا۔

”سنو تمہارے فوٹوگرافر ابھی تک نہیں پہنچے اور وہ روحان نشے میں دھت اپنے گھر کی طرف چلا گیا ہے۔ اب تم انہیں ادھر ہی بھیج دو۔“

☆......☆

”علیزے!“ وہ فون کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ شاہانہ بیگم اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی لیونگ روم میں داخل ہوئیں اور اسے وہاں دیکھ کر چونک گئیں۔

”السلام علیکم تائی امی!“ علیزے نے ادب سے کھڑے ہو کر انہیں سے سلام کیا۔

”واٹ تائی امی؟ تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ مجھے اول تو مخاطب ہی نہ کرو اور اگر بات کرنی ہی ہے تو آنٹی کہو۔“ شاہانہ بیگم تپ اٹھیں۔

”سوری آنٹی! اب نہیں کہوں گی۔“ علیزے شرمندہ ہوئی۔

”شاہانہ بچی ہے اور رشتہ میں تو آپ اس کی تائی ہی لگتی ہیں اس میں اتنا برا ماننے والی کیا بات ہے؟“ نانو نے انہیں ٹوکا۔

”ممی پلیز! یہ میرے گھر کا معاملہ ہے آپ بیچ میں مت آئیں۔“ شاہانہ بیگم نے انہیں ٹوکا اور دوبارہ علیزے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”تم ادھر کیسے آئیں؟“

”وہ آنٹی، امی کو فون کرنا تھا تو......!“ وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

”علیزے، تم گیسٹ ہو تو گیسٹ بن کر رہو اس طرح بنا پرمیشن گھر کے اندر دندناتے ہوئے پھرنا مجھے پسند نہیں ہے۔“

”سوری آنٹی میں تو بس وہ فون۔“ وہ ان کے ترش لہجے پر پریشان ہوئی۔

”علیزے! میری بات غور سے سنو، ہماری اپنی بھی ایک لائف ہے روٹین ہے اگلی بار اس طرح منہ اٹھا کر مت چلی آنا پہلے انٹرکام پر پرمیشن لینا پھر ادھر آنا انڈر اسٹینڈ؟“ شاہانہ بیگم نے اسے وارن کیا۔
”سوری آنٹی اب نہیں آؤں گی۔“ علیزے بمشکل اپنے آنسو پیتے ہوئے بولی۔
”اپنا دھیان صرف پڑھائی میں رکھو اور خود کو گیسٹ ہاؤس تک محدود رکھنا سیکھو، اب جاؤ یہاں سے۔“ وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔
”شکورن! شکورن......“ علیزے کے جانے کے بعد انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔
”جی بیگم صاحبہ! شکورن کچن سے نکل کر ان کے پاس آئی۔
”جاؤ اوپر انیتا بی بی سے سیل فون لے کر اس لڑکی کے پاس گیسٹ روم میں پہنچا دو۔“ انہوں نے حکم دیا۔
”جی بیگم صاحبہ۔“ شکورن ادب سے سر ہلاتے ہوئے اوپر انیتا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔
”شاہانہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اس بچی کو اچھوت کی طرح ٹریٹ کر رہی ہیں؟“ اتنی دیر سے خاموشی سے تماشا دیکھتی ہوئی نانو نے انہیں پرسوچ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”ممی پلیز! آپ جانتی ہیں یہ چھوٹے گھروں کی مڈل کلاس لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔“
”کیسی ہوتی ہیں؟“ نانو نے عینک درست کرتے ہوئے سوال کیا۔
”ان کو اپنے گھر میں تو سہولتیں ملتی نہیں ہیں اس لیے پیسہ اور گلیمر دیکھ کر امیر گھر کے لڑکوں کو پھنسا لیتی ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ یہ لڑکی روحان کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا لے۔“ شاہانہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔
”شاہانہ مجھے آپ کی سوچ پر بہت افسوس ہے، وہ گھر کی بچی ہے ہمارا، آپ کا، اپنا خون ہے اور وہ ادھر پڑھنے آئی ہے اپنے لیے رشتہ تلاش کرنے نہیں آئی اور ذرا سوچیں، اس کے ماں باپ کو اگر آپ کے اس رویے کا پتا چلا تو انہیں کتنا دکھ ہوگا؟“ نانو نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔
”ممی پلیز اس کی ماں زیبا نے اسی طرح سلیم کو اپنے حسن کے جال میں ایسا پھنسایا تھا کہ وہ سب چھوڑ کر اس کے ساتھ گاؤں میں جا بسا اور بیٹی ماں کا پرتو ہوتی ہے میں نہیں چاہتی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے۔“
”جیسے آپ کی مرضی، اب شک و وہم کا تو کوئی علاج نہیں ہے آپ نے خواہ مخواہ اس بچی سے بیر باندھ لیا ہے۔“ نانو کھڑی ہوئیں۔
”آپ کدھر جا رہی ہیں رکیں ڈنر کر کے جایئے گا۔“ شاہانہ بیگم نے انہیں روکنا چاہا۔
”نہیں اب میں گھر چلوں گی۔“ نانو کا موڈ خراب ہو چکا تھا وہ آرام سے چلتی ہوئی اس محل نما گھر سے نکل کر برابر والے گھر میں جہاں وہ اکیلی ملازمین کے ساتھ رہتی تھیں داخل ہو گئیں۔

☆......☆

علیزے گیسٹ روم میں اپنی کتابیں پھیلائے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار اپنی تذلیل یاد کر کے آنسو آئے چلے جا رہے تھے۔ آج اسے اپنی امی کی بات اچھی طرح سے سمجھ آ گئی تھی کہ کہیں بھی چلے جاؤ ماں جیسی محبت اور خیال کوئی نہیں رکھ سکتا۔ اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہ گم سی کتابوں کو گھور رہی تھی کہ اس کا دروازہ بجا۔
اس نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کی۔ ”آ جائیں۔“
شکورن بوا اندر داخل ہوئیں۔ ”علیزے بی بی یہ بیگم صاحبہ نے آپ کے لیے فون بھیجا ہے۔“ شکورن نے سیل فون کا نیا ڈبہ اس کی سمت بڑھایا۔

”سیل فون!“ علیزے فون کا ڈبہ الٹ پلٹ کر کے دیکھتی ہوئی بولی۔
”جی وہ بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ اب آپ کو کہیں فون کرنا ہو تو اسے استعمال کرنا۔“ شکورن نے جھجکتے ہوئے شاہانہ بیگم کا پیغام دیا۔
”اس کی کیا ضرورت تھی میں خود لینے ہی والی تھی فون۔“ وہ فون شکورن کو واپس کرنے لگی۔
”بی بی یہ فون بیگم صاحبہ نے کل ہی انیتا بی بی سے اسپیشل کہہ کر منگوایا تھا تا کہ آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہو آپ بیگم صاحبہ کی باتوں کو دل پر مت لیں ان کا بس انداز ہی کڑوا ہے۔“ شکورن نے اسے جھوٹی تسلی دی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فون واپس لے جا کر اس لڑکی کے لیے کوئی نئے مسائل پیدا کرے۔
”اللہ اللہ آنٹی کو میرا کتنا خیال ہے انہوں نے میرے لیے فون لیا تا کہ مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔“ علیزے کی ساری اداسی کہیں دور بھاگ گئی تھی اب وہ پرشوق نظروں سے فون کو چیک کر رہی تھی۔
شکورن نے تاسف سے اس سیدھی سادھی لڑکی کو دیکھا جو شاید ہر حال میں خوش رہنا جانتی تھی۔
”بی بی اگر آپ کو بھوک لگے یا کچھ کھانے کا دل چاہے تو مجھے بتا دیا کریں میں لا دیا کروں گی میرا نمبر نوٹ کر لیں آپ!“ شکورن نے اپنا سیل فون نمبر اسے لکھوایا۔
شکورن بوا کے جانے کے بعد علیزے نے اپنی پوری توجہ کتابوں کی طرف کی، کافی دیر تک وہ پڑھائی میں مشغول رہی تھی پھر تھک کر انگڑائی لیتے ہوئے اس نے دیوار پر نصب گھڑی پر نظر ڈالی رات کے بارہ بجنے والے تھے۔
”افف اتنی دیر ہو گئی ابھی تو عشاء بھی پڑھنی ہے۔“ اس نے جلدی جلدی سے کتابیں سمیٹ کر بیگ میں رکھی بستر جھاڑ کر درست کیا اور دوپٹا اتار کر واش روم میں وضو کرنے چلی گئی۔

☆......☆

گاڑی گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ روحان نے چلتی گاڑی میں پوری پانی کی بوتل اپنے سر پر انڈیل لی تھی پھر بھی اس کا سر گھومنا بند نہیں ہوا تھا۔
”روحان سر! گاڑی کو گیسٹ ہاؤس کی پارکنگ میں لے لوں؟“ فہد نے اجازت مانگی۔
”کیوں؟ گھر چلو مجھے بہت تھکن ہو رہی ہے۔“ روحان نے کوفت سے جواب دیا۔
”سر! آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے اگر گھر میں سلیمان سر یا میڈم نے آپ کو اس حال میں دیکھ لیا تو سوچ لیں۔“ فہد نے اسے سمجھایا۔
”ہمم اٹس او کے، گیسٹ ہاؤس میں ڈراپ کر دو۔“ وہ مان گیا۔
گیسٹ ہاؤس کے دروازے پر پہنچ کر وہ گاڑی سے اترا۔
”سر میں آپ کو اندر تک چھوڑ دوں؟“ فہد نے اس کے لڑکھڑاتے قدموں کو دیکھ کر آفر کی۔
”نہیں میں مینیج کر لوں گا، میرے ایکسٹرا کپڑے ہمیشہ ادھر ہوتے ہیں صبح فریش ہو کر گھر چلا جاؤں گا۔ تم بھی اب گھر جاؤ۔“ روحان نے اسے چھٹی دی اور اپنی لیدر جیکٹ اتار کر اپنے کندھے پر ڈالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ چھوٹا سا لاؤنج عبور کر کے وہ سامنے بنے بیڈروم میں داخل ہوا۔ جیکٹ کندھے سے اتار کر بیڈ پر پھینکی۔ دونوں پیروں سے جوتے اتار کر دائیں بائیں اچھالے اور اپنی شرٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ شرٹ اتار کر اچھال کر پھینکی ہی تھی کہ اپنے گیسٹ روم میں ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔

علیزے وضو کر کے واش روم سے باہر نکلی ہی تھی کہ ایک مردانہ شرٹ اس کے چہرے پر آ کر گری اس نے جلدی سے اپنے چہرے سے اس شرٹ کو ہٹایا
''کون ہو تم ؟ ادھر کیا کر رہی ہو؟'' وہ اس بھیگے بھیگے چہرے والی لڑکی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
''آپ کون؟'' علیزے گھبرا کر پیچھے ہٹی۔
''سنو لڑکی!'' اس نے پیچھے ہٹتی ہوئی علیزے کو ہاتھ سے پکڑ کر روکا۔
''یہ میری جیکٹ خراب ہو گئی ہے اسے جلدی سے دھو دو باقی کمرے کی صفائی کل کرنا، اب جاؤ یہاں سے۔'' وہ علیزے کو ملازمہ سمجھ رہا تھا۔
''اور سنو، تم شاید نئی میڈ ہو اس لیے معاف کر رہا ہوں۔ آئندہ میرے کمرے میں بنا اجازت مت آنا۔ اب نکلو یہاں سے مجھے چینج کرنا ہے۔'' وہ انگلی اٹھا کر اسے جانے کا کہہ رہا تھا۔
علیزے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اتنی رات میں پتا نہیں یہ کون اتنے مالکانہ انداز میں گیسٹ ہاؤس میں گھس آیا تھا اور اب اسے یہاں سے نکال رہا تھا۔ اس وقت وہ کدھر جاتی، اس نے چور نظروں سے بیڈ کی طرف بڑھتے روحان کو دیکھا اور بیڈ پر رکھے اپنے دوپٹے اور سیل فون پر ایک نظر ڈال کر دبے پاؤں انہیں اٹھانے کے لیے بڑھی ابھی اس نے جھک کر اپنا دوپٹا اور فون اٹھایا ہی تھا کہ روحان مڑا اور وہ دونوں آپس میں ٹکرا کر بیڈ پر گر گئے۔ علیزے نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی اور کراہ کر رہ گئی۔
''امی جی!'' اس کے منہ سے آہ نکلی اس کے بال روحان کے گلے میں پہنی ہوئی چین میں اٹک گئے تھے۔
اس سے پہلے روحان اسے ڈانٹتا یا اس کی مدد کرتا کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور دو تین فوٹوگرافر اندر داخل ہوئے اور دھڑا دھڑ تصویریں کھینچنے لگے۔

☆......☆

سلیمان صاحب آرام چیئر پر بیٹھے سگار پیتے ہوئے لیپ ٹاپ گود میں رکھے اپنا آفس کا کام کر رہے تھے۔ سامنے ہی سنگھار میز کے سامنے اونچے اسٹول پر بیٹھی شاہانہ بیگم اپنے ہاتھوں پر کریم لگا رہی تھی جب کمرے کا انٹر کام بجا۔
''یہ اس وقت چوکیدار کیوں بیل دے رہا ہے۔'' شاہانہ بیگم نے فون کو دیکھتے ہوئے سلیمان صاحب کو مخاطب کیا۔
''ادھر دیجیے۔'' سلیمان صاحب نے انٹر کام ان کے ہاتھ سے لیا۔
''ہاں خان بولو۔''
''بڑے صاحب دو گاڑیاں ادھر گیسٹ ہاؤس میں آ کر رکی ہیں اور تین چار لوگ کیمرہ پکڑے اندر گئے ہیں۔'' چوکیدار نے اطلاع دی۔
''واٹ؟ میں آتا ہوں۔'' انہوں نے جلدی سے فون رکھا۔
''کیا ہوا آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' شاہانہ بیگم نے سوال کیا۔
''گیسٹ روم میں کچھ فوٹوگرافر داخل ہوئے ہیں۔ میں جا کر چیک کرتا ہوں ادھر تو کچھ بھی نہیں ہے اور روحان بھی ملک سے باہر ہے تو یہ فوٹوگرافر ادھر کیا کر رہے ہیں؟'' وہ نائٹ گاؤن پہن کر کھڑے ہوئے۔
''گیسٹ ہاؤس میں تو علیزے ہے۔'' شاہانہ بیگم نے جواب دیا۔
''واٹ؟ علیزے گیسٹ روم میں کیا کر رہی ہے؟'' وہ شدید حیران ہوئے۔
''اسے میں نے گیسٹ روم شفٹ کر دیا تھا تاکہ ہماری وجہ سے اس کی پڑھائی ڈسٹرب نہ ہو۔'' شاہانہ بیگم بھی

ساتھ چلنے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔
''میں آپ سے آ کر بات کرتا ہوں۔'' وہ تاسف سے انہیں دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔
سلیمان صاحب اور شاہانہ بیگم تیزی سے چلتے ہوئے انیکسی میں داخل ہوئے اندر بیڈ روم کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ سامنے ہی روحان بنا شرٹ کے کھڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ بنا دوپٹے اس کے گلے میں پڑی چین سے اپنے بالوں کو چھڑانے کی کوشش کرتی آنکھوں میں آنسو لیے لرزتی کانپتی علیزے تھی، فوٹوگرافر کھٹا کھٹ تصویریں بنا رہے تھے۔
''یہ کیا ہو رہا؟'' سلیمان صاحب کی بارعب آواز ابھری۔ ان کی آواز سنتے ہی وہ سب ان کی طرف پلٹے۔
''سلیمان صاحب! ہم نے مشہور سنگر روحان کو اس کی گرل فرینڈ کے ساتھ گھر سے اڑاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔''
''بکواس بند کریں اور نکلیں یہاں سے۔'' شاہانہ بیگم نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔
''میڈم آپ بتائیں یہ لڑکی کون ہے اتنی رات گئے روحان اس لڑکی کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟'' ایک صحافی نے سوال کیا۔
''آپ لوگوں کو غلط فہمی ہو رہی ہے روحان ایسا نہیں ہے۔'' شاہانہ بیگم نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔
''اگر روحان ایسا نہیں ہے تو پھر اس لڑکی کی یہاں موجودگی کو آپ کیا کہیں گی؟'' سوال پر سوال ہو رہے تھے۔
''یہ لڑکی!'' وہ چلتی ہوئیں علیزے کے پاس آئیں اور اس کا دوپٹا اٹھا کر اسے دیا۔
''یہ لڑکی ہمارے بیٹے روحان کی منکوحہ ہے۔'' انہوں نے دھماکا کیا۔
علیزے ان کے الفاظوں پر شاکڈ ہو کر انہیں بے یقینی سے دیکھنے لگی۔

☆......☆

شاہانہ بیگم کی بات سن کر ماحول میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ اس سارے کھڑاک سے بے خبر روحان اپنے گھومتے ہوئے سر کو پکڑے کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔
''سلیمان آپ روحان کو اندر لے کر چلیں میں آتی ہوں۔'' شاہانہ بیگم نے انہیں روحان کر لے کر وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا ان کے جاتے ہی انہوں نے علیزے کو چھوڑا اور ان صحافیوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔
''آپ لوگ اتنی رات گئے بنا اجازت ہمارے گھر میں کیسے داخل ہوئے؟ آپ صحافی ہیں اور یہ قانوناً جرم ہے اتنا تو آپ کو پتا ہوگا؟'' وہ ان سب سے مخاطب ہوئیں۔
''سوری میڈم! پر کیا ہم مسز روحان سے بات کر سکتے ہیں؟'' ایک رپورٹر ڈھٹائی سے مسکرایا۔
''میم آپ کا روحان سے نکاح کب ہوا؟ اسے میڈیا سے کیوں چھپایا گیا؟'' سوالات پر سوالات شروع ہو چکے تھے۔
''آپ سب میرے ساتھ آئیں۔'' شاہانہ بیگم ایک فیصلہ کر کے ان چاروں صحافیوں کو لے کر بیڈ روم سے باہر نکل گئیں۔ ان کے جاتے ہی علیزے ہوش میں آئی اور اس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ لاک کیا اور دروازے سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
شاہانہ بیگم ان سب کو لے کر گھر کے اندر لیونگ روم میں لائیں۔
''دیکھیں اس نکاح میں دونوں بچوں کی مرضی شامل نہیں ہے۔ یہ بزرگوں کے دباؤ کی وجہ سے ہوا تھا اسی لیے ہم نے میڈیا کو انوائیٹ نہیں کیا تھا اور میں نہیں چاہتی اس نکاح کی خبر باہر نکلے، اس کے لیے میں آپ کو منہ مانگی

قیمت دینے کو تیار ہوں۔" انہوں نے پتہ پھینکا۔

"میڈم کیا آپ ہمیں اس پر روحان جی کا اسائنمنٹ دلوا سکتی ہیں؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"آپ کو ایک بار کی بھی بات سمجھ میں نہیں آتی؟ اپنی اپنی قیمت بتائیں اور اپنے کیمروں سے ساری پکس ڈیلیٹ کریں۔" وہ دراز سے چیک بک نکالتے ہوئے بولیں۔

ان سب کو فارغ کر کے وہ اوپر روحان کے بیڈروم میں آئیں جہاں وہ دنیا جہاں سے بے خبر کپڑے بدلے سو چکا تھا۔ سلیمان صاحب نے انہیں اندر آتے دیکھ کر اپنے ساتھ اسٹڈی میں آنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھ لیا آپ نے اپنی ڈھیل کا نتیجہ؟ صاحبزادے نشے میں دھت گھر واپس آئے ہیں اور آپ!" وہ کمرے میں آتے ہی ان پر گرجنا شروع ہو گئے۔

"کیا سوچ کر آپ نے اس بچی کو انیکسی میں شفٹ کیا؟ میں اگر گھر پر نہیں ہوتا تو آپ یہ سلوک کریں گی میرے رشتے داروں سے؟" انہوں نے سوال کیا۔

"اف خدایا! آپ نے تو اس بچی کو بھی نہیں بخشا کیا سوچ کر آپ نے نکاح والا جھوٹ بولا؟ آپ کو پتا بھی اس بچی کو آپ نے کس مشکل میں ڈال دیا ہے؟ میں اپنے بھائی بھاوج کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" سلیمان صاحب کا غصے سے برا حال تھا۔

شاہانہ بیگم نے تپائی پر رکھا پانی کا گلاس ڈھکن ہٹا کر ان کی طرف بڑھایا اور بڑے پیار سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"سلیمان! آپ جانتے ہیں روحان ایسا لڑکا نہیں ہے۔ آپ کو اپنے خون پر بھروسا ہونا چاہیے، یقیناً کسی لے اسے ڈرگز دی ہیں جو وہ یوں ہوش و حواس سے بیگانہ پڑا ہے باقی آپ باتیں میں کیا کرتی؟ اگر نکاح کا نہیں بھی تو وہ روحان کی گرل فرینڈ، رھیل بن کر مشہور ہو جاتی کیا وہ ٹھیک رہتا؟ بولیں جواب دیں؟" شاہانہ بیگم نے انہیں سمجھا کر سوال کیا۔

"لیکن اب اس طرح بھی تو مناسب نہیں ہے بہتر یہی ہے کہ ہم ان بچوں کا نکاح کروا دیتے ہیں۔" سلیمان صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارے واہ ایسے کیسے نکاح کروا دیتے ہیں؟ ایک ہی بیٹا ہے میرا، میں اس کی شادی اپنی پسند سے دھوم دھام سے کروں گی۔" شاہانہ بیگم کے تو جیسے بگڑ گئے۔

"آپ ہی نے نکاح کا شوشا چھوڑا ہے اب سمیٹنا تو ہوگا۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولے۔

"میں نے ان صحافیوں کے منہ بند کر دیے ہیں آپ اس بات کے لیک ہونے کی فکر مت کریں۔" وہ بات کو سنبھالتے ہوئے نرمی سے گویا ہوئیں۔

"ٹھیک ہے لیکن اگر کبھی بھی میری بچی کا نام بدنام ہوا تو میں ایک منٹ نہیں لگاؤں گا ان کا نکاح کروانے میں، میری یہ بات یاد رکھیے گا اور اس بچی کو واپس گھر میں شفٹ کریں۔" وہ شاہانہ بیگم کو تنبیہہ کرتے ہوئے بولے۔

"وہ لڑکی اپنی مرضی سے گیسٹ ہاؤس میں شفٹ ہوئی تھی اسے پڑھائی کرنے کے لیے سناٹا، پرائیویسی چاہیے تھی اور اب میں اسے دوبارہ گھر کے اندر شفٹ نہیں کرنے والی اور آپ مجھے اس پر مجبور بھی نہیں کریں گے۔" انہوں نے جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑائی۔

☆.....☆

علیزے کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم قرار دی گئی تھی۔ اس کا کردار اس کی اپنی تائی

دنیا کی نظر میں داغدار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے صبح ہونے کا انتظار کر رہی تھی اسے اپنی امی، بابا، دوستیں یاد آ رہی تھیں لیکن وہ اپنی بیمار ماں کو سب بتا کر پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے بیگ میں سے اپنی ڈائری نکالی اس میں سے اپنی دوست ردا کا فون نمبر نکال کر میز پر پڑا سیل فون اٹھایا اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے نمبر پریس کیا۔

"ہیلو!"

"ہیلو کون ہو بھئی؟"

اتنے دنوں بعد اپنی عزیز دوست کی آواز سن کر اس کی آنکھیں بھر آئیں ایک سسکی سی منہ سے نکلی۔

"ردا می..... میں علیزے!" وہ سسکی دباتے ہوئے بولی۔

"او گاڈ! علیزے یہ تم ہو؟ اللہ کل سے میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی، کیسی ہو؟ اتنی صبح فجر کے وقت کیسے اٹھ گئیں؟ مرا آ رہا ہے، لگتا ہے کالج میں سیٹ ہو گئی ہو۔" وہ حسب عادت نان اسٹاپ بولنا شروع ہو گئی علیزے اس کی پرجوش آواز سن کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پائی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"علیزے! علیزے کیا ہوا ہے تم رو کیوں رہی ہو؟ سب ٹھیک تو ہے تم ٹھیک ہو؟" ردا پریشان ہو گئی۔

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے بابا کے جانے کے بعد اسے گھر سے گیسٹ ہاؤس شفٹ کرنے سے لے کر کل رات تک سارے واقعات بتا دیئے۔ ردا دم سادھے اس کی ساری باتیں سن رہی تھی۔

"بس میں واپس آ رہی ہوں مجھے یہاں نہیں رہنا۔" اس نے بات ختم کر کے اپنا فیصلہ سنایا۔

"خدایا کیسے ظالم نا تائی ہیں تمہارے، انہیں ذرا بھی خوف خدا نہیں ہے۔ سلیم چاچا کو یہ سب پتا چلا تو انہیں کتنا دکھ ہوگا لیکن علیزے ان لوگوں کی وجہ سے تم اپنی پڑھائی چھوڑ کر کیوں واپس آ رہی ہو؟"

"ردا! تقاضے کچھ ہونے کے بعد میں یہاں کیسے رک سکتی ہوں ویسے بھی یہ لوگ نہیں چاہتے میں یہاں رکوں یہ ان کے رویوں سے صاف ظاہر ہے۔" علیزے نے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر تم اپنے ان بے حس رشتے داروں کی وجہ سے اپنا، اپنے امی بابا کا ڈاکٹر بننے کا خواب توڑ کر واپس آ رہی ہو تو تم سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں ہوگا۔" ردا نے سنجیدگی سے اسے ٹوکا۔

"ردا! ڈاکٹر بننا میرے ایجوکیشن کا خواب ہے لیکن ایسے ماحول میں میں پڑھائی نہیں کر سکتی اور بابا کی پوزیشن بھی، مجھے پتا ہے وہ ہاسٹل کا خرچہ افورڈ نہیں کر سکتے بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ سسک اٹھی۔

"جو بھی ہے تم بہت مشکلوں سے وہاں تک پہنچی ہو اب اس طرح ہار مان کر واپس مت آؤ، تھوڑی ہمت کرو صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو اپنے ان سوکالڈ رشتے داروں سے دور رہو۔" اس نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

"ردا میں نہیں کر سکتی یار تم نہیں کر سکتی۔" وہ انکاری ہوئی۔

"سنو علیزے میں کراچی یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر رہی ہوں بس تم کسی بھی طرح ایک دو ماہ گزار لو پھر میں بھی کراچی آ جاؤں گی اور ہم دونوں مل کر کچھ کر لیں گے تم میرے ساتھ ہاسٹل شفٹ ہو جانا لیکن ابھی تھوڑی ہمت کرو اپنا خواب، اپنا کیریئر واپس آ کر برباد مت کرو، سمجھ رہی ہو نا میری بات؟" ردا نے اسے سمجھایا۔

فون بند کر کے اس نے گھڑی دیکھی فجر کا وقت اپنے اختتام کو تھا وہ جلدی سے وضو کرنے کے لیے واش روم کی طرف بڑھی۔

نماز پڑھ کر اس کے دل کو سکون ملا۔ اب وہ کالج جانے کے لیے تیاری کرنے لگی، ردا کی باتوں نے اسے حوصلہ

دیا تھا۔ بلاشبہ اچھے دوست نعمت ہوتے ہیں۔

☆.....☆

صبح کے نو بج رہے تھے سلیمان صاحب آفس جا چکے تھے۔ روحان ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ شاہانہ بیگم جوس کا گلاس ہاتھ میں لیے ڈائننگ ٹیبل پر اکیلی بیٹھی ہوئی اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑا رہی تھیں جب گلابی نائٹ ڈریس میں انیتا اندر داخل ہوئی۔

"گڈ مارننگ آنی۔"

"گڈ مارننگ تم یونیورسٹی نہیں گئیں؟" انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"آنی رات کو اتنا ہنگامہ ہونے کے بعد میں سوہی نہیں پائی تو یونیورسٹی کیسے جاتی؟" وہ مکھن اور ٹوسٹ کی ٹرے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔

"کون سا ہنگامہ؟" شاہانہ بیگم نے اسے گھورا۔

"او کم آن، آنی اب آپ مجھ سے بھی چھپائیں گی؟ میں کل جب پارٹی سے واپس آئی تو گیسٹ ہاؤس میں شور مچا ہوا تھا آپ ان سب کے ساتھ اتنا بزی تھیں کہ مجھے سائیڈ پر کھڑا دیکھا ہی نہیں آپ نے۔" اس نے مزے سے بتایا۔

"انیتا!" شاہانہ بیگم نے اسے تنبیہہ کرتی نگاہوں سے دیکھا۔

"آنی ایک بات بولوں۔" اس نے سنجیدگی اختیار کی۔

"ہاں کہو۔" شاہانہ بیگم نے اسے اجازت دی۔

"یہ جو کچھ بھی کل رات ہوا ہے وہ ٹھیک نہیں ہوا آپ جتنا جاہیں پیسے دے کر ان صحافیوں کے منہ بند کروا دیں لیکن اگر یہ نکاح والی بات لیک ہوئی ہے تو روحان کی فین فالوئنگ پر بہت برا اثر پڑے گا اس لیے آپ کو کچھ بھی کر کے اس علیزے نامی مصیبت سے پیچھا چھڑانا ہوگا۔" انیتا نے انہیں مشورہ دیا۔

"انیتا! میری بات غور سے سنو وہ گاؤں کی لڑکی ہے پکی پینڈو دیہاتن، میں تو اس کا نام بھی اپنے روحان کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی اس لیے اب اس لڑکی کو یہاں سے نکلوانا ہوگا۔" انہوں نے جوس کا گلاس میز پر رکھ کر سنجیدگی سے انیتا کو دیکھا۔

"وہ کیسے؟" انیتا نے پوچھا۔

"ہمیں بار بار اس لڑکی کو احساس دلانا ہوگا کہ وہ ہمارے بیچ رہنے کے لائق نہیں ہے اس کا کانفیڈنس ختم کرنا ہوگا عزت نفس مجروح کرنی ہوگی ویسے بھی ان مڈل کلاس لڑکیوں کے پاس عزت کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔" وہ نخوت سے بولیں۔

"لیکن آنی، ہم ایسا کیسے کریں گے؟ سلیمان انکل مان سکتے ہیں۔" انیتا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"ڈارلنگ بہت سمپل سی بات ہے ہمیں اس لڑکی کو بار بار ذلیل کرنا ہوگا خاص کر پارٹیز میں بلا کر کئی لوگوں کے سامنے اس اس کی حیثیت کا احساس دلانا ہوگا باقی رہی بات تمہارے سلیمان انکل کی تو ان کے سامنے ایسا تھوڑی کریں گے۔"

"واؤ آنی بڑا زبردست پلان ہے، مزا آئے گا۔ میں آج شام ہی اسے اپنی فرینڈز کی پارٹی میں انوائیٹ کرتی ہوں۔"

☆.....☆

شام کا وقت تھا۔ وہ آرام سے باہر باغ میں نرم گرم دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھیں جب ان کی خاص ملازمہ حمیدن ان کی بلڈ پریشر کی دوا اور پانی کا گلاس لے کر ان کے پاس چلی آئی۔

"بیگم صاحبہ آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔" حمیدن نے گولی نکال کر پانی کے گلاس کے ساتھ ان کی طرف بڑھائی۔

"آج آپ صبح سے بہت چپ چپ ہیں طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ کہیں تو ڈاکٹر صاحب کو چیک اپ کے لیے بلوا لوں؟" حمیدن نے پریشانی سے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں حمیدن، بس اس بچی علیزے کا سوچ سوچ کر دل کڑھتا ہے سلیمان کے سگے بھائی کی بیٹی ہے ان سب کا خون سفید ہو گیا ہے یہ لوگ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کر رہے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں وہ لڑکی میں نے دیکھی ہے بہت سیدھی اور پیاری ہے مجھے تو اسے اکیلا رہتے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے شکور ان تارہی تھی کہ بڑی بیگم صاحبہ نے اس کا کھانا پینا بھی الگ کر دیا ہے۔"

"میں سب دیکھ رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں وہ سمجھدار لڑکی ہے اللہ کرے اس میں اپنی قابلیت ہو کہ وہ اس سب کو ڈیل کر سکے لیکن اگر اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ ہمت ہار گئی تو پھر مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔" وہ فطمی لہجہ میں بولیں۔

"جی بیگم صاحبہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور علیزے بی بی کی ابھی عمر ہی کیا ہے بمشکل سترہ اٹھارہ سال وہ کہاں ان سازشوں کو جھیل پائیں گی۔"

"حمیدن وقت کیا ہو رہا ہے؟" وہ ایک فیصلہ کرتے ہوئے بولیں۔

"بیگم صاحبہ شام کے چھ بج رہے ہیں۔" حمیدن نے فوراً وقت بتایا۔

"ہماری شال لے کر آؤ، ہم ذرا علیزے بیٹی سے مل کر آتے ہیں۔" وہ کرسی کے ہتھے پر ہاتھ رکھتی ہوئیں کھڑی ہو گئیں۔

وہ کالج سے واپس آ کر سوگئی تھی شام کے چھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی وہ اپنے بال سمیٹتے ہوئے اپنی کتابیں اٹھا کر باہر باغیچہ میں بیٹھ کر پڑھنے میں مصروف تھی جب ڈیسنٹ سی نانو گرم شال کندھوں پر ڈالیں گیسٹ ہاؤس کے اندر داخل ہوئیں اور اسے کتابیں پھیلائے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسی کے پاس آ گئیں۔

"کیا ہو رہا ہے؟" وہ خوشگوار لہجے میں بولیں۔

"نانو آپ یہاں؟" علیزے کے چہرے پر انہیں دیکھ کر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"السلام علیکم، اللہ آپ کو اور دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔" وہ مسکرا اٹھی۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو۔"

"نانو آپ ادھر میرا مطلب آپ یہاں کیسے؟" وہ کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیوں میں کیا تم سے ملنے نہیں آ سکتی؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

"نانو آپ حکم کرتیں میں خود آ جاتی آپ کو اتنی ٹھنڈ میں میری وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑی۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"رات سے تمہیں دیکھنے کا، تم سے ملنے کا دل کر رہا تھا سوچا چل کر مل لیتی ہوں اور پھر مجھے یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ سوات کی وادیوں سے آیا یہ نازک نخا سا پودا اس بڑے شہر کی کڑی دھوپ میں مرجھا تو نہیں رہا۔ آخر اپنی جڑوں سے الگ ہونا دور ہونا آسان تو نہیں ہوتا۔"

"نہیں نانو اب یہ پودا کبھی نہیں مرجھائے گا بس آپ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں میں ان شاء اللہ اپنی تعلیم مکمل کر کے ڈاکٹر بن کر ہی اپنی جڑوں میں اپنے امی بابا کے پاس واپس جاؤں گی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"ہائے نانو۔" وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں جب انیتا جو علیزے سے ملنے ادھر آ رہی تھی انہیں دیکھ کر پاس آئی۔

"آپ یہاں ادھر گیسٹ ہاؤس میں کیسے؟" انیتا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔
"علیزے سے ملنے آئی تھی۔" وہ مختصر سا بولیں۔
"ارے واہ! میں بھی علیزے سے ہی ملنے آئی تھی وہ ایکچوئیلی شاہانہ آنٹی نے کل رات نو بجے ہوٹل میں پارٹی رکھی ہے اسی کا بلاوہ دینے آئی ہوں، علیزے تم کل رات ٹھیک نو بجے پہنچ جانا۔" وہ اجالا کو انوائیٹ کر رہی تھی۔
"نہیں انیتا جی میں نہیں آؤں گی۔" اس نے فوراً انکار کیا۔
"کیوں؟" انیتا نے حیرت سے پوچھا۔
"میرا آپ کی پارٹی میں آنا مناسب نہیں ہے ویسے بھی شاہانہ آنٹی نے مجھے صرف گیسٹ ہاؤس تک محدود رہنے کے لیے کہا ہے۔" علیزے نے صاف انکار کیا۔
"مجھے اس وقت تمہاری آنٹی نے ہی ادھر بھیجا ہے اب زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔" انیتا نے اپنا غصہ ضبط کیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔
"علیزے چلی جانا پارٹی میں اچھا ہے لوگوں سے ملو گی نئے دوست بنیں گے تھوڑا چینج ہو جائے گا۔" نانو نے اسے سمجھایا۔
"پر نانو میں کیسے؟ میں اس ماحول میں مس فٹ ہوں۔ مجھے اس طرح کے ماحول سے ڈر لگتا ہے۔ بھیڑ بھاڑ بھی پسند نہیں ہے۔"
"دیکھو بیٹی ماحول کو چھوڑنا یا بھاگ جانا مسئلے کا حل نہیں ہوتا بلکہ ماحول کو بدلنا اپنے لائق بنانا یہ انسان کو کامیاب کرتا ہے۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا۔
"جی نانو۔" وہ سر جھکا کر فرماں برداری سے ان کی بات مان گئی۔
"اب میں چلتی ہوں تم اپنا خیال رکھنا میں کل گاڑی اور ڈرائیور بھجوا دوں گی پارٹی میں ضرور جانا۔"

☆......☆

وہ نہ جانے کتنی دیر تک سویا رہا تھا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پورا دن سوتے ہوئے ہی گزر گیا تھا ابھی بھی وہ کسلمندی سے بستر میں آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا جب اس کی آنکھوں میں ایک اجنبی خوب صورت گلابی بھیگا بھیگا سا چہرہ جگمگایا۔
گلابی رخساروں پر سایہ فگن گھنیری پلکوں کا جال بار بار اس کی آنکھوں میں اتر رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"میں ادھر اپنے کمرے میں کیسے آیا؟" وہ حیران ہوا اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔
وہ اپنے ذہن پر زور دینے لگا ایئر پورٹ سے ثانیہ کے گھر تک جانا وہاں کولڈ ڈرنک پینا پھر اس کے فلیٹ سے نکل کر لفٹ میں جانا بس! اس سے آگے کا اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا لیکن یہ تو اسے کنفرم ہو گیا تھا کہ ثانیہ نے اسے کوئی نشہ آور دوا ڈرنک میں ملا کر دی تھی۔
"مس ثانیہ تم نے غلط آدمی سے پنگا لیا ہے۔" وہ بڑبڑایا اور اٹھ کر بیڈ روم فریج سے کوک کا کین نکال کر ایک سانس میں پی گیا اس کی آنکھوں میں بار بار ایک مبہم سی شبیہہ ابھر رہی تھی ایک انجان گلابی چہرہ وہ چاہ کر بھی اس چہرے کو اپنی آنکھوں سے، اپنے دماغ سے نکال نہیں پا رہا تھا۔
"ڈیم اٹ، کون ہو تم جو اس طرح میرے حواسوں پر چھا رہی ہو۔" وہ کوک کا کین پٹختے ہوئے بڑبڑایا۔
(جاری ہے)

زرقا بھٹی

سیاہ معاشرہ

نورین نے لاک میں چابی گھمائی اور دروازہ بڑی آہستگی سے کھولا۔ وہ یک دم روشنی سے اندھیرے میں آئی۔ لاؤنج کی تمام لائٹس آف تھیں۔ تھکے ہوئے قدموں سے وہ آگے بڑھی اور اس نے سرعت سے سوئچ بورڈ ٹٹولا۔ مگر شاید وہ ابھی تک حواس باختہ تھی۔ کبھی کبھی اسے اپنی یہ ہی عادت زہر لگا کرتی تھی کہ وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو اتنی سنجیدگی سے ـــــ سر پر سوار کر لیتی ہے۔

وہ اندھیروں سے ڈرنے والوں میں سے نہیں تھی مگر آج اسے اس سب سے عجیب کوفت ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ معاشرہ اس کے ساتھ اس کے گھر تک آ گیا ہے۔ تبھی اسے سوئچ بورڈ نہیں مل رہا اور..... شاید اسی نے اپنے وجود سے ہر طرف اپنی سیاہی پھیلا دی ہے۔ وہ بڑی محتاط ہو کر قدم اٹھا رہی تھی کہ مبادا کہیں کسی شے سے ٹکرا نہ جائے مگر کانوں میں اس معصوم معاشرے کی بازگشت کسی طور کم نہیں ہو پا رہی تھی اور آنکھوں کے سامنے اس گھپ اندھیرے میں بھی وہ معاشرے کو آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھے، سیاہ شلوار قمیص پہنے مدھم اسپاٹ لائٹ میں کھڑا دیکھ رہی تھی۔ پیچھے مدھم سروں میں میوزک چلے تھا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نوجوان نے بلند اور درناک آواز میں آنکھوں پر پٹی باندھے جیسے ایک بار پھر سے دہرایا تھا۔ وہی الفاظ، وہی ربط، وہی آواز میں افسردگی و بے چارگی۔

جب مجھے مار دیا جائے گا
مجھ کو تسلیم کیا جائے گا

”میں وہ اندھا معاشرہ ہوں جہاں ہر کسی نے اپنی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ رکھی ہے جسے اتارنے کی نہ تو کوئی جرأت کر سکتا ہے اور نہ ہی آواز اٹھا سکتا ہے اور جو اس کی جسارت کرتا ہے اس کو دردناک انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ آج ایک معاشرہ اپنے باسیوں سے سوال کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا لہجہ جواب طلب اور حیران کن تھا۔ آخر اس اندھیر نگری میں کسی کو تو دیا جلانا ہوگا۔ کسی کو تو بارش کا پہلا قطرہ بننا ہوگا کیونکہ ایک دیا کبھی بھی روشنی نہیں پھیلا سکتا جب تک کہ دوسرے دیوں کی روشنی اس کی روشنی بڑھانے میں مدد نہ کریں۔ ایسے میں جس معاشرے کے تمام دیے بجھا دیے جائیں اور بارش کے شفاف قطروں کو زرخیز مٹی کے بجائے منافقت، فریب اور جال سازی جیسی مٹی میں ملایا جائے تو جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ میرے جیسا ہی سیاہ اور اندھا ہوگا اور آخر کار اس پر جو رنگ چڑھے گا وہ اپنا اثر کھو دے گا کیونکہ یہ سیاہ رنگ کی خصوصیت ہے کہ اس پر کوئی رنگ نہیں چڑھتا۔

نورین کے قدم بے ساختہ شیشے کی کٹ ورک میز کے سامنے جا کر تھمے اور ان آوازوں کو بھی یک دم بریک لگ گئی۔

پہلا سین حباب کی طرح اس کے سامنے سے پھٹ کر کے اڑ گیا تھا اور سوئچ بورڈ تک کا مختصر سفر بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا مگر وہاں ہنوز اندھیر اتھا شاید بجلی نہیں تھی۔ اس کا سر جو پہلے ہی معاشرے کی آوازوں سے چکرایا ہوا تھا ایک بار پھر چکرا گیا۔ اس کے موبائل کی بیٹری بھی ختم تھی۔ اسی لیے اندھیرے میں ہی دیوار پر بنے لکڑی کے ریک میں سے ماچس اٹھا کر اس نے میز پر پڑی ڈیکوریٹڈ موم بتیاں روشن کر لیں، دیوار پر اپنا سایہ دیکھ کر دوسرا سین اس کے سامنے لہرایا تھا۔

معیز اپنی سرباہی کرسی پر براجمان تھا جب کہ عاصم اس کے سامنے والی کرسی پر۔ آفس کا ماحول تھا۔ معیز کے ہاتھ لیپ ٹاپ کے کی بورڈ پر مصروف تھے۔

عاصم: ”آپ اور کتنا وقت لیں گے معیز غازی؟“ انداز بے حد سنجیدہ تھا۔

معیز: ”میں پچھلے ایک مہینے اسی نیوز اسٹوری پر کام کر رہا ہوں ویسے بھی ابھی کل ہی کیس اسٹڈی مکمل ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ آج رات تک لکھنے کا کام مکمل ہو جائے گا اور کل صبح ہی اسے پبلشنگ کے لیے بھیج دوں گا۔“ پراعتماد انداز میں ہاتھ کی پیڈ پر چلاتے ہوئے اس کی نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔

عاصم: ”ویل ڈن آصف یو آر فوکسڈ پرسن اور جانتے ہو کہ اسی لیے یہ کام میں نے تمہیں سونپا تھا کہ اس حساس کیس کو تم ہی ہینڈل کر سکتے ہو۔ بس ایک بار یہ کیس پبلش ہو جائے تو سب میڈیا اور لوگوں کی سپورٹ ہمارے ساتھ ہوگی۔ اس کیس کو مقبولیت ملے گی اور جتنا زیادہ لوگ، تنظیمیں، میڈیا ہمارے ساتھ ہوگا اتنی ہی جلد حکومت اس پر ایکشن لے گی۔“

معیز: ”اور تب ہی میرا مقصد پورا ہوگا۔ صابرہ کے ملزموں کو سزا دی جائے گی اور اس جیسے بے شمار نشہ بیچنے والے معصوم بچے اس جہالت سے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے۔“ پہلی بار اس نے لیپ ٹاپ سے نظریں اٹھا کر خاصے پرجوش انداز میں کہا۔

”بہت احتیاط سے کام لو۔ اس اسٹوری کے پیچھے بہت اونچے ہاتھ ہیں ویسے بھی جب یہ اسٹوری پبلش ہوگی تو اس خاندان کی ساکھ اور نام دونوں مٹی میں مل جائیں گے۔“ عاصم نے سامنے میز پر رکھی بال پوائنٹ اٹھا کر انگلی کی مدد سے گھماتے ہوئے اسے بڑے گھمبیر لہجے میں نصیحت کی تھی۔

معیز: ”مانا کہ میں بہت بے خوف انسان ہوں I never reveal my sources لیکن ایسے عزت کی چادر میں قید بھیڑیوں کو سرعام بے نقاب کرنے میں، میں اتنا سا بھی گریز نہیں کروں گا آخر لوگوں کو بھی تو پتا چلے کہ مذہبی تعلیم دینے والے اس مولوی نے اپنی بیوی کے تشدد پر کس طرح اس کا ساتھ دیا تھا۔ دونوں میاں بیوی صابرہ کی موت کے ذمے دار ہیں اور ان کو سزا ضرور ملے گی۔“ دانت پیس کر ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی مشکل سے اس نے اپنا غصہ ضبط کیا۔

”بے شک ان لوگوں کا ٹھکانہ جیل کی سلاخیں ہونی چاہئیں۔ جاتے ہوئے لیپ ٹاپ اور تمام فائلز لاکر میں رکھ کر جانا۔ پبلش ہونے تک کسی قسم کا رسک ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔“ عاصم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا اور پھر آخری نصیحت کر کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ معیز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆.....☆

نورین کی نظریں دیوار پر اپنے ہی سائے پر مرکوز تھیں۔ اس کے لمبے بال سپید دیوار پر پگھلی روشنیوں میں بڑے بھیانک لگ رہے تھے مگر اس سے بھی زیادہ بھیانک وہ دردناک منظر تھا جو اسی دیوار پر اسی کے سائے کے اوپر ابھرا تھا یعنی معیز کے قتل کا افسوس ناک منظر۔ کام مکمل کر کے جب وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور ابھی چیئر سمیٹ ہی رہا تھا کہ دو نقاب پوشوں نے آفس میں گھس کر اسے بڑی بے رحمی سے شوٹ کر دیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی اسکرین پر جلتا دیا بجھ گیا۔

نورین پر عجیب سی غنودگی طاری ہو گئی تھی۔ سر جھٹک کر وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ تکان کا احساس اس کی رگ و پے میں رچا ہوا تھا۔ صوفے سے ٹیک لگا کر اس نے آنکھیں موندیں تو اگلا سین دندناتا ہوا اس کے پپوٹوں تلے رقص کرنے لگا۔

پردہ پیچھے ہٹا، ایک ماڈرن سی نیوز اینکر مائیک ہاتھ میں تھامے نیوز دے رہی تھی۔

”انسانیت کے خلاف آواز اٹھانے والے صحافی معیز غازی کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ تقریباً رات دو بجے کا وقت تھا جب

نامعلوم افراد نے معروف صحافی معیز غازی کے آفس میں گھس کو انہیں گولی کا نشانہ بنایا۔ تحقیق کے مطابق وہ کسی خفیہ کیس کو سر عام لانے میں مصروف تھے تاہم کیس اپنے آخری مراحل میں تھا۔ تحقیق کے مطابق یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کا تمام قیمتی سامان بھی وہاں سے غائب ہے۔ مزید تحقیقات ابھی جاری ہیں۔"

پردہ گرتے ہی نورین نے آنکھوں پر زور دے کر آنکھیں جھٹکے سے کھول دیں۔ ذہن ابھی تک اس کھیل میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ موم بتی کی روشنی میں لاؤنج اسے خاصا پراسرار لگ رہا تھا۔ سامنے لگے جالی کے سفید پردوں پر نگاہ ٹھہری تو آخری سین کسی دریا کے بہاؤ کی مانند اس کے سامنے موجود تھا۔

پردہ ہٹتے ہی معاشرہ اسٹیج پر کھڑا تھا اسی سابقہ حلیے میں مگر اب اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھی۔ سگریٹ سلگاتے ہی اس نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور پھر درد بھری آواز میں گویا ہوا۔

"پھر آخر معیز غازی کو مار دیا گیا۔ قصور کیا تھا اس کا؟ مظلوم کی مدد، سچائی کا پرچار یا پھر انصاف کا بول بالا؟" دھیما لہجہ مگر سوالیہ انداز میں بولنے کے بعد اس نے سگریٹ زمین پر گرا کر اسے پاؤں تلے مسلا اور دانت پیس کر غصے سے ایک بار پھر بات کا آغاز کیا۔

"ظلم پر ظلم، زیادتی، جھوٹ پر جھوٹ اور فریب تم لوگوں کا شیوہ بن چکا ہے۔ صابرہ آواز نہ اٹھائے اس کی آواز دبا دی گئی۔ معیز آواز اٹھانے لگا تو اس کی آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی۔ سچ ایسے ہی دب جاتا ہے کسی بھی ڈر، خوف، جھوٹ کے نیچے۔ اس تحقیق کے اوپر ایک اور تحقیق ہونے لگتی ہے بالآخر تمام تحقیقات ہی ادھوری رہ جاتی ہیں۔ وقت گزر جاتا اور سچ مر جاتا ہے۔" کچھ توقف کے بعد معاشرے نے گہرا سانس لیا تھا۔

نورین نے پردے سے نظریں ہٹا کر دائیں بائیں گردن گھمائی تو جو گانا اس کھیل کے آخر میں پلے ہوا تھا، ایک بار پھر اس کے سماعت میں گونجنے لگا۔

بول کے لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

گانے کے ختم ہوتے کے ساتھ ہی معاشرے کے آخری الفاظ اس کے سماعت سے ٹکرائے۔

"آواز اٹھائی جاتی ہے۔ زبان بھی کھولی جاتی ہے مگر کھلنے کے ساتھ ہی دبا بھی تو لی جاتی ہے اس لیے کیونکہ تم ایک دیا جلانے والے کے ساتھ دیا نہیں جلاتے ایک آواز کبھی اثر نہیں رکھتی۔ گونج اثر رکھتی ہے اور گونج کبھی ایک فرد کی نہیں ہوتی وہ افراد کی ہوتی ہے اور افراد سے مل کر معاشرہ جنم لیتا ہے۔ تم لوگوں نے مجھے سیاہ کر دیا ہے۔ خدارا مجھے سیاہ نہ بناؤ۔" معاشرے نے خود اپنی طرف اشارہ کر کے بڑی تکلیف سے کہا۔ کہ آنسو اس کے گالوں پر ڈھلے اور پھر روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر وہ اسٹیج پر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کی آواز میں درد کے ساتھ التجا بھی تھی۔

"میں سیاہ ہوں، مجھے اجلا کر دو۔"

معاشرے کے آخری الفاظ اس کے سماعت سے ٹکرانے کے ساتھ ہی بجلی آ گئی اور لاؤنج روشن ہوتے ہی وہ جیسے اس پلے کے ٹرانس سے باہر نکلی۔

آج وہ اپنی کزن کے کہنے پر لمز یونیورسٹی پلے دیکھنے کے لیے گئی تھی۔ اس کی کزن جو ڈرامیٹک سوسائٹی کی پریزیڈنٹ تھی اس نے بطور خاص اس کھیل میں ایک Abstract کردار رکھا تھا مگر اس کی سیاہی جیسے وہ اپنے ساتھ گھر ہی لے آئی تھی۔

گہرا سانس لے کر وہ خود کو نارمل کرتی سونے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

......☆......

سباس گل

خوشبو کا پیرہن ہو

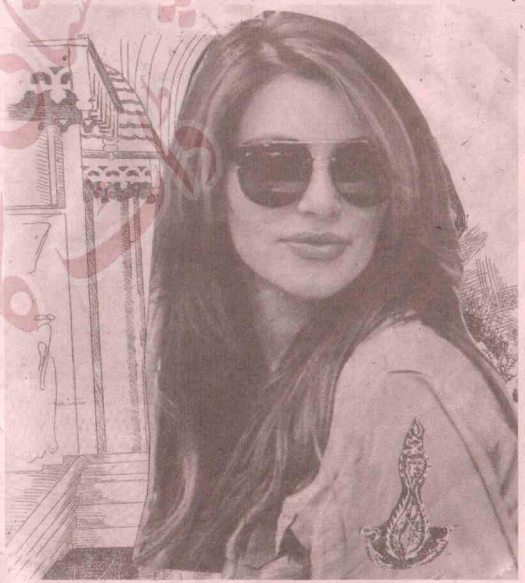

''یہ اپنا کوٹ بھی رکھ لو، کیا خبر وہاں کتنے دن لگ جائیں۔ ادھر تو تمہارے کپڑے بھی نہیں ہیں۔'' ماریہ نے سارہ کو اس کا کوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ماریہ اس کی بیسٹ فرینڈ تھی وہ دونوں میڈیکل کے آخری سال میں تھیں۔

''تم مذاق کر رہی ہو یا طنز؟'' سارہ نے اپنا سوٹ کیس بند کرتے ہوئے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے

استفسار کیا۔

''طنز تو میری جان! میں تم پر کر ہی نہیں سکتی۔'' ماریہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

''گویا مذاق ہے۔ اتنی گرمی میں کوٹ لے جانے کا مطلب؟ میں ہفتے بھر میں واپس آجاؤں گی۔ کوئی ایک سال کے لیے نہیں جا رہی کہ گرمی سے سردی آجائے گی میری واپسی تک۔'' سارہ نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''ویسے سارہ! ایسا کبھی ہوا تو نہیں ہے۔ گذشتہ چھ سال سے تو میں تمہارے گلے کا ہار بنی ہوئی ہوں۔ یہ پہلی بار ہی بابل کے انگنا سے تمہارا اس طرح سے بلاوا آیا ہے اور چھٹیاں بھی نہیں ہیں، پیپرز ہونے والے ہیں۔ آخر کیا بات ہو سکتی ہے؟'' ماریہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ تشویش تو اسے بھی تھی مگر ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

قسط نمبر 1

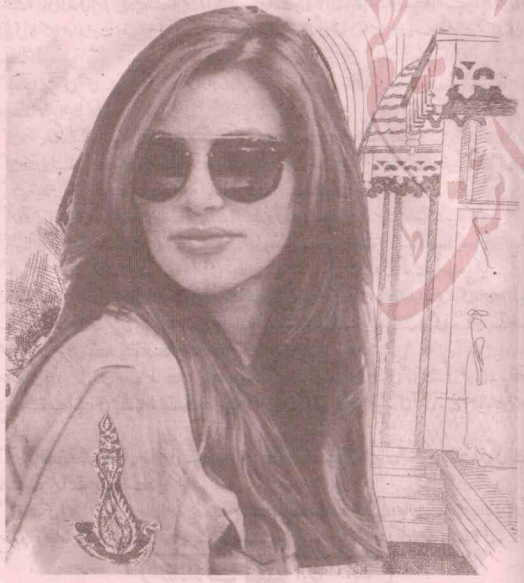

"یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا۔ دانش بتا رہا تھا کہ دادا ابا کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ کسی بھی وقت خدانخواستہ رخصت ہو سکتے ہیں۔ شاید ان سے آخری ملاقات کے لیے مجھے بلایا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ دادا ابا کی طبیعت تو پہلے بھی خراب ہوتی رہی ہے مگر وہ بالکل ٹھیک ہو جاتے تھے۔" سارہ نے جلدی جلدی بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بتایا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے سوال اور وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔

"کیا خبر تمہاری ڈاکٹری سے مستفید ہونا چاہتے ہوں۔ خیال رکھنا کہیں جاتے جاتے "مدعا" تمہارے گلے ہی نہ پڑ جائے۔" ماریہ نے مسکراتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو اسے ہنسی آ گئی۔

"بکومت، میرے دادا ابا بہت اچھے ہیں۔ اللہ انہیں صحت و زندگی دے۔" سارہ نے دل سے کہا۔

"آمین۔" ماریہ نے بہ آواز بلند کہا اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔

"وہ تمہارے منگیتر کم محبوب صاحب کب تشریف لائیں گے؟" سارہ اپنی تیاری مکمل کر کے ریسٹ واچ پر ٹائم دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ وہ بھی مذاق کے موڈ میں آتے ہوئے بولی۔

"منگیتر اور محبوب وہ میرے ہیں تو تمہیں ان کی آمد کی اس قدر فکر کیوں ہے؟"

"مجھے ان کی آمد کی فکر اس لیے ہے نا مکمل ڈاکٹر ماریہ کیونکہ میری فلائیٹ کا وقت ہونے والا ہے۔ اگر دیر ہو گئی تو ڈیڈی کا بھیجا ہوا ہدایت نامہ، ان کی بک کرائی گئی سیٹ چلی جائے گی ضائع اور انہوں نے مجھے ایمرجنسی میں بلایا ہے۔"

"یار یہ ایمرجنسی کیسی ہے؟ تم بھی بے فکر ہو اور ادھر سے بھی کوئی سسکی سنائی نہیں دے رہی۔" ماریہ نے سوچتے ہوئے بھویں اچکا کر کہا۔

"ہیلو سویٹ گرلز!" ماریہ کا منگیتر جنید جو خود بھی ڈاکٹر تھا، دروازے سے جھانکتے ہوئے بولا۔

"ہیلو بیٹر بوائے۔" سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ پوری طرح اندر آ گیا۔ اس کے بیٹر بوائے کہتے ہی ہنس دیا۔

"لیجیے شیطان کا ذکر کیا اور شیطان حاضر ہو گیا۔" شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہ تو میرا ذکر خیر ہو رہا تھا۔" جنید نے مسکراتے ہوئے خوش ہو کر اپنے کالر درست کرتے ہوئے کہا۔

"شیطان کا ذکر کبھی خیر کے معنوں میں نہیں ہوتا منگیتر جی۔" ماریہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں تم تو مجھ جیسے فرشتہ صفت شخص کا ذکر بھی شیطان کے معنوں میں ہی کرو گی نا۔ کیسا فساد بپا کیا ہے تم نے میرے اندر بس تمہاری شیطانی صورت ہی ہر وقت دل و دماغ میں گھومتی رہتی ہے، مجال ہے جو کسی دم و درود یا دوا سے کوئی افاقہ ہوا ہو۔ مرض ہے کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ کچھ علاج اے چارہ گر اس کا بھی۔" جنید نے ماریہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بہت شوخ و شریر لہجے میں کہا۔

سارہ ان دونوں کی اس خوب صورت اور پیار بھری نوک جھونک سن کر محظوظ ہو رہی تھی ہمیشہ کی طرح۔ یہ دونوں جب ملتے تھے ایسے ہی چٹکلے چھوڑتے تھے۔ ماریہ کو بھی اس کی باتوں پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ چہرہ حیا سے گلنار ہو گیا۔

"تمہارا علاج تو میں بعد میں کروں گی۔ پہلے تم وہ کام کرو جس کے لیے تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی گئی ہے۔" ماریہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔

"زحمت کیسی ڈیئر! اپنی سسٹر، سالی اور فرینڈ کو ایئر پورٹ لے جانا ہے نا تو بندہ دل و جان سے حاضر ہے۔ چلو بھئی سارہ لاؤ تمہارا سامان کہاں ہے؟" جنید نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں سامان خود اٹھا لوں گی جنید بھائی!"

"ارے اٹھانے دو اسے، ابھی سے پریکٹس کریں گے تو بوجھ اٹھانے کی عادت پڑے گی نا۔" ماریہ نے مذاق سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

"تمہارا بوجھ تو میں ابھی اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھانے کو تیار ہوں بس تمہاری اجازت چاہیے۔" وہ شوخ و شریر لہجے میں بولا۔

"پہلے اپنے ناتواں کاندھوں کو مضبوط اور توانا بنا لو پھر اٹھانا میرا بوجھ یہ نہ ہو کہ تم مجھے گرا ہی دو۔" ماریہ نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور پھر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"فکر کیوں کرتی ہو لائف ٹائم گارنٹی دوں گا۔ آزمائش شرط ہے۔"

"چلو دیکھیں گے۔" وہ شرمیلے پن سے مسکراتے ہوئے بولی۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لیے پیار چھلک رہا تھا۔

"لیلیٰ، مجنوں کے پیروکارو! میں بھی یہاں موجود ہوں کچھ خیال میرا بھی۔" سارہ نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ دونوں بے ساختہ ہنس پڑے اور پھر جنید اسے اور ماریہ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

"ماریہ! اگر مجھے زیادہ دن لگ جائیں تو میری ایپلی کیشن دے دینا۔" سارہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا وہ جنید کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"یار ایگزامز ہونے والے ہیں، اب کلاسز تو ہوں گی نہیں لہذا حاضری کی طرف سے بے فکر رہو اور پلیز جلدی آ جانا تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔" ماریہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور میرے بغیر تمہارا دل لگے گا؟" جنید نے ماریہ کو دیکھتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"کیوں تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے اسے گھور کر تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں گھر ڈراپ کر کے اپنے گھر تو جاؤں گا ہی نا شہر سے باہر جاؤں گا تب بھی۔"

"شیطان تو ہر وقت ہر جگہ ساتھ ساتھ رہتا ہے۔" ماریہ نے شرارت سے جواب دیا تو سارہ نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"ہوشیار رہنا اگر کسی دن یہ شیطان بہک گیا نا تو۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرانے لگا۔

"بدتمیز۔" ماریہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ ہنستا چلا گیا۔

سارہ کو ایئر پورٹ پر الوداع کہنے کے بعد وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

زندگی تو نے ہر قدم پر مجھے ایک سپنا نیا دکھایا ہے
کبھی غم کو خوشی کا رنگ دیا کبھی ہنستے ہوئے رلایا ہے

☆......☆

جمعہ کا دن تھا۔ دوپہر کے بارہ بجے تھے جب وہ کراچی ایئر پورٹ سے باہر نکلی اور دانش، رامش اور ڈیڈی کی تلاش میں نگاہ دوڑانے لگی۔

"سارہ!" ایک مردانہ نرم اور دلکش آواز نے اسے پکارا تو وہ فوراً پلٹی۔

"آپ؟" اس نے پھپھو سعدیہ کے بیٹے صارم کو اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

"میں آپ کو لینے آیا ہوں۔" سارہ نے فوراً سلام کیا تو وہ خجل سا ہو کر بولا۔
"وعلیکم السلام اینڈ آئی ایم سوری۔"
"سوری فار واٹ؟"
"سلام میں پہل مجھے کرنا چاہیے تھی۔" اس نے اس کے صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔
"چلیے کسی معاملے میں کسی کو تو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔" سارہ نے معنی خیز بات کہی۔
"میں سمجھا نہیں۔" صارم الجھ گیا کہ آخر اس نے یہ بات کیوں کہی ہے۔
"آپ کے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔" سارہ نے سنجیدگی سے کہا اور ٹرالی سے اپنا سوٹ کیس اٹھالیا۔
"لائیے میں اٹھا لیتا ہوں۔" صارم نے ہاتھ آگے بڑھایا۔
"شکریہ! مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانے کی عادت ہے۔" سارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دے کر اسے مزید حیرت اور الجھن میں مبتلا کر دیا۔ سارہ نے اپنا سوٹ کیس گاڑی کی ڈگی میں رکھا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ صارم اس کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ اس کے پچھلی سیٹ پر بیٹھ جانے پر وہ دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اسے سارہ کی اس حرکت پر شدید غصہ آرہا تھا۔ وہ کوئی اس کا ڈرائیور تھا، نوکر تھا جو وہ ایسے بی ہیو کر رہی تھی۔ اس نے بیک مرر میں دیکھا، وہ بہت پرسکون بیٹھی تھی اور اس کا سکون برباد کر رہی تھی۔
"عجیب لڑکی ہے۔ اتنی ایمرجنسی میں اسلام آباد سے کراچی بلایا گیا ہے اسے اور اس نے پوچھا تک نہیں کہ آخر کیوں بلوایا ہے، گھر میں خیریت ہے یا نہیں۔ پتا نہیں یہ ایسی ہی ہے یا ایسی بے پروا بنتی ہے۔ میں اسے کبھی سمجھ بھی پاؤں گا کہ یوں ہی ساری زندگی الجھتا رہوں گا۔" صارم نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے دل میں سوچا اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔
"آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلوایا ہے ماموں جان نے؟"
"نہیں۔" پرسکون جواب آیا۔
"پھر بھی آپ نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا، کیوں؟"
"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"
"گھر۔" صارم نے جواب دیا تو اس نے اطمینان سے کہا۔
"تو گھر پہنچ کر معلوم ہو ہی جائے گا کہ مجھے اس طرح سے کیوں بلایا ہے۔"
"یعنی آپ کو جاننے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔" صارم نے حیرت سے اسے بیک مرر میں دیکھا۔
"جی نہیں، جہاں اتنے گھنٹے انتظار کیا ہے وہاں چند منٹ اور سہی۔" وہ اسی اطمینان سے بولی تو وہ سلگ کر رہ گیا۔
"پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو۔" صارم نے سوچا اور گاڑی "حیدر ولاج" کے گیٹ کے قریب روکتے ہوئے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا۔ گیٹ کھلتے ہی وہ گاڑی اندر لے گیا۔ سارہ گاڑی رکتے ہی گاڑی سے اتر گئی اور ڈگی سے اپنا سوٹ کیس بھی نکال لیا۔
"اپیا آگئیں، رانی اپیا آگئیں۔" رامش نے اسے دیکھتے ہی شور مچا دیا۔
"السلام علیکم اپیا!" وہ دونوں خوشی سے دوڑتے ہوئے ان کے پاس آگئے۔
"وعلیکم السلام! ٹھیک ہو تم دونوں؟" سارہ نے دونوں کو ایک ساتھ اپنے گلے سے لگا کر پیار سے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک آپ کیسی ہیں؟" دونوں نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"جیسی تھی ویسی ہی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
"یعنی ایور گرین ہو۔" تایا معیز حیدر کی بیٹی انیلا نے لان میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔
"السلام علیکم آپی!" سارہ، دانش اور رامش سے علیحدہ ہو کر انیلا کی طرف بڑھ گئی۔
"وعلیکم السلام! بھئی تم تو مہمان خصوصی ہو۔ بڑا انتظار تھا تمہاری آمد کا۔" انیلا نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔
"اچھا دادا ابا کیسے ہیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"ٹھیک نہیں ہیں، ان ہی کی خواہش پر تمہیں بلایا گیا ہے۔" انیلا نے بتایا۔
"ہاں ان کی آخری خواہش پوری کرنے کی غرض سے۔" راحیلہ بھی وہیں چلی آئی اور مسکراتے ہوئے بولی ساتھ ہی سارہ سے بغل گیر بھی ہو گئی۔ صارم گاڑی کے پاس کھڑا یہ ساری کارروائی بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سارہ سب سے خوش اخلاقی اور محبت سے ملی تھی لیکن بہت ریزرو، کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی لگتی تھی۔ اس نے تو اس کی کبھی ہنسی ہی نہیں سنی تھی اسی لیے وہ الجھن کا شکار تھا۔
"اللہ نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ اللہ دادا ابا کو سلامت رکھے۔" سارہ نے اس کی بات پر برا مان کر کہا۔
"تم تو ہمیشہ فضول ہی بولا کرو۔" انیلا جو راحیلہ سے بڑی تھی، نے اسے ڈانٹا۔
"میں ذرا دادا ابا کو دیکھ لوں۔" سارہ نے کہا۔
"ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ڈاکٹر دیکھ کر گیا ہے۔" راحیلہ نے بتایا۔
"تو؟" سارہ نے اس بات کی وضاحت چاہی۔
"تو تم دیکھ کر کیا کرو گی ڈاکٹر نے دوا کھلا دی ہے۔" راحیلہ نے طنز سے کہا یا شاید سارہ کو ہی محسوس ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں سارہ عزیز اپنے دادا ابا سے ملنے، انہیں دیکھنے جا رہی ہوں۔ اپنے پیشنٹ کو دیکھنے نہیں جا رہی۔"
"لیکن وہ تو سو رہے ہیں۔" راحیلہ نے ہنس کر کہا۔
"تو میرے دیکھنے سے کیا جاگ جائیں گے؟" سارہ نے کہا تو ان سب کو ہنسی آگئی جب کہ راحیلہ خجل سی ہو گئی۔ صارم کو راحیلہ کی بے وقوفی اور بے تکے جملوں پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔
"سارہ چھوڑو اسے تو فضول بولنے کی عادت ہے۔ اندر جاؤ سب سے ملو اور آرام کرو۔" انیلا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ "جی بہتر" کہہ کر اندر چلی گئی۔ صارم بھی ان سب کے ساتھ اندر چلا آیا۔
"سارہ بیٹا آگئیں تم۔" امینہ بیگم نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"جی نہیں۔" اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔
"ہیں۔" وہ حیران ہوئیں تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔
"ممی آگئیں ہوں تبھی تو آپ کے روبرو ہوں۔ اسلام علیکم کیسی ہیں آپ؟"
"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور تم کیسی ہو؟" امینہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم کر محبت سے پوچھا۔
"میں بہت اچھی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ تو تم ہو۔“ امینہ بیگم نے اس کے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ڈیڈی کہاں ہیں؟“

”وہ باہر کسی کام سے گئے ہیں آتے ہی ہوں گے تم تب تک آرام کرلو۔ انیلا اور ثانیہ تمہارے ہاتھوں پر مہندی لگا دیں گی پھر سو جانا۔ شام تک مہندی کا رنگ بھی چڑھ جائے گا۔“ امینہ بیگم اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے کمرے میں لاتے ہوئے بولیں۔

”مہندی......وہ کس لیے؟“ سارہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی تھی۔

”دلہن کے لیے مہندی کیوں ضروری ہوتی ہے؟“ امینہ بیگم نے اسے شانوں سے پکڑ کر بیڈ کے کنارے پر بٹھاتے ہوئے کہا تو وہ حیران پریشان سی ہو کر انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”بیٹا! تمہارے دادا ابا کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ ڈاکٹرز ناامید ہو چکے ہیں۔ ان کی یعنی تمہارے دادا ابا کی خواہش ہے کہ تمہاری اور صارم کی شادی کردی جائے۔“

”کیا؟“ وہ یوں اچھل کر کھڑی ہوئی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

”ہاں بیٹا! اور آج شام عصر کے بعد تمہارا اور صارم کا نکاح ہے۔ کھانے کے بعد رخصتی بھی ہے۔“

”نکاح......رخصتی......یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ اس پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ان لوگوں نے اسے دھوکے سے بلایا تھا۔

”سارہ بیٹا! یہ تمہارے دادا ابا کی آخری خواہش ہے اور ہم سب بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔ تمہارے دادا ابا اپنے بیٹے اور بیٹی کے درمیان مستقبل میں بھی مضبوط رشتے داری چاہتے ہیں تاکہ یہ خاندان آپس میں جڑا رہے اسی لیے اتنی جلدی یہ سب ہو رہا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں تمہیں اور صارم کو ایک رشتے میں جڑے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ تندرست ہوتے تو ہم آرام سے یہ شادی کرتے۔ ان کی بیماری کی وجہ سے سب کچھ جلدی میں کرنا پڑ رہا ہے۔ ساری تیاری مکمل ہے۔ تمہارے کپڑے اور زیورات میں نے بنوا لیے تھے۔ کچھ بنے بنائے خریدے ہیں۔ بعد میں تم اپنی پسند سے بنوا لینا کپڑے زیور ابھی تو میں نے ہی اپنی اور تمہاری پھپھو کی پسند سے شاپنگ کی ہے۔“ امینہ بیگم نے نرم اور سنجیدہ لہجے میں بتایا تو وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

وہ کتنی آسانی سے یہ سب بتا رہی تھیں جیسے یہ اس کی شادی کا نہیں کسی اور کی شادی میں شرکت کا معاملہ ہو۔

”اس بار بھی میری مرضی اور خواہش ضروری نہیں سمجھی گئی۔ میں تو کٹھ پتلی ہوں نا جس کا جب دل چاہا جیسے چاہا نچا لیا۔ میری زندگی کے اتنے بڑے اور اہم فیصلے پر بھی مجھے نظر انداز کر دیا گیا۔ میری رائے لینا تک گوارا نہ کی۔ میں یوں ہی ان سب کی خواہشات پر قربان ہوتی رہوں گی۔ میری خاموشی میں چھپا احتجاج، دکھ اور انکار بھی کسی کو سنائی نہیں دیتا۔ اور کیا رہ گیا ہے سارہ عزیز یہ ایک فیصلہ ہی تو باقی بچا تھا یہ بھی تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ زندگی تمہاری ہے اور عمل داری کسی اور کی ایسے تو کوئی غیر بھی نہیں کرتا جیسے یہ میرے اپنے میرے ساتھ کر رہے ہیں۔ ہونہہ شادی چلو پھر سے سر جھکا دو سارہ عزیز پھر سے اپنا آپ سمیٹنے کی تیاری کرلو۔“ سارہ نے دل میں کہا۔

امینہ بیگم تو اسے ساری بات بتا کر سمجھا کر کب کی جا چکی تھیں۔ اس نے رونا چاہا مگر آنسوؤں نے اندر ہی رستہ بنا لیا تھا باہر انہیں سمیٹنے والا جو کوئی نہیں تھا۔ اس نے چیخنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں دب کر رہ گئی اور اس نے کسی

معمول کی طرح بت کی مانند بڑوں کی یہ خواہش بھی صارم کے نام کی مہندی کی صورت اپنی گلابی ہتھیلیوں پر سجا لی۔ مہندی کا رنگ خوب گہرا سرخ چڑھا تھا جسے دیکھ کر مجروح سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

نماز عصر کے بعد صارم اور سارہ کا نکاح پڑھایا گیا۔ دادا ابا نے دونوں کو اپنے سینے سے لگا کر انہیں اچھے، خوش حال، خوشگوار مستقبل اور کامیاب ازدواجی زندگی کی دعائیں دیں۔ سارہ کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹے اور چپکے سے دامن میں جذب ہو گئے۔ گولڈن رنگ کے عروسی جوڑے میں گولڈ کے زیورات پہنے بنی سنوری سارہ خود بھی گولڈن ڈول لگ رہی تھی۔ سونے کی گڑیا، صارم نے اسے اس روپ میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہر وقت سیادہ رہنے والی سارہ دلہن بن کر کیسی قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کے سنہرے روپ میں ایسی کشش اور جاذبیت تھی کہ دل خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ اس کے نام سے منسوب سارے کومل، نرمل سندر جذبے آپ ہی آپ سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے تھے۔

سعدیہ پھپھو کا گھر ساتھ ہی تھا۔ دونوں گھروں کے لان میں دروازہ بھی تھا جو تقریباً ہر وقت کھلا رہتا تھا لیکن رخصتی کے لیے باہر جانے والا مین گیٹ کھولا گیا۔ سعدیہ پھپھو نے سارہ کا بہت محبت سے استقبال کیا۔ ساری رسمیں ادا ہوئیں۔ تصویریں کھینچیں گئیں۔ اس کے برابر میں بیٹھا صارم سفید شرٹ، سیاہ پینٹ کوٹ اور ریڈ ٹائی میں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ ہنستے کھیلتے رسمیں تمام ہوئیں تو سارہ کو صارم کے کمرے میں پہنچا دیا گیا جو بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ سعدیہ پھپھو تو ہمیشہ سے سارہ کو چاہتی تھیں، ان کی محبت پر تو اسے یقین تھا مگر صارم سے وہ کچھ بے تکلف نہیں ہو سکی تھی۔ ہر بار کوئی نہ کوئی دل جلانے والی بات ہو جاتی تھی دونوں کے بیچ۔

اب وہ ایک دم سے اس کی زندگی کا مالک بنا دیا گیا تھا۔ وہ بہت پریشان اور بے چین ہو رہی تھی۔

تمہارے ہاتھ کی لکیریں بتاتی ہیں کہ تمہارا شوہر تمہیں ٹوٹ کر چاہے گا۔“ ماریہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ یہ بات اس نے اس کا ہاتھ دیکھنے کے بعد اپنے علم دست شناسی کے مطابق کہی تھی۔

اور کسی نے نہ چاہا تو شوہر کیوں چاہے گا۔ تم بھی لکیروں پر یقین کرتی ہو۔“ سارہ نے ہنس کر کہا تھا۔

”نہیں، مجھے تمہاری قسمت پر بھی یقین ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہاری صورت حسین بنائی ہے اسی طرح تمہاری قسمت بھی حسین بنائی ہوگی۔ یار! تجھے دیکھ کر تو بندہ ویسے ہی عاشق ہو جائے چاہے شوہر بنے نہ بنے۔ تمہارا عاشق تو ضرور بن جائے دیکھنے والا۔“ ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور وہ ہنس پڑی تھی۔

گھنٹہ تو گزر رہی گیا تھا اسے صارم کی خواب گاہ میں بیٹھے بیٹھے مگر ابھی تک اس نے کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ اور وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ صارم اس سے کیا کہے گا۔ کیسا سلوک کرے گا؟ کیا اس نے بھی اسے دل سے قبول کیا ہوگا یا دادا ابا کے فیصلے کو ماننے پر مجبور ہو گیا ہوگا اور کیا وہ اس سے اس کی بے اعتنائی کا گزشتہ زندگی کے اجنبی رویوں کا بدلہ تو نہیں لے گا؟ اور یہ کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں کمرے میں جب کہ شادی کی اس تقریب میں بہت قریبی اور کم رشتے دار شریک ہوئے تھے سب کو ٹیلی فون کر کے مدعو کیا گیا تھا۔ یہ تقریب چھوٹی مگر پروقار تھی۔ مہمانوں کا رش بھی نہیں تھا کہ وہ ان میں پھنسا رہتا۔

”بھابھی!“ ثانیہ گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ سارہ نے ہراساں ہو کر اسے دیکھا۔

”کیا ہوا ثانیہ؟“ سارہ نے اس کی گھبرائی ہوئی شکل دیکھ کر خود ہی پوچھ لیا۔

”وہ نانا ابا کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ سب لوگ ادھر ہی ہیں۔“

”میں بھی چلوں۔“ سارہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”جی میں آپ کو لینے ہی آئی تھی۔ شاید نانا ابا ہمیں چھوڑ کر...... جانے والے ہیں۔“ ثانیہ کہتے کہتے رو پڑی۔ سارہ کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ مسہری سے نیچے اتر آئی۔

”روؤ نہیں ثانیہ! دعا کرو۔ ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ چلو ان کے پاس لے چلو مجھے۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو وہ اسے اپنے ساتھ لان کے دروازے سے ”حیدر ولاج“ لے آئی۔ وہ دونوں دادا ابا کے کمرے کی طرف دوڑیں۔ سارہ سے اپنا لہنگا اور بھاری کام والا دوپٹا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ دادا ابا کے کمرے کے دروازے پر پہنچیں تو سعدیہ پھپھو کی بھیگتی آواز ان دونوں کے کانوں میں پڑی وہ صارم سے کہہ رہی تھیں۔

”صارم بیٹا! سارہ کو بلا کر لاؤ۔ وہ ابا جی کا چیک اپ کرے۔ اس کے دیکھنے سے شاید ابا جی کو چند سانسیں اور مل جائیں۔“

”امی میں بھابھی کو لے آئی ہوں۔“ ثانیہ، سارہ کا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی تو سب کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ صارم نے دیکھا، وہ بہت پریشان اور خوف زدہ لگ رہی تھی اور اس روپ میں وہ اس کے دل میں اترتی چلی گئی۔ حسن اور حزن و ملال سے مزین چہرہ دل میں نقش ہو گیا تھا۔

”سارہ آؤ بیٹا! ذرا دیکھنا اپنے دادا ابا کو۔“ سعدیہ پھپھو نے سارہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے دادا ابا کے بستر کے قریب لاتے ہوئے کہا تو وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور دادا ابا کی نبض دیکھنے لگی اور صارم اسے دیکھے گیا۔ جو مرحلہ بہت مشکل محسوس ہو رہا تھا وہ ایک پل میں طے ہو گیا تھا۔ دل نے اسے دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔

”رامی! میرا میڈیکل باکس لاؤ جلدی سے۔“ سارہ نے رامش سے کہا۔ وہ دوڑا چلا گیا اور چند لمحوں بعد اس کا میڈیکل باکس لیے اس کے سامنے حاضر ہو گیا۔ اس نے دادا ابا کے دل کی دھڑکن چیک کی۔ بلڈ پریشر نوٹ کیا۔ گھر میں ان کی خاطر مکمل میڈیکل کیئر کی سہولتیں موجود تھیں۔ سارہ نے آکسیجن ماسک ان کے منہ پر لگا دیا۔ ان کی ہارٹ بیپ جب تک نارمل نہیں ہو گئی تب تک وہ ان کے پاس بیٹھی اسٹیتھسکوپ سے ان کی دھڑکن سنتی رہی۔ وہ اندر ہی اندر دادا ابا کی زندگی سے مایوس ہو رہی تھی مگر ڈاکٹر تھی سو امید کے ساتھ کوشش جاری رکھنا اس کا فرض تھا۔

”ڈاکٹر ہمدانی بھی اس وقت آپریشن تھیٹر میں مصروف ہیں نجانے کب فارغ ہوں اور کب گھر آئیں۔“ عزیز حیدر نے پریشانی سے کہا۔

”بھئی ہماری ڈاکٹر بیٹی موجود ہے۔ یہ کیا کسی ماہر ڈاکٹر سے کم ہے، دیکھو ابا جی کی سانس نارمل ہو گئی ہے اور وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ مسکرا بھی رہے ہیں۔“ معیز حیدر نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ سب کی نظریں دادا ابا کی طرف اٹھیں۔

”شکر ہے خدا کا۔“ سب نے ایک ساتھ کہا۔

”دادا ابا! یہ تو چیٹنگ ہے۔ مجھے رخصت کر کے خود بھی رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگے، ویری بیڈ۔“ آدھے گھنٹے بعد جب اس نے آکسیجن ماسک ان کے منہ سے ہٹایا تو ان کا ہاتھ تھام کر مصنوعی خفگی سے بولی۔ وہ مسکراتے ہوئے بہت مدہم آواز میں بولے۔

”ارے بیٹا! وہ...... تمہاری دا...... دی ہے نا...... وہ کب سے...... بڑی بے...... چینی سے میرا انتظار کر...... رہی ہے۔“

”تو کرنے دیں انہیں انتظار، ان کے پاس جانے کے شوق میں...... آپ نے میری شادی تو کر دی نا خراب۔“

سارہ نے انہیں ریلیکس کرنے کی غرض سے مذاق سے کہا تو سب کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ صارم تو سراپا آنکھ بنا اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے دل میں گدگداہٹ سی ہونے لگی۔ لطیف جذبے مسکرانے لگے تھے۔

”تمہاری شادی...... کبھی خراب نہیں...... ہوگی سارہ بیٹا۔“ دادا ابا نے اسے دیکھتے ہوئے معنی خیز بات کہی تو اس نے بے اختیار ہی نگاہ اٹھا کر سامنے کھڑے صارم کو دیکھا تھا وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر مسکرا دیا جیسے دادا ابا کی بات کی تصدیق کر رہا ہو۔ سارہ نے نظریں جھکا لیں۔ دل نے ایک دھڑکن مس کی تھی اس پل۔

”ابا جی! آپ جلدی سے تندرست ہو جائیں۔ صارم اور سارہ کا ولیمہ بھی تو کرنا ہے اور ولیمہ میں پوری شان سے کروں گا۔“ سعدیہ پھپھو کے شوہر حفیظ اللہ نے کہا۔

”ضرور...... کرنا۔“ دادا ابا نے مسکرا کر مدہم آواز میں کہا۔ ان کے چہرے پر تھکن، نقاہت اور شکستگی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک ہی انجائنا کی تکلیف ہوئی تھی انہیں پھر ساتھ ہی شوگر کا انکشاف بھی ہو گیا تھا۔ تین چار مہینے میں وہ بستر سے جا لگے تھے اور اب موت کی دہلیز پر پاؤں دھرے کھڑے تھے۔ کسی بھی وقت دہلیز پار کرنے کا اشارہ مل سکتا تھا۔ یہ وہ خود بھی جانتے تھے۔

”آپ لوگ جا کر آرام کریں۔ میں ہوں دادا ابا کے پاس۔“ سارہ نے ان سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھی یہیں ہوں۔“ صارم نے بھی فوراً کہا۔

”دادا ابا کے پاس یا اپنی دلہن کے پاس۔“ عاصم بھائی نے شرارت سے اس کے کان میں سرگوشی کی جو اتنی بلند تھی کہ سارہ کے کانوں نے بھی سنی تھی اور وہ حیا سے سرخ پڑ گئی تھی۔ اس کی پوزیشن بہت آکورڈ ہو رہی تھی اس وقت ان سب کی موجودگی میں۔

”بھائی آپ بھی ناں۔“ صارم شرما سا گیا۔ مسکراتے ہوئے کہا تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔ دادا ابا کی کنڈیشن کی وجہ سے کھل کر ہنس نہیں سکتے تھے۔

”سارہ بیٹا! تم تھک گئی ہوگی اپنے کمرے میں جا کر آرام کر لو ہم ہیں یہاں پر۔“ معیز حیدر نے کہا۔

”نہیں تایا جان! میں ٹھیک ہوں۔ آپ لوگ آرام کریں اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو بلا لوں گی۔ ویسے بھی مریض کے پاس ڈاکٹر کا ہونا ضروری ہے۔“ سارہ نے مہذب لہجے میں کہا۔

”سا...... رہ ٹھیک کہہ...... رہی ہے...... تم لوگ...... جا کر آرام کرو۔“ دادا ابا نے کہا۔ ان کا یوں اٹک اٹک کر بولنا بھی غنیمت لگ رہا تھا سارہ کو۔

”ٹھیک ہے ابا جی آپ آرام کریں۔“ معیز حیدر نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں گویا اثبات میں جواب دیا۔ ایک ایک کر کے وہ سب کمرے سے چلے گئے۔ صارم وہیں کھڑا رہا تو رامش نے واپس آ کر پوچھا۔

”اپیا تو ڈاکٹر ہیں اس لیے دادا ابا کے پاس رکی ہیں آپ کس لیے رکے ہیں۔“ اس کے انداز میں شرارت تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا۔

”میں بھی تو مریض ہوں تمہاری ڈاکٹر اپیا کا، میں اپنے لیے رکا ہوں۔“ صارم نے سارہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ایک نظر اسے دیکھ کر ٹپٹا کر دادا ابا کے پاس ان کے بیڈ کے قریب کرسی رکھ کر بیٹھ گئی۔ جب کہ رامش ہنستا ہوا صارم سے کہہ رہا تھا۔

”لاکھوں میں ایک ہیں میری اپیا۔“

"تو بھیا میں نے کب انکار کیا ہے؟" صارم نے بدستور سارہ کے جھکے ہوئے حیا سے تپ کر کندن ہوتے سندر چہرے کو تکتے ہوئے کہا تو رامش خوش ہوگیا۔

"بس پھر پیار سے رکھیے گا میری اپیا کو۔"

"آپ لوگ باہر جائیں پلیز۔" سارہ نے ان کی باتوں سے نروس ہو کر کہا۔

"آپ نے دادا ابا سے خزانے کا پتا پوچھنا ہے؟" صارم نے بے ساختہ کہا تو وہ بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کو اس سے چھپانے کے لیے رخ پھیر کر دادا ابا کی دوائیں دیکھنے لگی۔ صارم اس کی مسکراہٹ دیکھ چکا تھا اور دل جھوم اٹھا تھا اس کا۔

"چلیں صارم بھائی ہم کچھ دیر سو لیتے ہیں۔" رامش نے ہنس کر اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

"یار اب نیند کسے آئے گی؟" صارم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ سارہ کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔

"یہ اکڑو بندہ اتنی معنی خیز باتیں کیوں کر رہا ہے؟" اس نے دل میں سوچا۔

"نیند کی گولیاں لے لیجیے گا اپیا سے۔" رامش نے فوراً مشورہ دیا۔

"نیند بھی انہوں نے ہی اڑائی ہے بھلا یہ کیوں نیند کی گولیاں دینے لگیں؟" صارم کی معنی خیز باتیں سارہ کے حواس گم کر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں پسینہ اتر آیا۔ دادا ابا آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ اسے صارم پر غصہ آ رہا تھا جو ان دونوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر جملے پر جملہ اگل رہا تھا۔

"اچھا چلیں ناں۔" رامش اسے زبردستی کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا تو سارہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"دادا ابا! سو گئے کیا؟" سارہ نے دادا ابا کے سر پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے پوچھا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا جو دلہن بنی سہمی ہوئی سی معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی۔

"دادا ابا! کوئی بے ایمانی نہیں چلے گی ہاں، میں نے آپ کی بات مان کر شادی کی ہے نا تو اب آپ کو میری بات مان کر صحت مند ہو کر بہت سارا جینا ہے۔"

"پگلی...... جینے مرنے پر...... اپنا اختیار...... تھوڑی چلتا ہے...... اور سن صارم...... تجھے بہت خوش رکھے گا...... محبت سے رکھے...... گا کبھی غصہ کرے...... بھی نا تو پیار...... سے سمجھا لیا کرنا...... پیار سے بڑی کوئی طاقت...... نہیں ہوتی...... غیروں کو اپنا بنا دیتا ہے پیار۔" دادا ابا نے مسکرا کر نرم لہجے اور کمزور لہجے میں اٹک اٹک کر کہا۔ اسے مستقبل کے لیے ابھی سے سمجھا کر اپنا فرض ادا کر رہے تھے وہ۔

"اور اگر اپنوں سے ہی پیار نہ ملے تو...... اپنوں کو غیر بھی تو بنا دیتا ہے نا دادا ابا!" سارہ نے گہرے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں...... میں...... جانتا ہوں سارہ بیٹی...... کہ تمہارے اس خیال کے پیچھے کونسا محرک...... کار فرما ہے لیکن جو لوگ خود...... پیار کی مٹی سے گندھے ہوں...... انہیں پیار مانگنا نہیں...... پیار بانٹنا اچھا لگتا ہے...... تمہارا پیار بھرا رویہ سب کو تمہارا بنا دے گا۔" وہ اسی تھکے تھکے ٹوٹتے، لرزتے لہجے میں بولے۔

"دادا ابا! میں نے نفرت تو نہیں کی کسی سے۔ مجھے نفرت کرنا آتی ہی نہیں ہے، مگر مجھے لگتا ہے جیسے میں قابل نفرت ہوں جبھی تو۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

"خاموش کیوں ہوگئیں...... کہو نا۔" دادا ابا نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں دادا ابا! اب کہنے، سننے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اب تو میں ویسے ہی پرائی ہوگئی ہوں۔ اب باقی بچا ہی کیا

ہے۔ آپ سو جائیں، زیادہ باتیں کرنے سے آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" سارہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"سارہ!"

"جی دادا ابا!"

"بیٹا خود کو...... سنبھالے رکھنا۔" انہوں نے پرنم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں دادا ابا! میں "حیدر علی" کی پوتی ہوں، بھلا ان چھوٹی موٹی باتوں سے گھبرا سکتی ہوں؟ ہرگز نہیں، اب تو میں اپنے پیروں پر کھڑی ہونے والی ہوں۔ آپ دیکھیے گا کتنی کامیاب ڈاکٹر بنوں گی میں۔"

"ان شاء اللہ!" دادا ابا نے پرنم لہجے میں دل سے کہا تو اس نے ان کی بھیگتی آنکھیں صاف کر دیں۔ تھوڑی دیر میں وہ سو گئے تو وہ بھی اٹھ کر صوفے پر لیٹ گئی۔ وقفے وقفے سے وہ اٹھ اٹھ کر انہیں چیک کرتی رہی۔ فجر کی اذان ہوئی تو دادا ابا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے انہیں پانی پلایا ان کا معائنہ کیا۔ ملازمہ آئی تو اسے ان کے لیے دلیہ بنا کر لانے کو کہا۔ خود اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ بار بار نیند سے سر جھٹکے کھا رہا تھا۔ اس پر یہ بھاری بھر کم لباس، زیورات اور گرمی کا موسم۔ وہ بری طرح تھک چکی تھی۔ اب تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس بھاری بھر کم لباس اور جیولری سے نجات حاصل کرے اور نہا کر ہلکے پھلکے کپڑے پہنے اور سو جائے۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سعدیہ پھپھو دادا ابا کے کمرے میں آئیں تو سارہ کو دادا ابا کی دوائیں سیٹ کرتے دیکھا۔

"سارہ!" سعدیہ پھپھو نے آہستہ سے اسے پکارا۔

"السلام علیکم پھپھو۔" سارہ نے انہیں دیکھ کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام جیتی رہو، سدا سہاگن رہو، خوش رہو۔" پھپھو نے اسے پیار کرتے ہوئے دل سے دعائیں دیں۔ وہ شرمیلے پن سے مسکرا دی۔

"ابا جی کی طبیعت کیسی ہے اب؟"

"ٹھیک ہے، میں نے دلیہ بنوایا ہے وہ کھلا کر انہیں یہ دوا کھلانی ہے۔" اس نے دوا کی شیشی کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"بیٹا سارہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم کل کی تھکی ہوئی سفر سے آئی تھیں، پھر شادی پھر ابا جی کی بیماری میں رات بھر جاگتی رہی ہو۔ جاؤ میری جان اب تم اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔ ابا جی کو میں ناشتہ بھی کرا دوں گی اور دوا بھی کھلا دوں گی اور ویسے بھی ڈاکٹر ہمدانی بھی کچھ دیر تک آ جائیں گے اور ہم سب ادھر ہیں۔ اب جاؤ چندا! تم چینج کر کے سو جاؤ اور ہاں ناشتہ بھی کر لینا۔" سعدیہ پھپھو نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے کہا۔

"جی پھپھو۔" اس نے ایک نظر دادا ابا پر ڈالی۔ انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا اور جواباً ان کی شفقت بھری مسکراہٹ دیکھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

باہر ابھی اندھیرا تھا۔ پورے چاند کی چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ باد نسیم کے جھونکے اس سے آ کر گلے ملنے لگے۔ اس نے منہ کھول کر گہرا سانس فضا میں خارج کیا اور تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھر لی۔ اس کا دل چاہا کہ چاند کی اس چاندنی میں ہی اپنا بستر لگا لے اور ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ہوا کے آنچل میں میٹھی نیند سو جائے۔ اس نے کلائی پر بندھی گولڈ واچ پر ٹائم دیکھا۔ صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ حیدر لاج کے کچھ مکین سو رہے

تھے اور کچھ جاگ رہے تھے۔ وہ راہداری میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے چاند کو تکتی جا رہی تھی کہ اس کا لہنگا ہائی ہیل والی جوتی میں الجھ گیا۔ پاؤں مڑا اور وہ ستون سے جا لگی بمشکل ستون کا سہارا لے کر سنبھلی، دوپٹا اور لہنگا سنبھالا پھر سے قدم بڑھائے تو جوتی نے دغا دے دی وہ گرتے گرتے بچی تھی۔

"سنبھل کر میری جان!" صارم کی بانہوں نے اسے سنبھالا تھا اور اس کی سرگوشی اس کے کان کے قریب ابھری تو اس نے حواس باختہ ہو کر اس کا چہرہ دیکھا جو چاندنی رات میں بھی دہک رہا تھا۔ صارم کا یہ انداز اس کے لیے حیرت کا باعث تھا۔

"چوٹ تو نہیں لگی؟" صارم نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے دبی دبی آواز میں جواب دیا۔

"لگنی بھی نہیں چاہیے۔" صارم نے ذومعنی بات کہی۔

"جی۔" سارہ نے سٹپٹا کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں سرخی، نیند اور حیرانی بسی تھی۔ شب بھر کی جاگتی دلہن وہ بھی بن پیا کے کیسی ہراساں دکھائی دے رہی تھی۔ صارم کو لگا جیسے جنت سے کوئی حور راستہ بھٹکتی ہوئی ادھر آنکلی ہے۔ وہ اپنا دوپٹا سنبھالنے میں مگن پریشان اور بوکھلائی ہوئی اس کی بانہوں کے حصار میں تھی۔ صارم چند لمحوں تک تو اسے بے خودی کے عالم میں دیکھے گیا پھر جوں ہی اسے اپنے اور اس کے رشتے کی گہرائی اور مضبوطی کا احساس ہوا تو دل کے جذبے خود بخود بے لگام ہو گئے اور چاندنی رات کے فسوں کو اور فسوں خیز بنا گئے۔ اس نے سارہ کے چہرے پر اپنے اظہار و پیار کے چاند ستارے سجا دیے۔ وہ اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھی، بری طرح سٹپٹا کر پیچھے ہٹی مگر اس کے بازوؤں کے حلقے سے نہ نکل سکی۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ صارم کو اس پر اور بھی پیار آ رہا تھا۔

"یہ...... آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے ہکلاتے ہوئے ہراساں نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"پیار کر رہے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟" وہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ صارم اپنی دلہن سے کتنا پیار کرتا ہے۔" اس نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر شوخ لہجے میں کہا۔ سارہ کا سادا چہرہ لہو رنگ ہو کر دمک رہا تھا۔ اس کا الوہی حسن صارم کو اپنی گرفت میں جکڑ چکا تھا۔

"آپ مجھے...... جانے دیں پلیز۔" اس نے روہانسی ہو کر کہا۔

"رات بھر تمہارے اس روپ نے مجھے بے چین کیے رکھا ہے، جگائے رکھا ہے۔ اب ملی ہو تو جانے کی بات کر رہی ہو۔" صارم نے اسے وارفتگی سے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے اس پر بے اختیار پیار آیا اور اس نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"چلو میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آتا ہوں ورنہ پھر سے گرنے کا خطرہ رہے گا۔"

"میں چلی جاؤں گی۔" اس نے حیا سے گھبراتے ہوئے دبی دبی آواز میں کہا۔

"میرے بغیر تو تم اب کہیں نہیں جاؤ گی۔" صارم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے گھنیری پلکوں کی جھالر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت دلنشین انداز میں مسکرا رہا تھا۔ کہیں نہیں جاؤ گی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی وہ۔

"پلیز۔" اس نے اس کے قرب سے اس جگہ سے گھبرا کر بے بسی سے کہا۔

"اوکے، فی الحال آپ کی درخواست قبول کی جاتی ہے۔ آپ جائیں آرام کریں۔ چلیں میں آپ کو سیڑھیوں تک چھوڑ آؤں۔" صارم نے مسکرا کر اس کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے کہا اور اسے راہداری کی سیڑھیوں سے نیچے

چھوڑ کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ سارہ نے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے لہنگا اور دوپٹا سنبھالا اور اپنے کمرے کی جانب تقریباً بھاگتی ہوئی گئی تو صارم اس کی اس حرکت پر بے اختیار ہنس دیا۔

"ہاؤ کیوٹ۔" وہ بے اختیار بولا تھا۔

"یہ وہی صارم ہے جو مجھے نک چڑھی، مغرور کہتا تھا اور مجھ سے دور دور رہتا تھا۔ کیا نکاح کے تین بول اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ بندہ اس طرح بے لگام اور بے باک ہو کر اپنے جذبوں کا برملا اظہار کر جاتا ہے۔ اف اگر کوئی دیکھ لیتا تو، تو یہ کتنی فضول حرکت کی ہے صارم نے۔" سارہ اپنے کمرے میں آ کر گھبراہٹ کے مارے کانپتی ہوئی خود کلامی کر رہی تھی۔ اس کے وجود میں صارم کے لمس نے آگ سی بھر دی تھی۔ جس میں وہ بری طرح دہک رہی تھی۔ دل کا پنچھی سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر آنے کے لیے مچل رہا تھا۔ یہ فضول حرکت نہیں تھی، صارم کی محبت کا پہلا تحفہ تھا سارہ۔" اس کے دل سے آواز آئی۔

"نہیں چاہیے مجھے ایسا تحفہ۔" اس نے سلگ کر کہا۔ "یہ زبردستی کا رشتہ جوڑ کر وہ کیا سمجھتے ہیں کہ میں نے انہیں، اس رشتے کو دل سے قبول کر لیا ہے۔"

"تمہارے دل کو صارم برا بھی تو نہیں لگا ورنہ اس بار بھی تم اس سے کوئی تلخ بات ضرور کہتیں۔ اس پر غصہ ضرور کرتیں۔" اس کے دماغ نے جواز تراشا۔

"یہ سب غیر متوقع تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ صارم اس طرح بھی ری ایکٹ کر سکتا ہے۔" اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ "لڑکی کو خاموش اور بے بس دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ لڑکی نے دل ہار دیا ہے ان پر، ہونہہ۔" سارہ نے خود کو صارم کے متعلق سوچنے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور زیورات اتار کر رکھ دیے، غسل کر کے ہلکا پھلکا سا جارجٹ کا سوٹ زیب تن کیا تب تک فجر کی نماز کا وقت نکل چکا تھا۔ وہ افسوس کرتی بستر پر لیٹ گئی اور جلد ہی نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ اسے دوپہر تک کسی نے نہیں جگایا تھا۔ وہ حیدر لاج میں ہی اپنے بیڈروم میں ہی سوئی تھی۔

☆......☆

جب اس کی آنکھ کھلی دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد کمرے سے باہر آئی تو سب دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

"سارہ، اٹھ گئیں بیٹا! آؤ کھانا کھا لو۔ تم نے تو رات سے کچھ نہیں کھایا۔" سعدیہ پھپھو بھی وہیں موجود تھیں اسے دیکھ کر محبت سے بولیں۔

اسے بھی بہت بھوک لگ رہی تھی لہٰذا انکار کی حماقت نہیں کی اور سب کو سلام کر کے کرسی کھسکا کر کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دادا ابا کے کمرے میں آ گئی۔ ایک ملازم ان کے پاس موجود تھا۔ سارہ نے اسے باہر بھیج دیا اور خود دادا ابا کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بیڈ کی پشت سے تکیہ لگائے نیم دراز تھے۔ ان کے چہرے پر موجود جھریاں ماہ و سال کی داستان بیان کر رہی تھیں۔ وہ ان کے سفید الجھے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ دادا ابا کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت اور شفقت بھری تھی۔

"دادا ابا! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"ٹھیک ہے...... تمہارے آنے سے...... میری سانسیں کچھ اور...... بڑھ گئی ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر مدھم اور تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔

"یعنی میں زندگی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" دادا ابا کی جگہ صارم نے جواب دیا تو اس نے ہڑبڑا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر تیار ہو کر آیا تھا۔ سفید کرتے شلوار میں بہت جچ رہا تھا۔

"میں نے ٹھیک کہا نانا ابا! یہ زندگی ہیں ہماری۔" صارم چلتا ہوا ان کے پاس آبیٹھا اور سارہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنے نانا ابا سے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

"ہاں، ہاں ٹھیک کہا تم نے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ صارم کی سارہ کے لیے محبت دیکھ کر ان کو دلی مسرت ہو رہی تھی۔

"دادا ابا! میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔" سارہ صارم کی آمد سے سٹپٹا گئی تھی۔ اس پر اس کے معنی خیز جملے اور مسکراہٹ اسے نروس کر رہی تھی۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی تو صارم اسکے جانے کا سبب جان کر شرارت سے بولا۔

"تھوڑی دیر بعد بھی میں یہیں ہوں گا۔"

"اچھا ہے، اس بہانے آپ دادا ابا کی خدمت تو کر لیں گے۔" سارہ نے سنجیدگی سے کہا اور فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔

"دیکھا نانا ابا! چوٹ کر گئی ہیں آپ کی ڈاکٹر سارہ۔" صارم نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا تو وہ دھیرے سے ہنس دیے اور پھر اسے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگے۔

"صارم...... بیٹا...... سارہ کی قدر کرنا، وہ بہت محبت والی بہت حساس دل کی مالک ہے۔ اسے کبھی دکھی نہ کرنا بیٹا!"

"اور اگر اس نے مجھے دکھی کیا تو۔" صارم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... وہ کسی کو دکھ دے ہی نہیں سکتی...... وہ تو سکھ اور پیار...... دینے والی لڑکی ہے...... تم اسے جتنا پیار دو...... گے وہ اس سے کہیں زیادہ پیار...... تمہیں دے گی۔" دادا ابا نے یقین سے پر لہجے میں کہا تو وہ خوش ہو کر مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں سارہ کی صورت سمائی ہوئی تھی۔

دن گزر گیا رات کو سارہ، صارم اور سعدیہ پھپھو دادا ابا کے کمرے میں موجود تھے۔ رات کے آخر پہر دادا ابا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ سعدیہ پھپھو ان کے سرہانے بیٹھ کر سورہ یسین اور درود پاک پڑھنے لگیں۔ سارہ انہیں آکسیجن ماسک لگا کر سانس دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ صارم سب گھر والوں کو بلانے کے لیے دوڑا۔ سب دادا ابا کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ سارہ نے بے بسی سے دادا ابا کے چہرے کو دیکھا۔ وہ بار بار آکسیجن ماسک منہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب کی آنکھوں سے آنسو اور ہونٹوں سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ دادا ابا اپنی نیم وا آنکھوں سے باری باری سب کو دیکھ رہے تھے۔ آخری میں ان کی نگاہ سارہ پر آکر ٹھہر گئی۔ انہوں نے آکسیجن ماسک بے چینی کے عالم میں اپنے چہرے سے ہٹا دیا۔

"دادا ابا! یہ بے ایمانی ہے، پلیز آپ نہیں جائیں گے۔" سارہ ان کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بھیگی آواز میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ وہ بہت ضبط کر رہی تھی۔

"جا...... نے دو سارہ...... میں تھک...... گیا ہوں بیٹا۔" دادا ابا نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا تو وہ ایک دم سے اپنا ضبط چھوڑ بیٹھی اور روتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے جائیں آپ بھی چلے جائیں۔ دادی ماں اور مما کے پاس جائیں اور مما سے کہیے گا کہ...... اپنی سارہ کو بھی اپنے پاس بلا لیں۔"

"سارہ۔" صارم نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ سعدیہ پھپھو نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"سارہ...... جیتی...... رہو خوش...... رہو۔" دادا ابا نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دعا دی۔

"دادا ابا!" وہ سعدیہ پھپھو سے الگ ہو کر ان کا ہاتھ تھام کر روتے ہوئے بولی تو انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور آخری ہچکی لی۔ ان کا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں کٹی شاخ کی مانند بے جان ہو گیا۔ سارہ نے ہاتھ بڑھا کر ان کی ادھ کھلی آنکھیں بند کر دیں۔ ان کا بے جان ہاتھ چوما اور ان کے پہلو میں رکھ کر ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بھیگی آواز میں بولی۔

"میرا پیغام مما تک پہنچا دیجیے گا دادا ابا۔"

"سارہ پاگل ہو گئی ہو تم۔" صارم نے اسے دیکھتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اس کی بات کی تڑپ اور دادا ابا کی موت کا غم دونوں شامل تھے۔ سب دادا ابا کے بیڈ کے گرد جمع تھے رو رہے تھے۔ سارہ نے جھک کر دادا ابا کا ماتھا چوما اور روتی ہوئی کمرے سے نکل آئی اور لان میں آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ صارم اسے دور سے روتا دیکھ کر اپنے گھر کی طرف نکل گیا۔ اسے سب کے سامنے بہت ضبط کرنا پڑ رہا تھا اور وہ کھل کر رونا چاہتا تھا۔ اسے اپنے نانا ابا حیدر علی سے بہت پیار تھا۔ ان کی موت کا صدمہ اس کے لیے بھی اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا اس کی ماں سعدیہ کے لیے تھا یا دوسروں کے لیے تھا۔ سب کو محبت سے جوڑ کر رکھنے والے "حیدر علی" اب نہیں رہے تھے۔

☆......☆

دادا ابا کا دسواں تھا۔ سارہ نے خود کو اس صدمے سے سنبھال ہی لیا تھا۔ حیدر لاج میں موجود ہوتی تو اس کا زیادہ وقت دادا ابا کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ اسے رہ رہ کر وہ سارے دن یاد آرہے تھے۔ آنکھیں برسوں بعد آنسوؤں کے سیلاب سے آشنا ہوئی تھیں۔ وہ اتنے دن سے حیدر لاج میں ہی تھی۔ سعدیہ پھپھو کی طرف نہیں گئی تھی۔ جہاں اس کی رخصتی کر دی گئی تھی۔ صارم سے بھی وہ بچتی رہی تھی۔ اس سے اس دوران بات بھی نہ ہو سکی تھی۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا بھی گھر میں تانتا بندھا تھا۔ اب اسے اسلام آباد جانے کی فکر لاحق ہوئی تو اپنا سامان پیک کرنے کی غرض سے کمرے میں آئی مگر اس کا سامان سوٹ کیس سمیت اس کے کمرے سے غائب تھا۔ اس نے سارا کمرہ چھان مارا مگر اس کی ایک بھی چیز اسے ٹھکانے پر نہ ملی۔ ابھی وہ ممی سے پوچھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ خود ہی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"ممی! میرا سامان، سوٹ کیس کہاں ہیں سب چیزیں؟" اس نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔

"تمہاری پھپھو کے گھر ہے تمہارا سامان اور سوٹ کیس۔"

"مگر کیوں؟"

"سارہ بیٹا! اتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں رہتے ہوئے حالات خواہ جیسے بھی تھے مگر تمہاری صارم سے شادی اور رخصتی تو ہوئی تھی نا۔ پھر یہ مناسب نہیں لگتا کہ تم میکے میں رہو۔ اب تو تمہارے دادا ابا کو فوت ہوئے بھی کئی دن ہو گئے ہیں۔ تم نے اپنے گھر کا چکر ہی نہیں لگایا اس دوران۔ چندا! تم اب صارم کی بیوی ہو تمہیں اس کے گھر میں اس کے پاس جانا چاہیے۔" امینہ بیگم نے اس کے بالوں کو نرمی سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''مگر ممی! مجھے واپس اسلام آباد جانا ہے، میرے ایگزامز ہونے والے ہیں۔''

''اسلام آباد تو صارم کو بھی جانا ہے۔ اس کی جاب ہے وہاں۔ تم جا کر صارم سے پوچھو کہ وہ کب اسلام آباد جا رہا ہے پھر جیسا وہ کہے ویسا ہی کرنا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اب مجھے اسلام آباد جانے کے لیے صارم سے پوچھنا پڑے گا۔'' اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔

''ظاہر ہے اب وہ تمہارا شوہر ہے۔ تمہیں اس کی مرضی پر ہی عمل کرنا ہوگا۔'' امینہ بیگم نے کہا تو وہ اندر ہی اندر سلگنے لگی۔ ایک نکاح نامے پر دستخط کر کے وہ صارم کی مرضی اور اجازت کی محتاج ہو کر رہ گئی تھی۔

''ساری زندگی یہ لوگ مجھ پر اپنی مرضی، رائے اور حکم چلا کرتے رہے اور اب...... صارم حفیظ کو میرا حاکم مقرر کر دیا گیا ہے۔ اب بقیہ زندگی مجھے صارم کے حکم اور اس کی مرضی پر عمل کرتے ہوئے گزارنا ہوگی۔ میری اپنی کوئی حیثیت، کوئی خواہش کوئی مرضی یا کوئی رائے نہیں ہے۔ میں ہمیشہ دوسروں کی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کرتی رہوں گی۔ نہیں، بہت ہو گیا اور اب صارم حفیظ مائی فٹ۔'' سارہ نے دل میں کہا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اپنی بے بسی پر اسے شدید غصہ آ رہا تھا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر روئے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

''سارہ بیٹا! کیا سوچ رہی ہو جاؤ۔ شاباش صارم کے پاس جاؤ۔'' امینہ بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ اپنے خیالوں سے باہر نکل آئی۔

''نہ تو میں صارم کے پاس جاؤں گی اور نہ ہی اسے اپنے پاس آنے دوں گی۔ کیا سمجھا ہے آخر مجھے ان لوگوں نے۔ میں کوئی کھلونا ہوں جو ان کا دل بہلاتی رہوں گی۔'' سارہ نے دل میں کہا اور بڑے جارحانہ انداز میں چلتی گھر کا لان عبور کرتی سعدیہ پھپھو کے گھر چلی آئی۔ وہ سب حیدر لاج کے ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ صارم اپنے کمرے میں تھا۔ وہ اوپر چلی آئی اور اس کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی۔

''کم ان۔'' صارم کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ دروازہ پیچھے دھکیل کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ صارم بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے آنکھوں میں روشنیاں سی بھر گئیں۔ سارہ نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ بھی۔ بال الجھے الجھے سے تھے۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ کل تک تو بالکل صحیح تھا۔ شاید رت جگے کا اثر ہے۔ سارہ نے دل میں سوچا۔ اس کے بیڈ کی سجاوٹ جوں کی توں تھی۔ چاروں جانب پھولوں کی لڑیاں لہرا رہی تھیں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

''خوش آمدید سارہ جان!'' صارم نے بیڈ سے اتر کر اس کے سامنے آتے ہوئے بہت شوخ اور خوش گوار لہجے میں کہا تو وہ جو اس سے لڑنے کے موڈ میں آئی تھی۔ اس کے اس انداز پر بری طرح نروس ہو گئی۔ اس سے کبھی کسی نے اس لہجے اور انداز میں بات ہی کب کی تھی بلکہ سچ تو یہ تھا کہ اس کے سنجیدہ اور سخت ریزرو رہنے کی عادت نے کبھی اس کے کسی کلاس فیلو کو بھی اس سے بے تکلف ہونے کی جرات اور اجازت نہیں دی تھی۔ کتنے تھے جو اس پر مرتے تھے مگر اس کے سامنے جرأت اظہار کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

''آپ۔'' وہ بس نظریں جھکا کر اتنا ہی کہہ سکی۔

''ہم تو کب سے آپ کے منتظر تھے۔ صد شکر آپ کو خیال تو آیا۔'' وہ اس کے میک اپ اور جیولری نام کی ہر آرائش

سے مبرا دلکش چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرا سامان آپ یہاں لائے ہیں۔'' اس نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''کس لیے؟''

''اس لیے کہ آپ کے سامان کی اصل جگہ تو اب یہ ہے اور پھر بیوی کا بوجھ تو شوہر ہی اٹھایا کرتے ہیں۔'' صارم اسے والہانہ پن سے دیکھتے ہوئے بولا۔ باٹل گرین جارجٹ کے سادہ سے شلوار قمیص دوپٹے میں وہ گھبرائی سی اسے ہمیشہ سے بہت مختلف اور دلربا لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ دیکھ کر اس کے دل کی کلی کھل رہی تھی۔

''میں اتنی وزنی نہیں ہوں جو آپ مجھے بوجھ کہہ رہے ہیں۔'' اس کی زبان پھسل گئی۔

''دیکھنے میں تو واقعی ایسا لگتا ہے لیکن یہ تو اٹھانے پر ہی معلوم ہوگا نا کہ آپ کا وزن کتنا ہے۔'' وہ شرارت بھرا جملہ بول کر اسے مزید نروس کر گیا۔ وہ سرخ پڑ گئی۔ اپنے جملے پر خیالوں ہی خیالوں میں اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ تو بات سے بات نکالنے کا ماہر تھا، وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بیڈ کے قریب آ کر رک گئی۔

''ہم اسلام آباد کب جائیں گے؟'' سارہ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''ہنی مون کے لیے۔'' وہ شوخی سے بولتا اس کے قریب چلا آیا۔

''کیوں؟'' اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ شادی کے بعد اسلام آباد کا رخ تو ہنی مون کی غرض سے ہی کیا جاتا ہے نا۔''

''شادی کی باقی ساری رسمیں تو جیسے بہت اہتمام سے ادا کی گئی ہیں نا جو ہنی مون منایا جائے۔'' وہ چڑ کر بولی تو وہ دھیرے سے ہنس دیا اور پھر نرمی سے بولا۔

''تو شادی اہتمام سے نہ ہونے کا غصہ ہے تمہیں، چلو میرا تم سے وعدہ ہے کہ ساری رسمیں ہم یہاں ادا کریں گے۔ ابھی ولیمہ تو نہیں ہوا نا، ولیمہ خوب اہتمام سے ہوگا۔''

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ زبردستی کی شادی اور خواہ مخواہ کا ولیمہ۔'' سارہ نے سپاٹ لہجے میں کہا تو صارم کا دل چھنا کے سے ٹوٹ گیا۔ وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی۔

''کیا کہا تم نے...... زبردستی کی شادی؟'' وہ مرے مرے لہجے میں بولا۔

''تو آپ کا کیا خیال تھا کہ میں آپ سے شادی کے لیے مری جا رہی تھی۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ شادی کن حالات میں ہوئی ہے۔ مجھے ایمرجنسی میں یہاں بلا کر آپ کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ ایسے ہوئی ہے شادی۔ مجھے تو اب تک یقین ہی نہیں آ رہا کہ میری شادی ہو گئی ہے۔'' اس نے سنجیدہ اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ یہ دیکھے اور جانے بغیر کے صارم کے دل پر اس کے یہ الفاظ کیسے بجلی بن کر گر رہے ہیں۔ اسے راکھ کر رہے ہیں مگر وہ اسے پیار سے سمجھانے کے خیال سے اس کی باتوں پر غصہ نہیں ہو رہا تھا

''جناب ہم جو ہیں آپ کو یقین دلانے کے لیے۔'' صارم نے خود کو سنبھالتے ہوئے لہجے کو شوخ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔ ''اور رہا ہنی مون تو سارہ جان! جہاں آپ ہمارے ساتھ ہوں گی وہاں ہر لمحہ ہنی مون بن جائے گا۔ دل پسند اور من چاہی شریک زندگی ساتھ ہو تو پھر کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''تو آپ اسلام آباد نہیں جائیں گے۔'' اس نے نظریں چرا کر کہا۔

''وہاں جانا ضروری ہے کیا؟'' صارم اس کے چہرے کو وارفتگی سے دیکھ رہا تھا۔

(جاری ہے)

فرح انیس

پتھر کی لڑکی

اونچی پہاڑیوں کے عین وسط میں بنا یہ چھوٹا سا گھر تھا جس میں ہمہ وقت گہرا سکوت رہتا تھا۔ اس گھر کی مکین رات کے اندھیرے میں اپنے چھوٹے سے برآمدے میں رکھی راکنگ چیئر پر بیٹھی آنکھیں بند کیے آگے پیچھے جھولتی ہوئی گردونواح سے بے خبر تھی۔

''رک جاؤ مت جاؤ۔'' وہ اندھا دھند چلاتی ہوئی اس کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی مگر اس کے آگے چلنے والے کی رفتار اس سے کئی گنا تیز تھی۔ بھاگتے ہوئے اس کا سانس تیز دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح سے وہ اس کی گرفت میں آجائے مگر وہ اس سے بہت آگے تھا اور اچانک ہی وہ اونچی پہاڑی سے نیچے جا گرا۔

''شہرام خان!!'' اس نے زوردار چیخ ماری اور گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ماتھے پر آیا پسینہ پونچھنے لگی۔ اتنی سخت ٹھنڈ میں بھی اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور اپنی بے ترتیب دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

سیاہ اندھیرے نے ہر شے کو ڈھانپ لیا تھا۔ وہ بے مقصد سا اس اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھتی رہی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو اور پھر تھک ہار کر واپس کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی اب اسے اس کرسی پر بیٹھے بیٹھے صبح ہو جائے گی، اسے اب صبح یا رات سے فرق بھی کیا پڑتا تھا، اس کے لیے وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ نہ ابھرتا سورج اس کو کوئی خوشی دے سکتا تھا نہ ڈوبتا سورج اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی لا سکتا تھا۔

جن کی اپنی زندگیوں میں تاریکی چھائی ہو تو پھر چاہے چودھویں کا چاند ہو یا آب و تاب سے چمکتا سورج، کوئی بھی ان کی زندگی پر چھائے اندھیرے کو نہیں ہٹا سکتا۔

☆......☆

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ روشنی چاروں سمت پھیل چکی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوئی اور باہر کے مناظر دیکھنے لگی۔ سفید برف نے پہاڑیوں کو بالکل ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ یک ٹک برف سے چھپی پہاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ان پہاڑیوں کو جیسے اس برف نے ڈھانپ رکھا ہے نا شہرام خان! میرے وجود کو بھی تمہارے عشق نے ایسا ڈھانپ لیا ہے۔'' زندگی کی پچپن بہاریں گزر چکی ہیں۔ نہیں بہار تو وہ تھی جو تمہارے سنگ گزری تھی۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''تمہارے جانے کے بعد میری زیست کے ہر لمحے پر خزاں کا موسم آ کر جیسے ٹھہر سا گیا ہے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔

ریزہ ریزہ ہے میرا عکس تو حیرت ہے یہ محسن
میرا آئینہ سلامت ہے تو پھر ٹوٹا کیا ہے

دھیرے سے اس کے لب ہلے۔

وہ کیا وقت تھا کہ دن میں وہ دس بار آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے اپنے حسن کا خراج وصول کرتی تھی۔ کہانی کی اس شہزادی کی طرح جو روزانہ یہ پوچھتی کہ بتاؤ سب سے حسین کون۔ صبح آنکھ کھلتے ہی اسے خود کو دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ وہ خود کو ہمیشہ شہرام خان کی آنکھ سے دیکھا کرتی تھی۔ جس کی آنکھیں ہمیشہ بس یہی اظہار کرتی تھی کہ آبگینے خان جیسا حسین کوئی نہیں کیونکہ شہرام کی آنکھ اس عاشق کی تھی جس کو محبوب کے سوا ہر رنگ بے رنگ دکھائی دیتا ہے۔

آبگینے خان جس کی بڑی بڑی خوابناک آنکھوں پر دراز پلکیں سایہ کیے رکھتی تھیں۔ سنہری رنگت پر بکھری گلابیاں، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نازک سے لب، ٹھوڑی پر خم اور شانوں تک آئے سنہری بال، چہرے پر بلا کا بھولپن جو اس کے حسن کو مزید دوآتشہ کر دیتا تھا۔

☆......☆

''کیا ہے، تم کو چین نہیں ہے۔ آبگینے خان! جب دیکھو آ جاتی ہو۔'' وہ نہا کر واش روم سے نکلا تو اس کو اپنے کمرے میں بیڈ پر مزے سے بیٹھا دیکھ کر بولا۔

''نہیں نا۔ جب تک صبح صبح تمہاری صورت نہ دیکھ لوں میری صبح نہیں ہوتی شہرام خان۔'' وہ نچلا لب دانتوں میں دبائے شرارت سے بولی۔

''اور اگر کسی صبح تم نہ دیکھ سکیں مجھے؟''

''تو پھر میری صبح ہی نہیں ہوگی شہرام خان۔'' وہ اس کے سوال کے جواب میں بولی اور اس کی سحر انگیز آنکھوں کو تکنے لگی۔ آبگینے خان کو شہرام خان کی آنکھوں سے عشق تھا۔

''ویسے بھی کیا کروں محبوب کا دیدار کیے بغیر دن نہیں گزرتا۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''شرم کرو آبگینے خان۔'' وہ آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں برش کرتا ہوا اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''شرم کی کیا بات ہے، اپنے شوہر کو محبوب کہنا کون سی بے شرمی ہے۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

☆......☆

آبگینے خان کا بچپن میں ہی اپنے تایا زاد شہرام خان سے نکاح ہو گیا تھا۔ دونوں کے گھر بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ شہرام خان نے شہر کی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اسی سلسلے میں وہ پہلے وہاں ہوسٹل میں مقیم تھا اور اب اپنی تعلیم حاصل کر کے واپس آ گیا تھا۔ جس پر سب ہی خوش تھے مگر آبگینے کی خوشی دیدنی تھی۔ کچی عمر میں اگر ایک بار کوئی خواب دیکھ لو تو ان خوابوں کا رنگ وقت گزرنے کے ساتھ پکا ہوتا چلا جاتا ہے پھر چاہ کر بھی اس رنگ کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ رنگ اس قدر آنکھوں میں رچ جاتا ہے کہ اس رنگ کو مٹانے کے لیے اپنی آنکھوں کو نوچنا پڑ جاتا ہے۔

بس ایسا ہی حال آبگینے خان اور شہرام خان کے اس عشق کا تھا جو انہوں نے بچپن میں ایک دوجے سے کیا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد تو اب اس عشق کا رنگ اس قدر گہرا ہو چکا تھا جیسے زندگی جینے کے لیے سانس ضروری۔ ایسا ہی ان دونوں کے جینے کے لیے ایک دوجے کا ساتھ ضروری۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کے سینے میں دھڑکتے تھے۔

”جانتے ہو شہرام خان! عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے پر مرد کی بے وفائی نہیں۔“ وہ دونوں اس وقت پہاڑی پر بیٹھے باتوں میں گم تھے کہ اچانک کسی بات پر آبگینے بولی۔

”اچھا ایسا کیوں ہوتا ہے۔“ وہ دلچسپی سے اس کے چہرے پر دھنک کے بکھرے رنگوں کو دیکھتا ہوا سوال کرنے لگا۔

”کیونکہ عورت مرد سے صرف ایک ہی تو چیز چاہتی ہے کہ وہ اس کی عزت کرے اور وفا کے بدلے میں اس کو وفا دے۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”آبگینے خان، میں نے ہمیشہ تم کو وہ سب دیا جو ایک عورت چاہتی ہے، عزت، محبت وفا۔“

شہرام کی بات پر وہ مسکرا دی۔ ”ہاں میں جتنا اپنی قسمت پر رشک کروں کم ہے۔“ وہ تفاخر سے اس کے شانے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

☆......☆

”تم کب آئیں؟“ شام وہ سو کر اٹھی تو لیلیٰ کو اپنے کمرے میں موجود دیکھ کر خوشگوار حیرت سے بولی۔

”میں تب ہی آ گئی تھی جب آپ خوابوں میں اپنے سرتاج کے ساتھ وادیٔ عشق میں کھوئی ہوئی تھیں۔“ لیلیٰ خان ہنستے ہوئے اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

لیلیٰ اس کی خالہ زاد تھی اور پشاور میں مقیم تھی۔

”پورے تین سال بعد آ رہی ہو تم۔“ آبگینے شکوہ کرتے ہوئے بولی۔

”تم نہیں آ سکتی تھیں کیا؟“ الٹا وہ اس سے شکوہ کرنے لگی۔

”یار میرا بہت دل تھا آنے کا مگر کوئی لانے والا بھی نہیں تھا اور شہرام اجازت دیتے نہیں آنے کی۔“ آبگینے منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”چلو کوئی بات نہیں میں آ گئی نا۔“ وہ لاڈ سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی جس پر آبگینے محبت سے مسکرا دی۔

”اب آئی ہو تو آرام سے جانا۔“ آبگینے اس کو محبت سے دیکھتے ہوئے اپنے بکھرے بال سمیٹتی ہوئی بولی۔

”ہاں اتنی جلدی سے تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔“ لیلیٰ شرارت سے بولی۔ لیلیٰ نہ صرف اس کی خالہ زاد تھی بلکہ دونوں کے درمیان بہنوں اور دوستوں جیسی الفت تھی۔

آبگینے اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ باپ کا انتقال تب ہو گیا تھا جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ آبگینے کی ماں آمنہ خان کو شہرام کے گھر والوں کی وجہ سے کافی ڈھارس تھی۔ شہرام خان کے باپ زوہیب خان کو آبگینے بڑے بابا کہا کرتی تھی۔ شہرام تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کی دو بڑی بہنیں تھی جو شادی کے بعد پشاور میں رہائش پذیر تھیں اور شہرام سے چھوٹی دس سالہ پلوشہ تھی جو اسکول میں پڑھتی تھی۔

شام وہ لیلیٰ کو لے کر پہاڑیوں پر نکل گئی۔ کافی دیر تک دونوں چلتی رہیں۔

”بس میں تھک گئی۔“ لیلیٰ تھک کر وہیں پہاڑی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اوہ اتنی جلدی تھک گئیں۔“ آبگینے اس کے بیٹھنے پر بولی۔

”تم لوگوں کو عادت ہے ان پہاڑیوں پر چلنے کی ہمیں نہیں، میرا تو برا حال ہو گیا۔“ لیلیٰ اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتے ہوئے بولی۔

وہ اس کی بات پر ہنس دی۔

”ویسے مزہ بھی بہت آتا ہو گا سب سے الگ تھلگ بالکل ایک مختلف دنیا ہے۔“ لیلیٰ ستائشی نظروں سے اپنے اطراف میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ تو ہے، سب سے الگ تھلگ سی ہے ہماری دنیا۔“ بھاری مردانہ آواز پر لیلیٰ چونک کر پلٹی تو شہرام مسکراتے ہوئے آبگینے کے قریب بیٹھ گیا۔

”کیسے ہیں شہرام خان!“ لیلیٰ خوشگواری سے بولی۔

”آپ کے سامنے ہوں بالکل ٹھیک۔“ اس کے سوال پر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ تو ان تین سالوں میں بالکل ہی بدل گئے۔“ لیلیٰ اس کی سحر انگیز شخصیت کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیوں کیا ان تین سالوں میں میرے سینگ نکل آئے۔“ شہرام کے شوخی سے کہنے پر لیلیٰ جھینپ سی گئی تو آبگینے زور سے ہنس دی۔

”ہاں لیلیٰ، شہرام اب بارہ سنگھا ہو گئے۔“ آبگینے ہنسی دباتے ہوئے بولی۔

وہ اس کو گھورنے لگا۔ لیلیٰ دونوں کو اس طرح ایک دوجے کے قریب دیکھ کر عجیب سے احساس سے دوچار ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہوا ہے مگر اس کو کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اور پھر لیلیٰ کا آنا جانا شہرام کے گھر زیادہ ہی بڑھ گیا تھا جو آبگینے نے بھی محسوس کیا تھا۔ آبگینے کو لیلیٰ کے وجود سے پہلی بار بے چینی سی محسوس ہوئی۔ وہ پتا نہیں کیوں چاہ رہی تھی کہ لیلیٰ واپس گھر چلی جائے۔

کہاں تو وہ لیلیٰ کو منتوں سے روکا کرتی تھی اور اب کہاں اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ لیلیٰ کو واپس بھیج دے۔ اس نے اس کی آنکھوں میں اس چمک کو صاف محسوس کیا تھا جو شہرام کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آتی تھی۔ وہ عورت تھی اور عورت کی چھٹی حس محبت کے معاملے میں بے حد تیز ہوتی ہے۔ وہ مرد کی بدلتی نگاہ اور رویے کو بھی پہچان لیتی ہے اور اپنے مرد پر پڑتی اس نگاہ کو بھی جس میں دلچسپی ہوتی ہے۔

☆......☆

دو دن سے تیز طوفانی بارشوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ان بارشوں کی وجہ سے سب اپنے گھر مقید ہو کر رہ گئے تھے۔ آبگینے کا دل گھبرانے لگا تھا۔ لیلیٰ صبح سے تایا کی طرف گئی ہوئی تھی۔

میں بھی چلی جاتی ہوں تایا کی طرف، لیلیٰ بھی وہیں ہے۔ اچھا ہے سب مل کر بیٹھ کے باتیں ہی کر لیں گے۔ یہاں بیٹھ کے بور ہونے سے اچھا ہے۔ وہ سوچتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور تایا کے گھر آ گئی۔

”اتنا سناٹا کیوں ہے۔“ وہ پلوشہ کے کمرے میں آ گئی جہاں وہ بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو پیار سے ہٹا کر جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر باہر چلی آئی۔

تائی کے کمرے میں جھانکا جہاں تائی سو رہی تھیں۔ اس کی نگاہ گھڑی پر پڑی جو دوپہر کے تین بجا رہی تھی جب سب سو رہے ہیں تو لیلیٰ کہاں ہے؟ وہ حیرت سے سوچتی ہوئی شہرام کے کمرے کی جانب بڑھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر سے لیلیٰ کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ آبگینے کانپتے قدموں سے آہستگی سے اندر جھانکنے لگی، جہاں وہ دونوں بیڈ پر انتہائی نزدیک بیٹھے باتیں کر رہے تھے اچانک بادل گرجنے کی زوردار آواز پر ڈر کے جہاں آبگینے اچھلی وہیں سامنے کے منظر نے اسے لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ لیلیٰ شہرام کے سینے سے لگ کر اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا گئی تھی اور بے یقینی کی کیفیت میں کھڑی آبگینے شہرام کے اس ہاتھ کو دیکھنے لگی جو لیلیٰ کی پشت پر تھا۔

آبگینے یہ منظر دیکھ کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور سہارے کے لیے اس نے زور سے دروازہ پکڑا۔ کھٹکے کی آواز پر دونوں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ جہاں سفید پڑتے چہرے کے ساتھ آنکھوں

میں بے یقینی لیے ہوئی آبگینے کھڑی تھی۔ شہرام نے تیزی سے لیلیٰ کو خود سے الگ کیا مگر تب تک وہ پلٹ کر جا چکی تھی۔

☆......☆

"بارش رک چکی ہے مگر نقصان بہت ہوا ہے اس بارش سے۔" آمنہ خان کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے بولیں۔

وہ جو چپ چاپ آتش دان کے سامنے بیٹھی تھی ماں کی بات پر پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"ہاں ماں اس بارش نے بہت توڑ پھوڑ مچائی ہے مجھے اب زندگی میں کبھی بارش نہیں اچھی لگے گی۔ یہ بارش تو مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔" ماں کی بات پر وہ دھیمے سے بولی۔

"اے کیا سٹھیا گئی ہے۔" آمنہ اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

وہ ماں کی بات پر چپ سی ہو گئی۔

"مجھے معاف کر دو آبگینے۔" لیلیٰ اس کے کمرے میں آتے ہوئے بولی۔

لیلیٰ اس سے نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ لیلیٰ کی بات پر وہ بے تاثر چہرے سے اس کو دیکھنے لگی۔

"معافی کا لفظ کہنا آسان ہے لیلیٰ خان مگر اس نقصان کا ازالہ نہایت مشکل ہے جو میرا ہوا ہے۔"

اس کی بات پر لیلیٰ سر جھکا گئی۔ آبگینے کو لیلیٰ کا وجود اس کالے جادو کی طرح لگا جو اس کے عشق پر ہو گیا تھا۔

"کہاں چھپتے پھر رہے ہو شہرام خان، مرد ہو کر تم میں اتنی بھی مردانگی نہیں کہ ایک عورت کا سامنا کر سکو۔" وہ اس کے کمرے میں آتے ہوئے طنز سے بولی۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا آبگینے جو میں چھپتا پھروں گا۔" اس کی بات پر وہ تڑپ کر بولا۔

"واقعی شہرام خان تم نے کوئی جرم نہیں کیا، امانت میں خیانت کوئی جرم نہیں تمہاری نظر میں؟"

"اپنی منکوحہ کو کسی غیر مرد کے سینے سے لگا دیکھ کر تم کیا کرتے؟ میں بتاتی ہوں تم کیا کرتے...... اسی جگہ جہاں میں کھڑی ہوں نا میری قبر کھود ڈالتے، یہ کرتے تم میرا انجام۔" وہ اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئی بولی۔

☆......☆

"پٹھانوں میں تو ویسے بھی غیرت پر بڑے قتل ہوتے ہیں، میں بھی پٹھان عورت ہوں میری بھی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میرا مرد کسی غیر عورت کو سینے سے لگائے۔"

"اب تم بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ اس کی بات پر لاجواب ہو کر چپ سا ہو گیا۔ اسے خاموش کھڑا دیکھ کر وہ پلٹ گئی۔

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے
محبت کی نمازوں میں امامت ایک کو سونپیں
اسے تکنے اسے تکنے سے نیت ٹوٹ جاتی ہے
محبت دل کا سجدہ ہے جو ہے توحید پر قائم
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے

☆......☆

دن بے کیف سے گزرنے لگے اور پھر ایک خبر نے آبگینے خان کی روح میں اندر تک سناٹے اتار دیے۔

شہرام خان پہاڑی پر سے پیر پھسلنے کے نتیجے میں پہاڑی سے بہت نیچے گہری کھائی میں جا گرا تھا۔ اس خبر نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شہرام کا دوست صارم اس سے ملنے آیا ہوا تھا۔ وہ صارم کے ساتھ باتوں میں اس قدر مشغول تھا کہ اچانک چلتے ہوئے نہ جانے کیسے اس کا پیر رپٹا اور وہ نیچے جا گرا۔ بہت ڈھونڈا اس کی لاش کو مگر نہ ملی۔

اس کی موت کی خبر نے سب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

لیلیٰ واپس جا رہی تھی۔ جانے سے پہلے وہ آبگینے

سے ملنے آئی تھی جو پتھر کی مورت بنی بیڈ پر بیٹھی تھی۔

"میں جا رہی ہوں آبگینے۔" وہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی مگر وہاں خاموشی تھی۔

"میں شہرام کو دیکھ کر اس کے سحر میں گرفتار ہونے لگی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمہارا شوہر ہے۔ میں چاہتی تو ان ہی قدموں سے واپس لوٹ جاتی مگر میں نے اپنے دل کی طرح اپنے قدموں کو بھی آزادی دے دی تھی مگر آبگینے اس کی آنکھوں میں، میں نے صرف تمہاری محبت دیکھی، اس کی باتوں صرف تمہارا ذکر سنا۔ مجھے تم سے حسد ہونے لگا تھا۔ میں خود اس کی جانب بڑھتی تھی۔ خود اسے اپنی جانب متوجہ کرتی تھی۔ ساری پیش قدمی میری جانب سے ہوتی تھی۔ اس نے کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی میرے کسی بھی جذبے کی۔ ہاں جس لمحے تم نے ہم دونوں کو دیکھا، میں بہک گئی تھی۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑے سامنے کھڑی ہوئی تھی مگر وہ پتھر کی بنی بے تاثر چہرے اور آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ لیلیٰ شکست خوردہ قدموں سے واپس پلٹ گئی۔

"لیلیٰ خان کاش تم نہ آتیں کبھی، تم اکیلی نہیں گئیں تم میرا سب کچھ اجاڑ کر اپنے ساتھ لے گئیں۔" آبگینے نے گھٹنوں میں چہرا چھپا کر کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆......☆

شہرام کے جانے کے بعد تایا کافی بیمار رہنے لگے تھے اور اس بیماری سے زیادہ عرصے جنگ نہ کر سکے اور اس جہاں کو الوداع کہہ کے اگلے جہاں چلے گئے۔

تائی نے پلوشہ کی شادی اپنی بیٹی کے دیور سے کر دی تھی۔ تایا کے جانے کے بعد اور شہرام کے غم نے تائی کو توڑ کر رکھ دیا تھا وہ بھی کب تک دکھوں کا مقابلہ کرتیں وہ بھی کچھ عرصے بعد گزر گئیں۔

"آبگینے میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں بیٹا میں چاہتی ہوں تیری شادی کر دوں۔" آمنہ خان بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے بولیں۔ وہ بہت زیادہ بیمار رہنے لگی تھیں اور چاہتی تھیں اپنی زندگی میں اس کا ہاتھ کسی بھروسے مند انسان کے ہاتھوں میں سونپ کر جائیں۔

"شادی تو میری ہو چکی ہے ماں! اب کون سی شادی کروں گی۔" وہ ماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے معاف کر دینا ماں مگر اب کبھی یہ بات نہ کرنا۔" وہ بہت ٹوٹے انداز میں ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کے بولی اس کے لہجے کی اداسی نے آمنہ خان کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔

ماں کو بیٹی کے غم نے آہستہ آہستہ چاٹ کر ختم کرنا شروع کر دیا تھا اور یوں ایک شام وہ آبگینے خان کو تنہا چھوڑ گئیں۔

وہ تنہا کھڑی تھی۔ محبت کی سلطنت پر حکمرانی کرنے والی لڑکی اجڑ چکی تھی۔ آبگینے خان جس کی صبح شہرام خان کو دیکھ کر ہوا کرتی تھی، اس کی زندگی میں پھر کوئی ایسی صبح نہیں آئی اور اس کے چلے جانے کے بعد پھر کبھی اس کی صبح نہیں ہوئی۔ تاریکی جیسے اس کے ارد گرد ٹھہر گئی۔

وہ اکیلی عورت پتھر کی طرح مضبوط ہو گئی تھی اس اکیلی عورت کو پتھر کا بننا پڑا ورنہ دنیا میں موجود بھیڑیے اسے نوچ ڈالتے۔ پہاڑیوں پر رہنے والی اس عورت کا وجود بھی ان سنگلاخ چٹانوں جیسا پتھر کا ہو گیا تھا۔

☆......☆

سورج ڈھلنے لگا تھا وہ آہستگی سے چلتی ہوئی بیڈ کے پاس رکھی الماری کے پاس آ رکی اور الماری کھول کر اس خستہ حال خط کو نکال کر پڑھنے لگی جو اس نے برسوں سے سینت کر رکھا ہوا تھا۔ شہرام کے جانے کے آٹھ سال بعد ایک دن اچانک صارم اس کے گھر چلا آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا تھا یہ شہرام نے دیا ہے اس کاغذ کو پکڑتے ہوئے آبگینے خان کا پورا وجود کانپ گیا تھا۔

آبگینے خان یہ آٹھ سال کس کرب میں گزرے

مت پوچھو، تم سے کیے گئے وعدے کا پاس ہے مگر اب بہت مجبور ہو کر یہ خط تم کو لکھ رہا ہوں صرف یہ سوچ کر کہ میرے لکھے لفظوں کو آبگینے خان کی آنکھیں پڑھیں گی جن سے مجھے عشق ہے۔ میں زادِ راہ کے طور پر تمہاری یادیں اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ پہاڑیوں پر بیٹھ کر کی گئی وہ ملاقاتیں جن کو گواہ بنا کر ہم اپنے عشق کا اقرار کیا کرتے تھے۔ اب ان یادوں کو دن رات یاد کر کے اس وقت کو گزارتا ہوں جو کسی طور نہیں گزرتا۔ جانتی ہو، تم نے مجھے بڑی کڑی سزا دی ہے۔ تم نے مجھے زمین میں دفن نہیں کیا آبگینے خان مگر تمہارا فیصلہ سن کر مجھے محسوس ہوا تھا میں واقعی زمین میں دفن ہو گیا ہوں۔ تمہاری اس شام کی وہ ملاقات میرے لیے نہ ختم ہونے والی اذیت ساتھ لائی تھی۔ جس وقت تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنا نام میرے نام سے الگ کر دو۔ یہ سب کرنا میرے لیے موت سے بھی زیادہ اذیت ناک تھا۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں وہیں کسی پہاڑی سے کود کر جان دے دیتا۔ لیلیٰ خود آگے بڑھی تھی یہ بات تم بھی جانتی ہو مگر اس وقت تمہاری اس بات نے کہ تم چاہتے تو دھکے دے کر اس کو اپنے کمرے سے نکال سکتے تھے۔ تم چاہتے تو اس کے ساتھ اتنا سخت رویہ رکھتے کہ دوسری بار اس کی بات کرنے کی مجال نہ ہوتی۔ مجھے لاجواب کر گئی تھی۔ سچ ہے عورت آزمائش ہی ہوتی ہے اور میں اس آزمائش میں ناکام ہوا۔ صرف اس ایک لمحے کی لغزش میری عمر بھر کی اذیت بن گئی۔

تم نے مجھ سے کہا تھا میں سب برداشت کر سکتی ہوں مگر محبت میں شراکت نہیں، بے وفائی نہیں۔ اس لمحے مجھ پر ایک بات کھلی کہ عورت ذات کتنی عجیب ہے۔ محبت کرنے پر آ جائے تو خود کو محبوب کے قدموں میں گرا دیتی ہے مگر ضد پر آ جائے تو محبوب قدموں میں بھی بیٹھ جائے تو نہیں سنتی۔ تم نے طلاق مانگی جو میں جیتے جی نہیں دے سکتا تھا۔ تم نے کہا میں دور چلا جاؤں تمہاری زندگی سے تو میں تمہاری زندگی سے دور تو ہو گیا مگر موت کا جھوٹا بہانہ بنا کر اور اس حقیقت سے تمہارے سوا کوئی واقف نہیں کہ میں مرا نہیں زندہ ہوں۔

میں یہاں شہر میں میں زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں مر چکا ہوں اور خالی احساس سے عاری وجود لیے پھرتا ہوں۔ لگتا ہے روز مر مر کر جیتا ہوں۔ تم نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا تھا کہ تم کو اجازت ہے شہرام خان کہ تم جہاں چاہو شادی کر لینا۔ میں تمہارے روگ سے نکلتا تو کچھ سوچتا۔ میرے یہ ماہ و سال کس اذیت میں گزرے شاید میرے پاس وہ لفظ نہیں جو میری اذیت کو بتا سکیں۔ تم اتنی سنگ دل کیوں بن گئی تھیں کہ تم نے مجھے ایسی سزا دے دی۔ میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیسا عشق کرتی ہو۔ تم نے نہ صرف مجھے سزا دی بلکہ خود کو بھی دی۔ مگر ایک وعدہ کرو آبگینے خان! جتنے دکھ درد اٹھانے تھے ہم نے اس دنیا میں اٹھا لیے۔ وہاں دوسرے جہاں میں تم نے مجھے معاف کر دینا ہے اور وہاں میرے ساتھ میری ہی بن کے رہنا ہے۔ میں نے اللہ سے تمہارا ساتھ مانگا ہے دوسرے جہاں میں جہاں ہم نے ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔

تمہیں معلوم ہے جاناں
کہ تم بھی ایک قاتل ہو
میرے اندر کا ہنستا ہوا انسان
تم نے مار ڈالا ہے

فقط تمہارا شہرام

شدتِ گریہ سے سرخ ہوتی آنکھوں سے اس نے خط واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا اور دھیرے قدموں سے گھر کے پچھلے حصے کی جانب چلی آئی جہاں ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ اس قبر کی تختی پر شہرام خان لکھا ہوا تھا۔ وہ وہاں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

تم کیا جانو شہرام خان دل پر پہرے لگانے کی کیا اذیت ہوتی ہے۔ جب تمہاری یادیں میرے دل میں مچل کر شور ڈالا کرتی تھی تب میں کس دورا ہے

گزرتی تھی۔ میں نے تمہاری زندگی کی ہمیشہ دعا کی۔ نہ صرف زندگی کی بلکہ تمہاری خوشیوں کی بھی دعا کی۔"

آبگینے کو آج بھی یاد تھا اس خط کو دینے کے کچھ دنوں بعد دوبارہ صارم اس کے روبرو کھڑا تھا۔

"کیا ہوا، پھر لے آئے اپنے دوست کا خط۔" آبگینے خان کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ تھی۔

"نہیں، بتانے آیا ہوں کہ اس کا کوئی خط اب زندگی بھر نہیں ملے گا۔" صارم کی بات پر وہ سانس روکے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"وہ چلا گیا ہے اس دنیا سے۔" صارم خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

وہ کتنی ہی دیر بے یقینی کی کیفیت میں رہی تھی۔ اس لمحے اس پر ادراک ہوا تھا سر پر سے چھت کا ہٹ جانا کیا ہوتا ہے۔

"اصل میں تو میں تمہاری موت کے بعد تنہا ہوئی تھی۔" "تمہارا ہونا میرے لیے کس قدر اہم تھا میں کیا بتاؤں۔ تم دنیا کے کسی بھی حصے میں سانس لیتے بس یہ بات میرے جینے کے لیے کافی تھی کہ تم سلامت ہو اور جب تم نہیں رہے تو میں نے تمہارے نام کی قبر یہاں بنوا ڈالی۔ اب اس احساس سے روزانہ شام یہاں چلی آتی ہوں کہ تم میرے نزدیک ہی ہو۔" وہ اس قبر کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی جو اس نے شہرام خان کے نام کی بنوائی تھی۔

"ٹھیک کہا تھا تم نے، میں واقعی پتھر کی عورت ہوں تمہارے جانے کے بعد میرے احساسات جذبات سب ہی پتھر کی طرح ہو گئے تھے۔ میں نے تم سے ایک بار کہا تھا نا عورت سب برداشت کر سکتی ہے مگر بے وفائی نہیں۔ میں نے خود کو تمہارے لیے تمہاری محبت کے لیے سنبھال رکھا تھا۔ اپنے پاک جذبوں میں کسی کے خیال کو بھی میں کفر سمجھتی تھی مگر جس وقت میں نے تمہارے سینے سے لگی لیلیٰ خان کو دیکھا تھا نا، وہ وقت میرے لیے قیامت کا تھا۔

تم نے اس کو اتنی اجازت کیوں دی کہ اس کے بہکنے کی نوبت آئی۔

آبگینے خان کا عشق ایسا ہی تھا۔ تم سے کہ اس میں وہ کسی غلط قدم کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ محبت تو معاف کرنا درگزر کرنا سکھاتی ہے مگر خیانت کی معافی نہیں ہوتی۔ میں نے خود چنی اپنے لیے یہ سزا شہرام خان ہاں مگر دوسرے جہاں میں تمہارا ساتھ مانگتی ہو۔ اس سارے عمل میں میرا وجود صرف کانٹوں پر چلا ہے۔ میرے اندر کی وحشت جو میرے اندر کے قبرستان میں بنی قبروں پر روز بین کرتی ہے اور جانتے ہوں وہ کن کی قبریں ہیں۔ محبت و عشق کی، میرے ارمانوں کی اور وہ قبرستان شہرام خان کے نام کا ہے جس کے نام سے بھی مجھے عشق ہے۔

قبر پر سر رکھ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر قبر کی مٹی میں جذب رہے تھے۔

اگر میں پتھر کی لڑکی ہوتی
تو اپنے پیکر کی سبز رت پر بہت سی کائی اگایا کرتی
بہت سے تاریک خواب بنتی
تو میں اذیت کی ملگجی انگنت اداسی کے خواب چنتی
اگر میں پتھر کی لڑکی ہوتی
میں اپنے پلو میں سوگ باندھے کسی کو ان کا پتا نہ دیتی
اجالے کو ٹھوکروں میں رکھتی خموشیوں کے ببول چنتی
سماعتوں کے تمام افسون پاش کرتی میں کچھ نہ سنتی
دہکتی کرنوں کا جھرنا ہوتی
سفر کے ہر ایک مرحلے پر میں رہزنوں کی طرح مکرتی
وہم اگاتی گمان رکھتی
تمہاری ساری وجاہتوں کو میں سو طرح پارہ پارہ کرتی
نہ تم کو یوں آئینہ بناتی اگر میں پتھر کی لڑکی ہوتی

☆

تسنیم شریف

نیکی اور بدی کی پہچان.....!

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو اس بات کو ناپسند سمجھے کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔“ (صحیح مسلم)

فرمودات حضرت علیؓ

☆ حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ حکمت خواہ منافق سے ملے لے لو۔

☆ انسان زبان کے پردے میں چھپا ہے۔

☆ ادب بہترین کمال اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

☆ جو چیز اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو۔

☆ گناہ پر ندامت گناہ کو مٹا دیتی ہے، نیکی پر غرور نیکی کو تباہ کر دیتا ہے۔

☆ ہمیشہ سچ بولو تا کہ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

☆ موت کو ہمیشہ یاد رکھو موت کی آرزو کبھی نہ کرو۔

مریم قریشی۔ ڈیرہ اسماعیل خان

استاد

اشفاق احمد اپنی کتاب ”زاویہ“ کے اندر روم میں قیام کے دوران پیش آنے والا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار وہاں ان کا ٹریفک چالان ہوا اور انہیں بارہ آنے جرمانہ ادا کرنے کی سزا دی گئی۔ کچھ وجوہات کی بنا پر وہ جرمانہ ادا کرنے سے قاصر رہے تو انہیں عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ ”جج نے مجھ سے پوچھا آپ کرتے کیا ہیں؟ میں نے بڑی شرمندگی سے سر جھکا کر جواب دیا کہ ”جی میں ٹیچر ہوں۔“ یہ سننا تھا کہ جج اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سب کو کہا کہ ایک استاد عدالت میں موجود ہے۔ یہ سن کر سب احترام میں اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ پھر جج نے انہیں یوں مخاطب کیا جیسے شرمندہ ہو۔ اسی شرمندگی میں جج نے کہا کہ ”جناب آپ استاد ہیں۔ ہم جو آج جج، ڈاکٹر، انجینئر جو کچھ بھی بنے بیٹھے ہیں وہ آپ اساتذہ ہی کی بدولت ممکن ہو پایا ہے، مجھے بہت افسوس ہے کہ انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر آپ کو چالان ادا کرنا ہو گا کیونکہ بہرحال آپ سے غلطی ہوئی ہے مگر میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔“

زوبیہ قادری۔ کراچی

مشورہ

یورپ جب بلیک ایجز میں تھا تو دو پادری اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ بائبل کی روشنی میں گھوڑے کے منہ میں کتنے دانت ہوتے ہیں۔ ایک کہہ رہا تھا 32۔ دوسرا کہہ رہا تھا نہیں 30۔ قریب سے گزرنے والے ایک شخص نے کہا۔ ”بائبل کو چھوڑیے۔ گھوڑا موجود ہے منہ کھول کر اس کے دانت گن لیجیے۔“ دونوں پادریوں نے فوراً کہا کہ یہ شخص بائبل کا منکر ہے اور پھر اس جرم میں مشورہ دینے والے کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

مہوش اکرام۔ خانیوال

کیا ہے؟

ان دنوں رسم و رہِ شہر نگاراں کیا ہے
قاصدا قیمت گلگشت بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ مے خانہ ہے
آج کل صورت بربادیِ یاراں کیا ہے

شاطاہر۔ کراچی

باتوں سے خوشبو آئے.....!

☆ تم میں سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

☆ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ عقلمند ہمیشہ سوچ کر بولتا ہے اور بے وقوف ہمیشہ بول کر سوچتا ہے۔

☆ شرم وحیا انسان کا سب سے بڑا زیور ہے۔

☆ دنیا کی سب سے عظیم دعوت اذان ہے۔

☆ کم بولنے والا نہایت طاقت ور ہوتا ہے۔

☆ تین چیزیں انسانوں کو زندگی میں ایک بار ملتی ہیں، والدین، حسن، جوانی۔

☆ تین چیزیں انسان کو ذلیل کرتی ہیں۔ چوری، چغلی، جھوٹ۔

☆ تین چیزیں کوئی نہیں چرا سکتا۔ عقل، علم، ہنر۔

☆ بغیر دوست کے زندگی ایسی ہے جیسے صحرا میں بھٹکا ہوا ایک مسافر۔

☆ حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ دشمن سے ہمیشہ بچو اور دوست سے اس وقت بچو جب وہ تمہاری تعریفیں کرنے لگے۔

☆ مسکراہٹ گاڑی میں لگا ہوا وہ اسٹیئرنگ ہے جو غم کے دھچکے محسوس نہیں ہونے دیتا۔

☆ مانگ اس پاک ذات سے جو کسی کی محتاج نہیں۔

☆ یہ دنیا کم سے کم تر ہے اور اس کے عاشق ذلیل سے ذلیل تر ہیں۔

☆ اصل سے خطا نہیں کم نسل سے وفا نہیں۔

ثناء جویریہ۔ کراچی

کھا جاواں

ایک سردار اپنے دوست سے بولا۔ ”جدوں میری نویں نویں شادی ہوئی سی، میتوں تیری بھابی اینی چنگی لگدی سی کہ دل کردا سی اینوں کھا جاواں۔“

دوست بولا۔ ”تے ہن؟“

سردار۔ ”ہن سوچناں آں جے کھا ای جاندا تے چنگا سی۔“

فوزیہ۔ پتوکی

لوگ

☆ بڑے آدمی کی آمد پر چھوٹے لوگوں کے گھر تنگ نظر آتے ہیں اور چھوٹے آدمی کی آمد پر بڑے لوگوں کے دل۔

☆ بڑا آدمی گرے تو اسے زیادہ تکلیف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ چھوٹے آدمی کی نسبت زیادہ بلندی سے گرتا ہے۔

☆ کوئی آدمی اس وقت تک بڑا نہیں کہلاتا جب تک وہ کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

☆ قبرستان ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جن کا خیال تھا کہ دنیا کا ان کے بغیر گزارا

کیسے ہوگا۔

☆ عہدے لوگوں کو بڑا نہیں بناتے ہاں ان کے چھوٹے پن کو ضرور ظاہر کردیتے ہیں۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

جواب

ایک بار انور مسعود نے منیر نیازی سے کہا۔ ”انسانی جسم میں دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں کاٹیں تو لہو نہیں نکلتا۔“ منیر نیازی نے پوچھا۔ ”کون سی۔“ انور مسعود نے کہا۔ ”بال اور ناخن۔“ تھوڑی دیر سوچ کر منیر نیازی نے کہا۔ ”انور تو سادے پنڈ دا نائی نکلیں ویکھیا۔“ انور مسعود ہی بتائیں کہ ان کے رشتے داروں میں ایک بزرگ کی حس مزاح کمال کی ہے۔ ایک مرتبہ صبح ناشتے کے وقت بہو نے کہا۔ ”چاچا جی میں تمہارا انڈا بنادیاں۔“ یہ بزرگ بولے۔ ”نئیں پتر توں مینوں بندہ ای رہن دے۔“

مہ جبیں تاج۔ کراچی

اڑے ہی گراتے ہیں نشیمن پر بجلیاں“

آسٹریلیا کے جنگلات کی آتش زدگی سے متعلق طرح طرح کی خبریں سامنے آرہی ہیں۔ اسی حوالے سے ایک عرب ٹی وی نے دل چسپ خبر دی۔ ٹی وی کے مطابق، آسٹریلیا کے سائنس دانوں نے انکشاف کیا کہ آتش زدگی کی ایک بڑی وجہ چیل ہوسکتی ہے۔ یہ پرندہ جان بوجھ کر آگ پھیلانے کا سبب بنتا ہے۔ اس مقصد کے لیے چیل جلتی ہوئی کوئی چھوٹی سی چنگاری یا شاخ منہ میں دبا کر اسے جھاڑیوں وغیرہ میں پھینک دیتی ہے۔“ سڈنی یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے اس حرکت کا سبب یہ بتایا کہ ”دراصل زمین پر موجود اونچی جھاڑیاں اور درخت چیل کے اپنے شکار تک پہنچنے میں حائل ہوتے ہیں لہٰذا وہ ان چیزوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے جلا ڈالتی ہے۔“

واہبہ عدنان۔ سیالکوٹ

مراۃ العروس

1863ء میں نذیر احمد کان پور اور پھر گورکھ پور میں فرائض کی انجام دہی کے لیے متعین کیا گیا۔ ان ہی مصروفیات میں 1869ء کا سال آگیا۔ اب ان کی اولاد عمر کی اس منزل کو پہنچ چکی تھی کہ جہاں بہتر تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت پیش آتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو رائج کتب سے اطمینان نہ ہوا اور اپنے بچوں کے لیے خود ہی کتابیں تیار کیں۔ نتیجتاً بیٹے کے لیے ”چند پند“ اور بیٹی کے لیے ”مراۃ العروس“ نامی کتب سامنے آئیں۔ بچوں کو ان کی ورق گردانی میں خوب لطف محسوس ہوتا۔ ایک روز کچھ یوں ہوا کہ بیٹا بشیر باغ کی سیر کو گیا۔ ہاتھ میں کتاب بھی موجود تھی۔ باغ میں محکمہ تعلیم کا ڈائریکٹر جوائنگ ریز تھا، سیر کے لیے آیا ہوا تھا۔ بیٹے نے پہچان کر سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد نام پوچھا اور دریافت کیا کہ ”ہاتھ میں کتاب کون سی ہے؟“ بشیر نے نام بتایا کہ ”چند پند۔“ انگریز نے حیران ہو کر کہا کہ ”یہ کون سی کتاب ہے جو میری نظر سے نہیں گزری۔“ پھر دریافت کیا کہ ”مصنف کون ہے؟“ تو بیٹے نے باپ کا نام بتاتے ہوئے کہا کہ ”یہ کتاب صرف میرے لیے لکھی گئی ہے۔“ نیز یہ بھی بتایا کہ ”میری بہن کے لیے بھی ایک کتاب ”مرۃ العروس“ کے نام سے لکھی ہے۔“ ڈائریکٹر نے کہا کہ ”وہ کتاب بھی مجھے دکھاؤ۔“ بیٹے نے جواب دیا کہ ”وہ گھر سے لے کر آتا ہوں۔“ غرض ”مراۃ العروس“ بھی لائی گئی۔ پھر افسر نے بچے سے کہا کہ ”تم گھر جاؤ، کتابیں پہنچا دی جائیں گی۔“ بچہ گھر واپس آگیا۔ شام ڈھلے ڈپٹی نذیر احمد گھر آئے تو بیٹی نے شکایت کی کہ ”بھائی اپنی اور میری کتابیں کسی کو دے آیا ہے۔“ انہوں نے بیٹے سے پورا احوال دریافت کیا اور قدرے حیران بھی ہوئے کہ افسر صاحب کو بچوں کی کتب کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ اگلی صبح وہ خود افسر سے جا کر ملے تو اس نے کتابوں کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ یہ کتابیں تو ہر ایک کو پڑھنی چاہئیں۔ بہرحال ان کتب کی کئی نقول تیار ہوئیں۔ چند ہفتوں بعد اس افسر کا خط ڈپٹی نذیر احمد کے نام آیا، جس میں ”مراۃ العروس“ کے بارے میں بتایا گیا کہ ”صوبائی حکومت نے اس کتاب پر مصنف کو ایک ہزار روپے اور ایک گھڑی بہ طور تحفہ دینے کا اعلان کیا ہے۔“

اس اعلان کے بعد ”مراۃ العروس“ راتوں رات قریہ قریہ اور کوچہ کوچہ شہرت پا گئی۔ جسے دیکھو ”مراۃ العروس“ پڑھتا نظر آتا۔ یہ ناول دو بہنوں، اکبری اور اصغری کے جن کی شادیاں دو بھائیوں سے ہوئی تھی، قصے پر مشتمل تھا۔ اکبری تعلیم و تربیت اور تہذیب سے قطعاً نا آشنا اور بلا کی بدتمیز و پھوہڑ۔ اس کی سسرال میں کسی سے نہ بنی، جب کہ چھوٹی بہن اصغری نے اس کے برعکس طبیعت پائی تھی۔ انتہا درجے کی سلیقہ مند اور سمجھ دار۔ سسرال کیا گئی کہ اس کی کایا ہی پلٹ دی اور ہر کوئی اصغری کے گن گانے لگا۔ ”مراۃ العروس“ کی مقبولیت کا یہ عالم ہوگیا کہ اسے جہیز میں دیا جانے لگا۔

شاہین نفیس۔ کراچی

زندگی کا مفہوم.....!

☆ زندگی کے مفہوم کو سمجھنا بہت مشکل ہے بہت ہی مشکل اور جس کسی نے بھی اس کو سمجھ لیا اس نے زندگی کو پالیا۔

☆ زندگی دکھوں کی چادر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہے، زندگی سمندر ہے جس کی گہرائی کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔

☆ زندگی پھول ہے جس کے ساتھ کانٹے بھی لگے ہوئے ہیں۔ زندگی موسم ہے بادل کا جو کبھی تو پانی برساتا ہے اور کبھی برسائے بغیر لوٹ جاتا ہے۔

☆ زندگی نام ہے ان پتوں کا جو خزاں میں مرجھا جاتے ہیں اور بہار آنے سے یہ پھر سرسبز ہو جاتے ہیں۔

☆ زندگی نام ہے موجوں کا جو ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ جاتی ہیں۔

☆ زندگی گیت کی طرح ہے جس کی دھن روح کو مسرور کرتی ہے۔

☆ زندگی سورج کی طرح ہے جس کی کرنیں کبھی کبھی بادلوں میں چھپ جاتی ہیں۔

☆ زندگی سب کچھ ہے سب کچھ یہ وہ بھی ہے جو نظر نہیں آتی زندگی ہر چیز کا نام ہے جو اس دنیا میں موجود ہے ہر چیز میں زندگی کی جھلک موجود ہے۔

☆ زندگی دکھ بھی ہے اور سکھ بھی یہ دونوں سائے کی طرح انسان کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

☆.....

صدف سعد

ردا کی ڈائری

ثناء جویریہ کی ڈائری سے

اقبال عظیم کا عقیدت میں ڈوبا کلام

میں اندھیرے میں ہوں تنویر کہاں سے لاؤں
چشم بیدار کی تقدیر کہاں سے لاؤں
خواب میں روضہ اقدس کا نظارہ تو ہوا
لیکن اس خواب کی تعبیر کہاں سے لاؤں
کیسے سمجھاؤں تمہیں کیا تھے خدوخال حضور
پیکرِ نور کی تصویر کہاں سے لاؤں
اسوۂ پاکِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بیاں کیسے کروں
روح قرآن کی تفسیر کہاں سے لاؤں
توڑ لاؤں ستارے بھی فلک سے لیکن
لوحِ محفوظ کی تحریر کہاں سے لاؤں
اپنے افکار کو پابند سخن کیسے کروں
میں تو خود قید ہوں زنجیر کہاں سے لاؤں
نعت میری، مرے اشکوں کی زبانی سن لو
اس سے بہتر لب تقریر کہاں سے لاؤں

امیمہ ظہیر کی ڈائری سے

حفیظ جالندھری کا خوب صورت کلام

جھگڑا دانے پانے کا ہے دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں صیاد کے بس کی بات نہیں
تیرا پھولوں کا بستر بھی راہ گزر سیل میں ہے
آقا اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں
نوش ہے عنواں نیش نتیجہ ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے یہ انسانوں کا مور و مگس کی بات نہیں
یکارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں
تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

ایم جنید کی ڈائری سے

اقبال عظیم کا کلام

ان کو میری وفاؤں کا اقرار بھی نہیں
اور پوچھیے تو جرأت انکار بھی نہیں
میرے خلوص پر جو بھروسا نہ ہو تمہیں
مجھ کو تعلقات پہ اصرار بھی نہیں
گل کر دیے چراغ کسی نے تو کیا ہوا
اب روشنی سے ہم کو سروکار بھی نہیں
کام ان سے آ پڑا ہے مقدر کی بات ہے
ہم جن سے گفتگو کے روادار بھی نہیں
ان راستوں سے ہو کے گزر آئی زندگی
جن راستوں میں سایۂ دیوار بھی نہیں
ماضی بہت عزیز ہے اقبال کو مگر
وہ عہد رفتگاں کا عزادار بھی نہیں

فرزانہ شوکت کی ڈائری سے

وصی شاہ کی غزل

آنکھوں سے میری اس لیے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی
اب عمر نہ موسم نہ وہ رستے کہ وہ پلٹے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
مانگے تو اگر جان بھی ہنس کے تجھے دے دیں
تیری تو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی
آئے کوئی آ کر تیرے یہ درد سنبھالے
ہم سے تو یہ جاگیر سنبھالی نہیں جاتی
معلوم ہمیں بھی ہیں بہت تیرے قصے
ہر بات تیری ہم سے اچھالی نہیں جاتی
ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی
تم سے کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

خدیجہ نواز کی ڈائری سے

قتیل شفائی کی غزل

وفا کے شیش محل میں سجا لیا میں نے
وہ ایک دل جسے پتھر بنا لیا میں نے
یہ سوچ کر کہ نہ ہو تاک میں خوشی کوئی
غموں کی اوٹ میں خود کو چھپا لیا میں نے
کبھی نہ ختم کیا میں نے روشنی کا محاذ
اگر چراغ بجھا، دل جلا لیا میں نے
کسی کی آس تو مجھ کو رہی سو میں تڑپا
شب فراق بتا تیرا کیا لیا میں نے
کمال یہ ہے کہ دشمن پہ جو چلانا تھا
وہ تیر اپنے کلیجے پہ کھا لیا میں نے
قتیل جس کی عداوت میں ایک پیار بھی تھا
اس آدمی کو گلے سے لگا لیا میں نے

صبا [illegible] کی ڈائری سے

ساحر لدھیانوی کا کلام

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسل آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر
بم گھروں پر گریں کہ سرحدوں پر
روح تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے
ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی
اس لیے اے شریف انسانو
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سب ہی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

مدیحہ نور کی ڈائری سے

سلیم کوثر کی خوب صورت غزل

مجھے خبر تھی مرے بعد وہ بکھر جاتا
سو اس کو کس کے بھروسے چھوڑ کے جاتا
وہ کوئی نشہ نہیں تھا کہ ٹوٹتا مجھ میں
وہ سانحہ بھی نہیں تھا جو گزر جاتا
رکا ہوا تھا مرا سانس میرے سینے میں
اسے گلے نہ لگاتا تو گھٹ کے مر جاتا
شکستہ ہو گیا پندار آئینہ ورنہ
یقین کر میں تیرے عشق سے مکر جاتا
نہ جانے کتنے محاذوں پر جنگ تھی میری
بس ایک وعدہ نبھانے میں اپنے گھر جاتا

مہ جبین تاج کی ڈائری سے

منیر نیازی کی خوب صورت نظم

اے بادل جب بیل بنے تو
موتی کنٹھ کے پھولوں کی
جب آکاش پہ رنگت ہو تو

یمنہ کے بعد کے جھولوں کی
اے بادل جب بوند بنے تو
تالابوں کے پانی پر
خواہش سے بھی تنگ جگہ پر
وسعت کی ویرانی پر
اے بادل جب شکل بنے تو
آدمیوں کی بستی کی
اس کے کسی آباد مکان میں
میرے جیسی ہستی کی
اے بادل جب وقت بنے تو
تیری شام کوئی بھی ہو
میں پہچان سکوں گا تجھ کو
تیرا نام کوئی بھی ہو

پروین فضل احمد کی ڈائری سے

وصی شاہ کی غزل

میرے فراق کے لمحے شمار کرتے ہوئے
بکھر گئے ہیں تیرا انتظار کرتے ہوئے
میں مسکراتے ہوئے آئینے میں ابھروں گا
وہ رو پڑے گی اچانک سنگھار کرتے ہوئے
تجھے خبر ہی نہیں کوئی ٹوٹ گیا
محبتوں کو بہت پائیدار کرتے ہوئے
وہ کہہ رہے تھے سمندر نہیں آنکھوں میں
میں ان میں ڈوب گیا اعتبار کرتے ہوئے

عریشہ سہیل کی ڈائری سے

جمال احسانی کی خوبصورت غزل

بکھر گیا ہے جو موتی پرونے والا تھا
وہ ہو رہا ہے یہاں جو نہ ہونے والا تھا
اور اب یہ چاہتا ہوں کہ کوئی غم بٹائے میرا
میں اپنی مٹی کبھی آپ ڈھونے والا تھا
تیرے نہ آنے سے دل بھی نہیں دکھا شاید
وگرنہ کیا میں سرِ شام سونے والا تھا

ملا نہ تھا یہ بچھڑنے کا غم نہ تھا مجھ کو
جلا نہیں تھا مگر راکھ ہونے والا تھا
ہزار طرح کے تھے رنج پچھلے موسم میں
پر اتنا تھا کہ کوئی ساتھ رونے والا تھا

کوثر ناز کی ڈائری سے

اطہر نفیس کا کلام

مطمئن اتنا کہ رہتا ہوں ہجوم شہر میں
مضطرب ایسا کہ سائے سے بھی ڈر جاتا ہوں میں
کون سمجھے گا میری تنہائیوں کے کرب کو
پوچھنے والوں سے کترا کر گزر جاتا ہوں میں
کوئی ایسا ہے کہ مجھ کو زندہ کرلیتا ہے ہے پھر
چند لمحے ایسے آتے ہیں کہ مر جاتا ہوں میں
کیوں مرے دیوار و در کرتے ہیں مجھ سے کلام
کتنے ارمانوں سے یاروں، اب گھر جاتا ہوں میں
دن تو یوں کٹتا ہے جیسے کوئی دکھ مجھ کو نہیں
رات ہوتے ہوتے جانے کیوں بکھر جاتا ہوں میں
دور تک پھیلا ہوا دشت جنوں ہے اور آج
کوچہ جاناں سے پھر آشفتہ سر جاتا ہوں میں

فاطمہ حیدر کی ڈائری سے

وصی شاہ کی نظم

جتنی دعائیں آتی تھیں
سب مانگ لیں ہم نے
جتنے وظیفے یاد تھے سارے
کر بیٹھے ہیں
کئی طرح سے جی دیکھا ہے
کئی طرح سے مر بیٹھے ہیں
لیکن جاناں!
کسی بھی صورت
تم میرے ہو کر نہیں رہتے

......☆......

تسنیم شریف

اس ماہ میں

اس ماہ کے اقتباسات

بلاعنوان

ایک مرتبہ کسی کالج میں مشاعرہ تھا۔ منیر نیازی وہاں مدعو تھے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ نیازی صاحب جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی پائے کے جملہ باز بھی تھے۔ مشاعرے کے بعد شعرا کو لڑکے لڑکیوں نے گھیر لیا اور ان سے آٹوگراف لینے لگے۔ منیر نیازی کے گرد رش دیکھ کر ایک لڑکی ان کے پاس آئی اور آٹوگراف کی فرمائش کرتے ہوئے بولی۔

''آپ بھی شاعر ہیں؟''

اس پر نیازی صاحب نے گھور کر لڑکی کو دیکھا لیکن پھر یکدم چہرے پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ سجا کر بولے۔

''نہیں، میں قتیل شفائی آں!'' (نہیں میں قتیل شفائی ہوں)۔

بہت سال پہلے ایسا ''ملتا جلتا'' واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ میں یونیورسٹی کی کسی تقریب میں مدعو تھا۔ ایک خوب صورت سی لڑکی میرے پاس آئی اور بالکل اسی طرح آٹوگراف مانگتے ہوئے بولی کہ ''کیا آپ کالم نگار ہیں۔'' دل تو کیا کہ اپنا سر پیٹ لوں مگر پھر لڑکی کی شکل دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میرے چہرے کے تاثرات بھانپ کر بولی کہ ''آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اخبار نہیں پڑھتی، میں اظہار الحق صاحب کا ہر کالم پڑھتی ہوں بلکہ ان کے کالم اخبار سے کاٹ کر اپنی ڈائری میں لگا لیتی ہوں اور پھر ان میں استعمال کیے گئے مشکل الفاظ اور شعروں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں تاکہ میرا ذخیرہ الفاظ بڑھ سکے۔'' میں منیر نیازی کی طرح بذلہ سنج تو نہیں تھا کہ موقع کی مناسبت سے کوئی جملہ لڑھکا دیتا فقط اتنا کہا کہ ''بی بی اس عمر میں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں، اظہار صاحب پرانی نسل کے بابے ہیں۔ وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ آپ نسبتاً نوجوان کالم نگاروں کو پڑھا کریں جو آسان اور سیدھی اردو لکھتے ہیں۔'' اس پر وہ مہ جبیں خوشی سے چیخ کر بولی۔ ''بالکل ٹھیک کہا آپ نے اسی لیے آئی لو وصی شاہ!''

از: ذراہٹ کے

انتخاب: عثمان سعد۔ کراچی

لاپتا خوشبو

یہ خزاں کچھ لمبی ہو گئی لیکن اب اس کی رخصتی قریب ہے۔ اس رخصت ہوتی خزاں کی دھوپ میں کچھ دوست مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ اب کے بہار کیسی ہو گی اور میں انہیں شرارتی لہجے میں ڈرا رہا تھا کہ ہاں بہار تو آنے والی ہے لیکن یہ بہار خوشبو کے بغیر ہو گی، تمہیں پھول تو نظر آئیں گے لیکن ان میں خوشبو نہیں ملے گی۔ ایک دوست نے

کہا ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، ہماری خوشبو شہید ہو چکی۔ میں نے کہا کہ تمہاری خوشبو شہید نہیں ہوئی لاپتا ہو چکی ہے۔

از: تیر کمان

انتخاب: نادیہ ناز غوری

اس ماہ کی تیکھی باتیں

☆ آج کل کے دور میں جو شخص ادھار کے پیسے واپس کرے اسے گلے سے لگائیں اور اس کا منہ چوم لیں کیوں کہ آج کل ایسے انسان آنا بند ہو گئے ہیں۔

☆ کرونا وائرس چائنا کا ہے زیادہ دن نہیں چلے گا۔

☆ دوسرے ممالک: تم محنت کرو گے تو کامیاب ہو گے۔

پاکستان: تیرے دانتوں کے درمیان گیپ ہے تو بڑا پیسے والا ہوگا۔

☆ ہمارے ہاں دل لگانے کا مشورہ بہت ہی چھوٹی سی عمر میں دے دیا جاتا ہے کہ دل لگا کر پڑھو۔ بھلا دل لگانے کے بعد بھی کوئی پڑھ سکا ہے؟

☆ جس دن شوہر کی جیب میں رکھے پیسے محفوظ رہنے لگیں، سمجھ لینا پاکستان کرپشن سے پاک ہو گیا ہے۔

☆ اگر ساری پاکستانی لڑکیاں ایک ماہ تک رنگ گورا کرنے والی کریم نہ لگائیں تو اس رقم سے پاکستان کے سارے قرضے معاف ہو سکتے ہیں۔

☆ پاکستان کے جھنڈے میں سبز اور سفید رنگ دراصل ساگ اور مکھن کی ترجمانی کرتا ہے۔

☆ ہفتے ہفتے نہاتے نہیں اور نام پوچھو تو خوشبو۔

☆ کسی کو کھونے کا غم کیا ہوتا ہے یہ کل رات پتا چلا جب مونگ پھلی کا ایک ثابت دانہ چھلکوں میں گم ہو گیا۔

☆ بابا کہتے ہیں جہاں دال نہ گلے وہاں ساگ پکالو۔

ثناء عمران۔ کراچی

اندازِ بیاں اور......!

سچ ہے کہ دنیا میں انسان جس چیز کے بارے میں سب سے زیادہ باقاعدہ سوچتا ہے وہ کھانا ہے۔ یہ دنیا کا واحد کام ہے جو انسان ساری زندگی کرتا رہتا ہے مگر پھر بھی نہیں اکتاتا۔ اگر وہ اس کام سے اکتا جائے تو یقین کرلیں کہ وہ بیمار ہے یا عاشق۔ یعنی اس کی طبیعت خراب ہے یا نیت۔

کھانے کی وجہ سے تو خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیجا اور کھانے ہی نے یہ زمین جنت بنا رکھی ہے، اگر انسان نہ کھاتا تو وہ انسان ہی نہ ہوتا، فرشتہ ہوتا۔ کھانا اتنا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھی جن چیزوں کو انعام میں دینے کا وعدہ کیا ہے ان کے ذکر سے ہی بھوک چمک اٹھتی ہے۔

دنیا میں کھانا جمع کرنے کا سب سے بڑا برتن پیٹ ہے اگر خالی پیٹ ہو تو بھرے پیٹ والے یاد آتے ہیں۔ پیٹ بھرا ہو تو خالی پیٹ والے بھی یاد نہیں آتے۔ ہمارے ہاں جس کا کھانا دوسرے کھا جائیں اسے بھوکا نہیں کہتے بلکہ جو دوسرے کا کھانا کھا جائے اسے بھوکا کہتے ہیں۔ خالی پیٹ سوچتا اور بھرا پیٹ سوتا ہے۔ میرا دوست انوار کہتا ہے کہ میں نے کبھی کسی کے گھر کا نمک نہیں کھایا، اسی لیے دوسرے اسے نمک خوار کے بجائے خوار ہی سمجھتے ہیں۔

کھانا، کھانا بھی ایک ورزش ہے، یقین نہ آئے تو انوار کو کھاتا دیکھ لیں۔ شادی بیاہ پر تو کھانا کھانے کے ٹورنامنٹ بھی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مولوی اور پروہت کھانا یوں کھاتے ہیں جیسے آخری بار کھا رہے ہوں۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ وہ کھانا یوں کھاتے ہیں جیسے پہلی بار کھا رہے ہوں بلکہ وہ تو صرف اس چیز کو حرام کہتے ہیں جسے کھا نہ سکیں۔

دنیا میں بدقسمت شخص وہ ہوتا ہے جس کے پاس بھوک میں کھانا نہ ہو اور اس سے بھی بڑا بدقسمت وہ ہوتا ہے جس کے پاس کھانا ہو اور بھوک نہ ہو۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کا قطعہ

بچو یہ سبق آپ سے کل بھی سنوں گا
وہ آنکھ ہے نرگس کی جو ہرگز نہیں روتی
عنقا ہے وہ طائر کہ دکھائی نہیں دیتا
اردو وہ زباں ہے کہ جو نافذ نہیں ہوتی

موئل وسیم۔ کراچی

اس ماہ کی سیانی باتیں

ہر سیانا کہانی باز، داستاں گو۔ اک سیانا ملا، کہنے لگا تم تو مزے کر گئے۔ ہمیں دیکھو اسٹریٹ لائٹ میں پڑھتے تھے، ساری ساری رات موم بتی کی روشنی میں پڑھائی کی، کہا آپ دن کو کیوں نہیں پڑھتے تھے۔ راتوں کو اسٹریٹ لائٹوں، موم بتیوں میں دھکے کھانے سے بہتر دن میں پڑھ لیتے۔" یہ برا مان گئے۔ ایک اور سیانا ملا۔ کہنے لگا تم تو موجیں کر گئے، ہم سے پوچھو روز اسکول جانے سے پہلے ندی عبور کرتے تھے، سخت سردیوں میں روزانہ ٹھنڈے پانی کی ندی عبور کرنا، کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہوتا۔ پوچھا آپ سمیت کتنے بچے روزانہ ندی عبور کر کے اسکول جاتے تھے۔" بولے "ڈھائی سو بچے۔" کہا آپ کے اسکول میں کتنے ٹیچر تھے" بولے "ایک"۔ کہا "تم آپ ایک استاد کو ندی کے اس طرف بلا لیتے ڈھائی سو بچوں کی روزانہ سوئمنگ سے تو جان چھوٹ جاتی،" یہ سیانا بھی برا مان گیا۔

مریم نواز۔ کراچی

اس ماہ کا فلسفہ

خوشامد غلیظ ترین اخلاقیات میں سرفہرست ہے کہ خوشامد کرنے والا اپنے مخاطب کو ہی نہیں خود کو بھی فحش گالی سے نواز رہا ہوتا ہے۔ تصویری، تحریری، تقریری، چمچہ گیری ہمارے بے لگام، بے امان، بے سمت، بے امام معاشرے میں بہت گہری سرایت کر چکی ہیں کہ جہاں میرٹ مر جاتے ہیں وہاں ایسی ہی لعنتیں جنم لیتی ہیں۔

انتخاب: ایمل جنید۔ کراچی

وجہ

میں ترجمے کی وجہ سے انگلش میں فیل ہو گیا حالانکہ میں نے بالکل ٹھیک ترجمہ کیا تھا۔

☆ میرا مذاق مت اڑاؤ۔
ڈونٹ فلائی مائی جوکس۔
☆ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔
چینج دا اسکائی کلر ہاؤ ہاؤ۔
☆ کراچی کی سڑکوں پہ گولیاں چل رہی ہیں۔
ٹیبلٹس آر واکنگ آن دا سٹرکس آف کراچی۔
☆ وہ میری نواسی ہے۔
شی از مائی ایٹی نائن۔
☆ میں ایک عام آدمی ہوں۔
آئی ایم اے مینگو مین۔
☆ مجھے انگلش آتی ہے۔

انگلش کمس ٹومی۔

☆میرا تعلق ہری پور ہزارہ سے ہے۔
آئی بی لونگ ٹو گرین پور تھاؤزنڈ۔

اس ماہ کی خوب صورت بات

اردو کس طرح ہمارا وقت بچاتی ہے۔
انگریزی میں۔
آئی ایم سوری، آئی کانٹ ہیئر یو پرو پرلی
کین یو پلیز رپیٹ۔ وہاٹ از دا میٹر؟
جب کہ اردو میں ''ہیں.....!!''
اردو بولیں اپنا اور دوسروں کا وقت بچائیں۔
خدیجہ نواز۔ کراچی

اس ماہ کے شگوفے

سردار اپنے دوست کے ساتھ فلم دیکھ رہا تھا۔ فلم میں اچانک شیر نے اسکرین کی طرف دوڑ لگائی تو سردار جلدی سے اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔ سردار کے دوست نے کہا۔ ''بے وقوف کہاں بھاگے جارہے ہو، یہ تو صرف فلم ہے۔''
سردار لحہ بھر کے لیے رک کر بولا۔ ''مجھے بھی پتا ہے کہ یہ فلم ہے مگر شیر کو تو نہیں پتا وہ تو جانور ہے۔''

☆

ایک سردار جی کو درخت پر چڑھتے دیکھ کر ان کے دوست نے پوچھا۔ ''سردار جی درخت پر کیوں چڑھ رہے ہو؟'' سردار بولا۔ ''امرود کھانے۔'' دوست نے کہا۔ ''کردی نا سرداروں والی بات، یہ تو آم کا درخت ہے۔'' سردار جی بولے۔ ''کردی نا بے وقوفوں والی بات، میں امرود ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

☆

ایک سردار نے اپنے نوکر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''کل تم نے پودوں کو پانی کیوں نہیں دیا؟'' نوکر بولا۔ ''پانی کا کیا مطلب؟ کل تو پورے دن بارش ہوتی رہی۔''
سردار بولا۔ ''تو بے وقوف چھتری تان کر پانی دے دیتے۔''

☆

ایک سردار نے دوسرے سردار کا بچہ اغوا کرلیا اور ایک چٹ پر لکھا کہ میں نے تمہارا بچہ اغوا کر لیا، اب کل صبح تک پانچ لاکھ تاوان فلاں پل کے نیچے پہنچا دو۔ سردار نے یہ چٹ بچے کی فیس پر چسپاں کی اور بچے کو اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ گیا، اگلے دن سردار پل کے نیچے گیا تو وہاں ایک لفافے میں پانچ لاکھ روپے رکھے تھے اور ساتھ یہ رقعہ بھی، پیسے کا افسوس نہیں، افسوس تو یہ کہ ایک سردار نے سردار سے تاوان لیا۔

عائشہ مختار۔ حیدر آباد

اس ماہ کی غزل

کل رات قرض خواہوں کو مشکل سے ٹال کر
دفتر جو پہنچے سب نے دی تنخواہ کی خبر
تنخواہ لینے پہنچے تو بولا یہ کیشیئر
فی الحال کتنے پیسوں میں ہوجائے گی گزر
میں نے کہا کہ میرا تو جینا عذاب ہے
ہاتھوں سے قرض خواہوں کے مٹی خراب ہے
ہنس ہنس کے کیشیئر نے میری داستاں سنی
پھر یہ دیا جواب کہ اب چھوڑ شاعری
بنتے ہیں چار سو تیرے فی الحال چار رکھ
''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ''

بدیحہ حیدر۔ چونیاں

نورین ملک

ذرا پیار سے کہنا

کتاب

ہم آخری لوگ تھے
گھر سے چھپ کر
کالج سے نکل جاتے تھے
ڈھونڈنے پرانی کتاب کو
گندے نالے پر بنے اردو بازار میں
نایاب تھیں کتابیں
لاتے تھے ڈھونڈ کر اردو بازار سے
اباسے نظر بچا کر
چھپ کر پڑھتے تھے رات بھر

صائمہ محمود

غزل

مجھے گھر پر بلانا چاہتا ہے
مجھے وہ آزمانا چاہتا ہے
پریشاں ہے محبت سے وہ اپنی
زمانے سے چھپانا چاہتا ہے
اسے میری ضرورت پڑ گئی ہے
مجھے اپنا بنانا چاہتا ہے
زمانے سے نہ کرنا بات کوئی
زمانہ تو فسانہ چاہتا ہے
وہ میری ذات سے اکتا گیا ہے
بچھڑنے کا بہانہ چاہتا ہے
نئے موسم کی خواہش ہے اسے بھی
کوئی منظر سہانا چاہتا ہے

حکیم خان حکیم

غزل

راتوں میں دن کے خواب لیے بھاگتے رہے
سایہ شجر گلاب لیے بھاگتے رہے
پیڑوں کو کاٹتے ہوئے کھیتوں کو روندتے
ہم سبز انقلاب لیے بھاگتے رہے
گوشہ کوئی سکوں کا نہ خوابوں کا کنج ہے
صدیوں کا اضطراب لیے بھاگتے رہے
دل سے نہ بھاگ پائیں گے یہ جانتے ہوئے
زخموں کی وہ کتاب لیے بھاگتے رہے
وہ بھول بیٹھے آئے گا یوم حساب بھی
وہ خوف احتساب لیے بھاگتے رہے
لوٹا سکے نہ آپ تو ذروں کو بھی چمک
ہاتھوں میں آفتاب لیے بھاگتے رہے
اپنائیت کہیں نہ ملی ٹھہرتے کہاں
تنہائی کا عذاب لیے بھاگتے رہے

ایس امتیاز احمد

نظم

وطن کی
خاکِ اطہر
ایک بچہ
ننھا سا

کبھی مست
کبھی اداس ہوئے
منہ میں ڈال
رہا تھا کہ مٹی
میرے دیس کی اکسیر ہے

فیضان احمد فیضی

خدا میرا

کئی بار میں نے کوشش کی
کسی طرح سے وہ میری طرف متوجہ ہو
تو اس کو حال سناؤں میں ساری دنیا کا
میں اس سے شکوہ کروں اس کی بے نیازی کا
میں اس سے پوچھوں!
کہ کس بات پر خفا ہے تو اس سے کہوں!
کہ لگاتار بے رخی سے تیری
یہ تیرا گلشن رنگیں اجڑتا جاتا ہے
یہاں پر رنگ خزاں کا بکھرتا جاتا ہے
مگر وہ جھک کے دیکھتا ہی نہیں
نہ جانے کس لیے وہ مجھ سے بولتا ہی نہیں
مگر مجھے یقین ہے کہ!!
پالے گا جب بھی فرصت
سنے گا وہ بڑی شفقت سے ماجرا میرا
میرا خیال ہے ابھی مصروف ہے
خدا میرا، خدا میرا

فرزانہ شوکت

قطعہ

نہیں حیرت کی اس میں بات کوئی
کہ مطلب کی ہے یہ دنیا ہی ساری
بدل کر تم بھی رستہ چل دیے نا
تو کیا اتنی تھی بس چاہت تمہاری

سباس گل

جس طرح

حال بدلا نہ زندگی بدلی
تھک گئے ہم دعائیں کر کر کے
مر ہی جاؤ گے تم سنو گے اگر
جس طرح ہم جیے ہیں مر مر کے

راؤ تہذیب حسین تہذیب

نظم

میں سویا پڑا ہوں
اور
سوچ رہا ہوں
کہ
زندگی مجھ میں پڑی ہے
یا کہ
میں زندگی میں پڑا ہوں

محمد اسلم ملک

بھائی

بھائی بھائی کا نہیں ہے
کوئی کسی کا نہیں ہے
بہت برا دور ہے میاں
انہوں نے سچی بات کہی
میں ان سے ایک درخواست کی تھی
صرف اتنا کہا تھا
کہ میں بینک سے پرسنل لون لینا چاہتا ہوں
ریفرنس کے لیے ایک نام درکار ہے
انہوں نے پوری بات نہیں سنی
کہنے لگے
کسی کا اعتبار نہیں رہا
لوگ رشتے ناطے سب بھول جاتے ہیں
بہت برا دور ہے میاں

کوئی کسی کا نہیں
بھائی بھائی کا نہیں
میں وہاں سے اٹھ آیا
میرے ساتھ ناصر بھی تھا اس نے پوچھا
یہ صاحب تمہارے کون تھے
میں نے کہا بھائی

عامر نواز

نظم

ہاں! اب تم بھی
اپنے سارے وعدے
اور
ٹھنڈک پہنچانے والی باتوں کے ہمراہ
مجھے پیاسا ہی رکھو گے
یہ جذبے ہیں بھیگی ہوئی آواز
میرے ماتھے کو جتنی بار چھوئے گی
اس کی تپش بڑھ جائے گی
آہستہ آہستہ
میرے تن پر ہونے اور پھسلنے والی
یہ بارش
یہ آگ
جس کی ٹھنڈک
جس کی حدت
اب بھی تمہاری پوروں میں ہے
میرے شانوں پر سر رکھے
تم جو یوں آنکھیں موندے کچھ سوچتے ہو
اس لمحے اس چہرے پر
کیسی سیرابی، کیا آسودگی تیر رہی ہے
میں نادم ہوں
یہ کیفیت
تمہیں میرے لہجے اور میرے چہرے میں
کبھی نظر نہیں آئی
جان!
تمہیں شاید نہ خبر ہو
بعض محبتیں
اپنے بلڈ گروپ میں
''او منفی'' ہوتی ہیں!

سعدیہ جواد

بے بسی

وہ مصنف
جسے الجھن تھی
ادھوری کہانیوں سے
وہ پھولوں اور رنگوں کی
بات کرتا تھا
مگر سنا ہے
جب سے وہ اک ادھوری کہانی کا
کردار بنا ہے
تب سے
چپ ہے

سیدہ عروج فاطمہ

غزل

کوئی سکھ نہیں ملا بچھڑ جانے سے
کیسے کیسے غم ملے ہیں پھر زمانے سے
بدل نہیں سکتے ہم زندگی کا معیار بھی
کوئی خوشی نہیں ملی ہمیں اسے پانے سے
دامن میں اپنے آنسو ہی نمایاں ہیں
فائدہ کیا کسی کو پھر حال دل سنانے سے
نام اپنا کب آئے گا پھر سے بہاروں میں
کیا حاصل دامن میں یوں پھول سجانے سے
ناکام ہے زندگی مفلسی کے موڑ پہ جاوید

گوشہ آگہی — صادقہ محمود — ۶

سلسلے وار ناول

بانہوں کے حصار میں — [illegible] — ۱۰
میں مسیحا — ایمان علی — ۷۶
دل ہے آوارہ — عائشہ ذوالفقار — ۹۳
ہم ہار گئے جاناں — سیما شاہد — ۱۳۳
خوشبو ہے کہ تم ہو — سباس گل — ۱۷۶

افسانے

جشن وانت — [illegible] — ۳۸
مات — [illegible] — ۶۷
حرف شکایت [illegible] — [illegible] — ۸۹
[illegible] — [illegible] — ۱۰۸
سیاہ معاشرہ — [illegible] — ۱۳۳
پتھر کی لڑکی — [illegible] — ۱۴۰

مکمل ناول

تیری محبتوں میں رہتا ہے — عائشہ ذوالفقار — ۳۲
تیرے نام لکھ دی زندگی — [illegible] — ۱۱۶

مئی، جون 2020ء
جلد نمبر 25 شمارہ نمبر 6
قیمت 100 روپے

E-mail: monthlyreda0325@gmail.com

زرسالانہ [illegible]
1200 روپے

34535726

[illegible] صادقہ محمود نے [illegible] پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت [illegible] بلاک 2 ۔ پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ ۔ سوسائٹی کراچی

انتباہ:
[illegible]

مستقل سلسلے

ردائے جنت — صادقہ محمود — ۷
ردا کی ڈائری — صدف سعد — ۲۰۲
ذرا پھر سے کہنا — نورین ملک — ۲۰۹
خوشبو — تسنیم شریف — ۱۹۸
اس ماہ میں — تسنیم شریف — ۲۰۵
کچن — ثریا اقبال — ۲۳۱
سنگھار — شہلا مشتاق — ۲۲۵
اشعار — [illegible] — ۲۱۸
سندیسے — صادقہ محمود — ۲۱۳

گوشۂ آگہی — صائمہ محمود — ۶

سلسلے وار ناول

بانہوں کے حصار میں — قمرش شیخ — ۱۰
میں مسیحا — ایمان علی — ۷۶
دل ہے آوارہ — عائشہ ذوالفقار — ۹۳
ہم ہار گئے جاناں — سیما شاہد — ۱۲۳
خوشبو ہے کہ تم ہو — سباس گل — ۱۷۶

افسانے

جشنِ وائٹ — نجمی جمشید — ۳۸
مات — سدرہ چودھری — ۶۷
حرف شکایت ہے تمہارا منتظر — کنیز زہرہ — ۸۹
دہلتی شام — ثمارہ احمد — ۱۰۸
سیاہ معاشرہ — زرقا آسی — ۱۳۳
پتھر کی لڑکی — فرح انیس — ۱۶۰

مکمل ناول

تیری محبتوں میں رہتا ہے — عائشہ ذوالفقار — ۳۲
تیرے نام لکھ دی زندگی — امبر فاطمہ — ۱۱۶

مئی، جون 2020ء
جلد نمبر 25 شمارہ نمبر 6
قیمت 100 روپے

E-mail: monthlyreda0325@gmail.com

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
1200 روپے

34535726

مستقل سلسلے

ردائے جنت — صائمہ محمود — ۷
ردا کی ڈائری — صدف سعد — ۲۰۲
ذرا پھر سے کہنا — نورین ملک — ۲۰۹
خوشبو — تسنیم شریف — ۱۹۸
اس ماہ میں — تسنیم شریف — ۲۰۵
کچن — ثریا اقبال — ۲۳۱
سنگھار — شہلا مشتاق — ۲۲۵
اشعار — حورینہ — ۲۱۸
سندیسے — صائمہ محمود — ۲۱۳

اندھیرے ہی راس آئے ہیں چراغ جلانے سے
محمد اسلم جاوید

ان ماؤں کے نام جنہوں نے اپنے پیارے بچے دہشت گردی میں کھو دیئے

اک چڑیا کا بچہ
اپنے گھونسلے میں رہتا......!
دو دانے چاول، دو گھونٹ پانی پیتا
دیکھتا تھا روز ماں کو اڑتے
کہیں جاتے......!
سوچتا تھا میں کب نکلوں گا
نئی جگہ کب دیکھوں گا
ابھی کچھ کمزور تھا
ابھی ذرا ڈرتا تھا
ایک دن پروں نے اس کا ساتھ دیا
اڑ کر ٹہنی پر گرا
ماں قریب تھی اس نے بچے کو سنبھال لیا
اور
واپس گھونسلے میں ڈال دیا
روز بچہ دانے زیادہ کھانے لگا
لگتا ہے جان بنانے لگا!
اب وہ گھونسلے میں سو نہیں پاتا تھا
ماں کے پیچھے جانا چاہتا تھا
اک دن وہ اڑا
کبھی سنبھلا، کبھی گر پڑا
لیکن تھک کر بیٹھا نہیں
وہ تو ابھی ابھی جواں ہوا
اس کی منزل تو پورا آسمان تھا
اڑتا گیا، اڑتا گیا
رکنے کا نام نہ لیا
خوش تھا اور کچھ پر جوش تھا
اپنی دنیا میں یوں مگن تھا
دیکھا ہی نہیں شکاری کا نشانہ
اس طرح زمین پر گرا
ماں جب آئی لوٹ کر واپس
دیکھا بچہ کہیں نہیں تھا
تھک بیٹھی اور لگی رونے
آس پاس کی چڑیاں بولیں
کیا ہوا روتی کیوں ہو
چڑیا کے بچے کو اک دن اڑنا ہی تھا
ماں دکھ کی ماری بولی
میرا بچہ چھوٹا سا تھا
آسماں بڑا ہے کہاں میں دیکھوں
نیچے والوں سے امید کیا رکھوں
وہ تھک جائے گا گر جائے گا
انسان کے جب وہ ہاتھ آئے گا
میرے بچے کا کیا حشر ہوگا
میرے بچے کا کیا انجام ہوگا
ڈرتی ہوں میں انسان کے جنون سے
خوش ہوں گے میرے بچے کے لہو سے
وہ چھوٹا سا ہے نہیں جانتا بچنا
میرے دل کا ٹکڑا
اک چڑیا کا بچہ

کلام: فرح تحسین
پسند: سعدیہ جواد

......☆......

سندیسہ

فرح خرم ______ کراچی

پیاری صالحہ آپی! السلام علیکم۔ سب سے پہلے تو آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اپنے اس پیارے سے، چھوٹے سے گھر "ردا" میں جگہ دی، اور پھر اس کے بعد تمام ان بہنوں کا شکریہ جنہوں نے مجھے پسند کے قابل سمجھا۔ شازیہ مصطفیٰ کے لیے ڈھیروں دعائیں کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں (آمین) "ردا" کے اندر ان کی غیر حاضری پر ہم تہہ دل سے دعا گو ہیں۔ قمروش کے "علی شاہ" کے ظرف کو تو سرخ سلامی دینے کا دل چاہتا ہے، قمروش شہک کے تو ہاتھ سلامت رہیں اتنا بہترین انداز کہ دل ہی نہیں بھرتا ان کے ناولز کو پڑھنے سے۔ ایقان علی بھی زبردست جا رہی ہیں، افشاں علی کا مکمل ناول بھی قابل تعریف تھا۔ اس کے علاوہ اس ماہ "عائشہ ذوالفقار" بھی ٹاپ پر رہیں۔ مزہ تو تب آیا جب انیتا اختر اور شہلا گل کا ایک ہی نام کے افسانے کی دو الگ الگ رنگ دیکھے۔ مہرین، تسنیم، زرقا اور نظیر فاطمہ بھی زبردست تھیں، امبرین ناز تو میری فیورٹ ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ سب سلامت رہیں اور اسی طرح اچھی اچھی تحریروں سے ہماری روح کو تسکین دیتی رہیں، اور خاص کر دعا صالحہ آپی کے لیے جن کے دم سے "ردا" کی رونق ہے۔

ماہ نور نواز ______ کراچی

ردا ڈائجسٹ میں اس دفعہ ماڈل بہت خوب صورت لگی۔ اسے دیکھ کر احساس ہوا کہ بہار کا مہینہ آگیا ہے۔ "گوشۂ آگہی" اور "ردائے جنت" سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ قمروش کی کہانی بہت اچھی ہے، حورینہ سعد نے بھی اچھا لکھا، کزنز کی نوک جھونک پسند آئی۔ "تیری محبتوں میں رہنا ہے"۔ عائشہ ذوالفقار ویلڈن بہت اچھی کہانی لکھی۔ نظیر فاطمہ بھی اچھا موضوع لائیں۔ آج کل کراچی میں ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی حادثہ رونما ہو رہا ہے، کتنے ہی لوگ عمارتیں گرنے کے حادثے میں زخمی اور ہلاک ہوگئے۔ نظیر فاطمہ کی کہانی ایسے ہی لوگوں کی بے حسی اجاگر کرتی حالات حاضرہ کی سچی تصویر تھی۔ "میں مسیحا" بہت ہی خوب صورت کہانی، ایقان علی بہت ہی سلیقے سے لے کر کہانی کو آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس دفعہ مادر علمی کی جو تصویر کھینچی وہ سیدھی دل پر جا کر لگی۔ اپنا دور طالب علمی یاد آگیا۔ واہ...... کیا خوب صورت انداز بیاں ہے۔ ناولٹ زرقا بھٹی کا بھی اچھا تھا۔ واقعی لوگ دیکھنے میں کچھ ہوتے ہیں اور حقیقت میں کچھ اور۔ دل ہے آوارہ، عائشہ ذوالفقار کی کہانی ماہنامے کی جان ہے۔ کرداروں کا اتار چڑھاؤ اور مکالمے غضب کے ہیں۔ ویری ویری ویلڈن عائشہ، ہمارے لیے ایسے ہی کہانیاں لکھتی رہو، لبنیٰ جمشید غالباً نیا نام ہے اگر وہ واقعی نئی رائٹر ہیں تو بہت اچھا اسٹائل ہے لکھنے کا۔ مہرین کنول نے بھی دل کے معاملات کو اچھے سے اجاگر کیا۔ فرح خرم کی کہانی سب سے زبردست رہی۔ جنتی کہانی خوب صورت تھی اسکیچ بھی اتنا ہی پیارا تھا۔ بہت اچھی رومانٹک اسٹوری واقعی جو

جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھرتا ہے۔ ”سودا“ ثمر افضل نے بہت خوب صورت افسانہ لکھا۔ خوشبو میں احادیث کا انتخاب بہت عمدہ ہوتا ہے۔ حضرت لقمانؒ کی حکمت بہت اچھی تھی۔ پیارا پاکستان پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ ویلڈن ثنا عمران، اس دفعہ ردا کی ڈائری میں اساتذہ کا کلام پڑھنے کو ملا۔ اس دفعہ اس ماہ میں محمد فیصل گدی کا اقتباس رسالے کی جان رہا۔ وجاہت مسعود نے بہت خوب صورت باتیں بتائیں، زبردست۔ دلاور نگار کی غزل بھی اچھی لگی۔ ذرا پھر سے کہنا بہت مختصر تھا۔ سندیسے میں تمام دوستوں نے محبت بھرے سندیسے لکھے۔ اچھے لگے۔ افشاں علی کا سندیسہ بھی اچھا تھا اور یہ بات بھی اچھی لگی کہ وہ جلد دوبارہ ہمارے لیے لکھیں گی۔ ڈیئر افشاں ہم آپ کی تحریر کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اشعار میں فرزانہ شوکت، فرحانہ شیخ، لیہا رضوان، ملیحہ حیدر، ذاکرہ معروف، شاہین اختر کے اشعار پسند آئے۔ کچن میں کافی کی تمام تراکیب پسند آئیں۔ سنگھار بھی اچھا تھا۔

امیمہ ظہیر ــــــــ کراچی

ڈیئر صالحہ آپی! تسنیم آپی اور دیگر اسٹاف کو سلام۔ امید اور دعا ہے کہ خیریت سے ہوں گی۔ اس دفعہ تو موسم نے بڑا دھوکا دیا۔ جاتے جاتے سردیاں پھر سے لوٹ آئی ہیں۔ جب کہ ماڈل موسم سے بے نیاز پھولوں کے گہنے پہنے خوب صورت مسکراہٹ سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اس دفعہ الٹی طرف سے رسالہ پڑھنا شروع کیا۔ سنگھار واہ واہ...... بہت اچھی تراکیب وٹوٹکوں پر مشتمل تھا۔ ایسے مفید مشورے تھے جو غالباً ہر عمر کی خاتون اپلائی کر سکتی ہیں۔ کچن میں کیپو چینو پڑھ کر مزہ آگیا۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ لیجیے سردیاں گزر گئیں تب رداوالوں نے کافی کی تراکیب دی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان کی عقل پر ماتم کرتے، موسم سرما کے لوٹ آنے نے زبان بندی پر مجبور کر دیا۔ اشعار میں اپنا شعر شامل دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اس دفعہ اشعار زیادہ تر مشہور شعرا کے کلام پر مبنی تھا۔ بہت ہی اچھا لگا، خاص طور پر حسن مجیب بھائی کا شعر

زندہ لوگوں کی بود و باش میں ہیں
مردہ لوگوں کی عادتیں باقی

یہ شعر لکھتے ہوئے غالباً منیر نیازی صاحب بھول گئے کہ زندہ لوگ اب زندہ ہی کہاں ہیں۔ مہنگائی نے ان سے دو وقت کا نوالہ بھی چھین لیا ہے۔ بود و باش تو بہت دور کی بات ہے اب تو زندہ لوگ مردوں ہی جیسے ہیں ہاہاہا، پیاری اپیا آپ نے میرا پورا خط شائع کیا وہ بھی بغیر کاٹ چھانٹ کے آپ کی اس مہربانی سے سیروں خون بڑھ گیا۔ باقی دوستوں سے بھی درخواست ہے کہ سندیسے کی محفل میں شامل ہوں۔ سباس گل کی نظم نے دل موہ لیا۔ سباس آپ ہمارے لیے کوئی افسانہ بھی تو لکھیں۔ اس ماہ میں اس ماہ کا نمک پارے پڑھ کر بہت مزا آیا۔ فرزانہ شوکت کا فلسفہ بھی دل پر بھی ٹھاہ کر کے لگا۔ سب سے بہترین اقتباس ”مائیں“ تھا۔ واہ زبردست اتنی خوب صورت باتیں تھیں کہ تعریف کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ ساغر صدیقی اور اختر شیرانی کی غزلیں ڈائری کی جان رہیں۔ خوشبو میں احادیث سے اپنی دینی معلومات میں اضافہ کیا۔ ”کالے قول“ غالباً حسن نثار صاحب کی کتاب ہے اور اس سے اقوال لیے گئے تھے۔ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئے۔ فرزانہ شوکت کی ”غلط فہمی“ بھی اچھی لگی۔ فرزانہ ہمیشہ بہترین انتخاب بھیجتی ہیں۔ خواہ ڈائری ہو یا فلسفہ، ایس امتیاز نے بھی معلومات میں اضافہ کیا۔ معذرت چاہتی ہوں کہ اس دفعہ مصروفیت کے سبب کہانیاں نہ پڑھ سکی۔ اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ خط اس لیے جلدی لکھا کہ کہیں شائع ہونے سے رہ نہ جائے، ڈیئر آپی ہم تو پوری کوشش

کرتے ہیں کہ آپ کو بارہ تاریخ تک خط لکھ دیں مگر وہ شاعر نے کہا ہے نا کہ ”اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا“ تو بس دنیا داری کے ان جھمیلوں میں پڑ کر فرصت نہیں ملتی۔ انشاءاللہ اگلی دفعہ پورا پرچا پڑھ کر تفصیلی تبصرہ کروں گی۔ تب تک کے لیے اجازت دیں۔ خوش رہیں خوش رکھیں۔

تمثیلہ ــــــــ کراچی

سب سے پہلے ٹائٹل دیکھا۔ بہت پیارا لگا۔ دیکھ کر میں فریش ہو گئی۔ اتنا خوب صورت گجروں سے گندھا، ماڈل بھی پیاری تھی۔ سب سے پہلے ناول تیری بانہوں کے حصار میں پڑھا۔ بہت زبردست آخری قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ امید ہے قمروش ہیپی اینڈ لکھیں گی۔ میں مسیحا بہت زبردست جا رہا ہے۔ دیکھتے ہیں عائشہ کی جوڑی کس کے ساتھ بنے گی۔ اس دفعہ درس گاہ کے تعارف نے دل موہ لیا۔ اب بات ہو جائے دوسرے زبردست سپر ہٹ ناول کی یعنی دل ہے آوارہ کی، لگتا ہے عارب چودھری کا کیا دھرا اس کے سامنے آنے والا ہے، لیکن بے چاری عروج کا کیا قصور تھا۔ عینیہ کی بے حسی پر سخت غصہ آیا۔ عشوہ بھی بے حسی کے سارے ریکارڈ توڑ رہی ہے، مائیں تو اولاد کے لیے نجانے کیا سہتی ہیں، کیسے کیسے سمجھوتے کرتی ہیں اور ایک عشوہ بی بی ہیں کہ عکرمہ کو کسی طور پر بخشنے کی روادار نہیں۔ دیکھتے ہیں عشوہ کی اس ہٹ دھرمی کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ لگتا ہے شازیہ مصطفیٰ تو ہمیں بھول ہی گئیں۔ حورینہ سعد نے شادی کے گھرانے کا اچھا نقشہ کھینچا۔ سیدہ عروج فاطمہ کی تحریر دل ہی تو ہے صفحات پر موجود تھی لیکن فہرست سے غائب (نادانستگی میں ہونے والی اس غلطی پر ایڈیٹر کو سرزنش کر دی گئی ہے) بہت اچھا افسانہ تھا۔ واقعی دنیا والوں کو کسی پل چین نہیں۔ آج کل چینلو پر کراچی میں گرنے والی عمارتوں اور اس میں زخمی اور ہلاک ہونے والوں کی خبریں تواتر سے آ رہی ہیں، نظیر فاطمہ نے بھی اسی موضوع پر قلم اٹھایا۔ لوگوں کو دوسروں کی تکلیف اور نقصان کا اس وقت تک احساس نہیں ہوتا جب تک کہ وہ حادثہ یا سانحہ خود ان کے ساتھ نہ ہو، جو لوگ دوسروں کے نقصانات کی پروا نہیں کرتے پھر قدرت کی طرف سے انہیں ایسی ہی سزا ملتی ہے۔ ”عشق پیچاں کے سائے“ لبنیٰ کی اچھی کاوش تھی۔ ثمر افضل نے بھی بہت اچھا لکھا۔ اب آپ دونوں غائب مت ہو جائیے گا۔ مہرین کنول موضوع کی مناسبت سے ایک خوب صورت افسانہ لے کر آئیں۔ اب آتے ہیں ناولٹ کی طرف۔ زرقا بھٹی کے ناول کی اٹھان بہت اچھی تھی۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ ہیرو ہیروئن کی شادی ہو جائے گی لیکن انجام بالکل خلاف توقع ہوا۔ ایسے انجام کی امید نہیں تھی۔ اب زرقا بھٹی کوئی پیارا زبردست سا ناولٹ لے کر دوبارہ حاضر ہوں۔ مکمل ناول میں عائشہ ذوالفقار اور فرح خرم دونوں انعام کی حقدار قرار پائیں۔ دونوں نے ہی محبت کے موضوع پر لکھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے۔ بہت خوب صورت جملے اور سچویشنز سے سجے دونوں ناول بہت پسند آئے۔ آپی اب آپ فرح خرم سے کوئی سلسلے وار ناول بھی لکھوائیں۔ خوشبو میں احادیث سے اپنے ایمان میں اضافہ کیا۔ کالے قول بہت اچھے لگے، فرزانہ شوکت کی چھوٹی سی بات میں بڑا سبق پنہاں تھا۔ پیارا پاکستان پڑھ کر ثنا عمران پر بہت پیار آیا۔ جویریہ قادری کے لطائف نے بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا۔ فرزانہ شوکت اور امیمہ ظہیر کی ڈائری اچھی لگی۔ اور فرزانہ کی غزل کے تو کیا ہی کہنے واہ واہ......اس دفعہ اقتباس ”مائیں“ بہت بہترین تھا۔ ذرا پھر سے کہنا میں سب سے اچھی سباس گل کی نظم تھی۔ ملک جواد اور تہذیب راؤ کی کاوش بھی اچھی لگی۔ اس دفعہ اشعار کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ حورینہ نے اس دفعہ بہت سارے نئے لکھنے والوں کو جگہ دی۔ بہت خوب

صورت الفاظ سے سجے اشعار دل میں اتر گئے خاص طور پر اسما جمشید ڈی آئی خان کا شعر بہت اچھا تھا۔ سندیسے کی محفل میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ افشاں علی ہمارے لیے جلد ہی ناول لے کر آئیں گی۔ افشاں آپی اب زیادہ انتظار مت کرایئے گا۔ کچن چونکہ امی کا شعبہ ہے اس لیے اسے امی کے لیے ہی رہنے دیا۔ اور سنگھار سے بھی دل چسپی نہیں۔ خط کچھ زیادہ ہی تفصیلی ہو گیا۔ امید ہے سب دوستوں کو پسند آئے گا۔ میری طرف سے صالحہ میم، تسنیم آپی اور دیگر اسٹاف کے لیے دعائیں۔ اللہ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

تبسم ناز ــــ بہاولپور

ردا سے تعلق چھ سال پرانا ہے۔ خط لکھنے کی ایک بڑی وجہ قمروش شہک کا ناول ہے۔ یہ پڑھ کر کہ اگلی دفعہ آخری قسط ہوگی بے چینی سے اپریل کے پرچے کا انتظار ہے، خط لکھنے کی دوسری بڑی وجہ ''میں مسیحا'' ہے۔ ایقان علی کا لکھنے اسٹائل کبھی کبھی دوسری رائٹرز سے ملتا جلتا لگتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہیں وہ لوگ ایقان علی کی بہن یا کزنز وغیرہ تو نہیں آپی ضرور بتایئے گا۔ اس دفعہ ایقان علی نے دل موہ لینے والی قسط لکھی۔ الفاظ کا انتخاب بہترین تھا۔ دل ہے آوارہ اس دفعہ بھی بازی لے گیا۔ لگتا ہے عارب چودھری کے برے دن آنے والے ہیں۔ اس دفعہ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ زرقا بھٹی نے بھی اچھا ناولٹ لکھا۔ لبنیٰ جمشید اور ثمر افضل کے افسانے پڑھے۔ آپی کیا یہ دونوں نئی رائٹرز ہیں کیونکہ اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں پڑھا۔ نظیر فاطمہ کا نقصان جیسی کرنی ویسی بھرنی کا عکاس تھا۔ مہرین کنول نے چھوٹے سے افسانے میں بڑی بات بیان کی کہ آخر دل ہی تو ہے۔ سیدہ عروج فاطمہ بھی اچھا لکھتی ہیں۔ ''کوئی مل گیا'' شادی سے شروع ہو کر شادی پر ختم ہوا۔ ردا کا ہر سلسلہ اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ گوشہ آگہی سے لے کر سنگھار تک سارے سلسلے بہترین ہیں۔ اس دفعہ ذرا پھر سے کہنا بہت مختصر تھا۔ آپی نئے شعراء کو پلیز زیادہ جگہ دیا کریں ایک صرف آپ ہی کا تو پرچا ہے جو نئے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے خواہ وہ رائٹر ہو یا نیا شاعر۔ تو اس لیے پلیز سب کو جگہ دیا کریں۔ ردائے جنت پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتوں سے مزین تھا۔ اللہ پاک ہم سب کو دین پر چلنے والا بنائے آمین۔

نسیم اختر ــــ برنس روڈ

پیاری صالحہ آپی، تسنیم آپی اور دیگر اسٹاف کو سلام اور دعائیں۔ امید ہے آپ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ کافی عرصے بعد دوبارہ انٹری دی ہے۔ امید ہے خوش آمدید کہیں گی۔ تمام سلسلے وار ناولز کی رائٹرز کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ قمروش، ایقان علی اور عائشہ ذوالفقار تینوں کمال کا لکھ رہی ہیں۔ شازیہ مصطفیٰ کی بے حد کمی محسوس ہوئی۔ فرح خرم نے آخری قسط بہت اچھی تحریر کی۔ بہت خوب صورت انجام لکھا مگر انہیں جہانگیر جیسے خبیث آدمی کو بھی سزا دینی چاہیے تھی۔ اس دفعہ تمام افسانے کوئی نہ کوئی پیغام دیتے نظر آئے۔ نئے نئے نام بھی موجود تھے۔ قمروش آپی کہانی کو بہت خوب صورتی سے انجام تک لائیں۔ ایقان آپی کی کہانی لگتا ہے ابھی بہت آگے تک جائے گی۔ زرقا بھٹی واقعی دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں بلکہ زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ، یہاں تو ایسے دین دار لوگ بھی ہیں جو ظاہری طور پر دین داروں کا سا حلیہ رکھتے ہیں۔ نماز، روزہ بھی کرتے ہیں مگر نہ دل کی حفاظت کرتے ہیں نہ نظر کی۔ اللہ ایسے منافقوں سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ تمام سلسلے اچھے تھے۔ غرض اس دفعہ کا پورا شمارہ پسند آیا۔

حفصہ نذیر ــــ خانیوال

ردا کے تمام قارئین اسٹاف اور صالحہ میم کو سلام۔

اس دفعہ سرورق دل کش تھا۔ گوشہ آگہی نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ردائے جنت ہمیشہ کی طرح روشنی بکھیر رہا تھا۔ دل ہے آوارہ ہم سب گھر والوں کا فیورٹ ناول ہے۔ پڑھ کر اس کے تمام کرداروں کو ڈسکس کرتے ہیں۔ عائشہ کے ہر کردار کا نام ''ع'' سے شروع ہے، پیاری عائشہ یہ ''ع'' والے نام ڈھونڈنے میں آپ کو کتنی محنت کرنا پڑی ہو گی نا...... ہاہاہا۔ مذاق کر رہی ہوں۔ پھر پڑھا بانہوں کے حصار میں آخر سالار صاحب کو عقل آ ہی گئی امید ہے آخری قسط میں بازغہ بی بی کو بھی عقل آ ہی جائے گی۔ بے چارے علی شاہ کے صبر کا اور کتنا امتحان لے گی یہ۔ افسانے سارے کے سارے اچھے تھے۔ سب سے اچھا ''سودا'' لگا۔ مہرین کنول اور عروج فاطمہ کی تحریروں میں اب کافی پختگی آ گئی ہے۔ امید ہے ہمارے لیے اسی طرح تفریح کا سامان مہیا کرتی رہیں گی۔ دو نئے نام لبنیٰ جمشید اور ثمر افضل۔ یقیناً ردا کا اثاثہ ثابت ہوں گے۔ صالحہ میم! شہلا گل سے کہیں وہ ہمارے لیے کوئی اچھا سا ناول لکھیں۔ میں ان کی بہت بڑی فین ہوں۔ حورینہ سعد کی تحریر ہلکی پھلکی تھی۔ شادی کا ہنگامہ، لڑکے، لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ مزا دے گئی۔ ایقان علی اتنا مختصر کیوں لکھتی ہیں؟ اس دفعہ عائشہ کی قسط بھی بہت چھوٹی تھی۔ ہم پورے مہینے انتظار کرتے ہیں کچھ اس کا ہی خیال کریں۔ زرقا بھٹی کا ناولٹ اچھا تھا۔ واقعی جو نظر آتا ہے وہ سچ نہیں ہوتا حقیقت کبھی کبھی توقع کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ فرح خرم نے بڑی پختہ تحریر لکھی۔ امید ہے اب کسی اور نئی تحریر کے ساتھ آئیں گی۔ عائشہ ذوالفقار کا مکمل ناول بھی دل کو چھو گیا۔ اب آتے ہیں سلسلوں کی طرف۔ گوشہ آگہی سے ہوتے ہوئے ردائے جنت کی طرف بڑھے اور اپنی دینی معلومات میں اضافہ کیا۔ صالحہ میم اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔ خوشبو میں ایس امتیاز احمد کے اقوال اچھے تھے۔ ڈائری میں فرزانہ شوکت کا انتخاب ہمیشہ کی طرح اے ون تھا۔ یہ ایس امتیاز ڈائری کیوں نہیں بھیجتے؟ شبنم رومانی اور سحر انصاری کا کلام پسند آیا۔ اس ماہ میں اس ماہ کے نمک پارے بہترین تھے۔ ثناء جوہر ہمیشہ اچھا انتخاب بھیجتی ہیں۔ عثمان سعد کی منتخب کردہ غزل پڑھ کر بھی مزا آیا۔ اس دفعہ ذرا پھر سے کہنا اتنا مختصر؟ ڈیئر میم زیادہ لوگوں کو جگہ دیا کریں۔ ملک جواد نواز، سباس گل اور راؤ تہذیب حسن تہذیب کا کلام بہت پسند آیا۔ سندیسے کی محفل میں خوب رونق تھی۔ بھئی پرانے لکھنے والے سب کہاں چلے گئے۔ واپس آجائیں کسی کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ افشاں علی اور سیدہ عروج فاطمہ کے خطوط دیکھ کر دل میں خواہش جاگی کہ دیگر رائٹرز بھی اس محفل کو رونق بخشیں تاکہ ہم اپنے پیارے ردا کے بارے میں ان کے قیمتی خیالات بھی جان سکیں۔ اشعار میں نادیہ ناز غوری، اسما جمشید، مدیحہ حیدر، عانیہ نیازی اور ہالہ اسلم کے اشعار پسند آئے۔ کچن میں کافی کے ساتھ کیک کا کمبی نیشن اچھا لگا۔ اس دفعہ سنگھار بہت عمدہ تھا۔ جلد کے حوالے سے جو ٹپس بتائی گئیں وہ بے حد کارآمد تھیں۔ اسی طرح کا سنگھار دیا کیجیے تاکہ ہم گھر بیٹھے اپنی جلد کے مسائل یا اور سنگھار سے متعلق جو مسائل ہیں وہ حل کر لیں۔ کبھی میک اپ کرنے کا پورا طریقہ بھی ضرور دیں، اور بہت ساری خواتین جو گاؤں یا دور دراز کے علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے ہربل پروڈکٹ بھی بتایا کریں کیوں کہ ہم شہر میں رہنے والوں کو تو بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں مگر گاؤں کی لڑکیوں کے لیے پرابلم ہوتی ہے۔ دوسرے مہنگائی بھی بہت ہو گئی ہے تو ایسی چیزیں بھی بتائیں جو سستی بھی ہوں اور ہم آسانی سے خرید بھی سکیں۔ اسی کے ساتھ اجازت دیں۔ میری طرف سے ردا سے جڑے ہر فرد کے لیے دعائیں۔ خدا حافظ۔

☆

حورینہ سعد

اشعار

ملیحہ ناظر ——— حیدر آباد

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

افشاں علی ——— گجرات

کیسے کہہ دوں کہ ملاقات نہیں ہوتی ہے
ملتے رہتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی ہے

فاطمہ صدف ——— پتوکی

اب گفتگو میں بیچ سے غائب ہے آدمی
ہم تک تو آتے آتے روایت بدل گئی

خدیجہ نواز ——— کراچی

ابھی تو آئے ہو بیٹھو ذرا چلے جانا
لگے گی دیر تمہیں حال دل سنانے میں

عابدہ گل ——— کراچی

فکر دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں
ذکر مرغان گرفتار کروں یا نہ کروں
قصۂ سازش اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یار طرح دار کروں یا نہ کروں

مریم ——— لاڑکانہ

ہوتا اگر پہاڑ تو لاتا نہ تاب غم
جو رنج اس نگر میں یہ دل ہنس کے سہہ گیا

جمیلہ یونس ——— بہاول پور

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
ڈھونڈا تھا جن کو آسماں نے خاک چھان کے

تزئین نبیل ——— امریکا

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

مہ جبیں تاج ——— کراچی

دوسروں پر اگر تبصرہ کیجیے
سامنے آئینہ رکھ لیا کیجیے

شہلا سحر ——— کھاریاں

مختصر وقت میں یہ بات نہیں ہو سکتی
درد اتنے ہیں خلاصے میں نہیں آئیں گے

مریم نواز ——— کراچی

پرانے سال کی ٹھٹھری ہوئی پرچھائیاں سمٹیں
نئے دن کا نیا سورج افق پہ اٹھتا آتا ہے

نگہت اکرام ——— سیالکوٹ

کون سی رات زمانے میں گئی جس میں میر
سینہ چاک سے میں دست و گریباں نہ ہوا

ماہ نور نواز ——— کراچی

کس گلی میں رک گیا سچ کا جلوس
سر پھروں کے اونچے پرچم کیا ہوئے

حسن مجیب ——— کراچی

ہمارے درمیان عہد شب مہتاب زندہ ہے
ہوا چپکے سے کہتی ہے ابھی اک خواب زندہ ہے

سنبل ——— حافظ آباد

مر مر کے کٹی زندگانی
کہنے کو تو عمر بھر جیے ہم

امیمہ ظہیر ——— کراچی

چہار سمت سے اب کائنات جنگل کو
یہی قبیلہ کسی وقت پوجتا تھا درخت
نہ کر سکا وہ مسافر کا دل سے استقبال
خود اپنی چھاؤں سے محروم ہو چکا تھا درخت

نبیلہ حسین ——— چونیاں

میری قسمت میں اگر غم اتنے تھے
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

سارہ ملک ——— لودھراں

خط لکھیں گے مطلب چاہے کچھ بھی نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

سیدہ عروج فاطمہ ——— ملتان

شک کی آندھی سے پھول محبت کے مرجھا جاتے ہیں
یہ تم نے ہی کہا تھا کہو کیا یاد ہے تم کو؟

فرزانہ شوکت ——— کراچی

ہم تسلیم کرتے ہیں ہمیں فرصت نہیں ملتی
مگر جب یاد کرتے ہیں زمانہ بھول جاتے ہیں

شعبان ——— کھاریاں

کب دو گے ہمیں اذن رہائی کی بشارت محسن
کب ہوں گے رہا تیرے گرفتار مخالف

ملک عامر نواز ——— کھاریاں

غم ہستی کی زنجیروں سے انسان کو کہاں فرصت
کبھی حالات ظالم ہیں کبھی تدبیر ظالم ہے

حسنین افضل صراف ——— کھاریاں

غربت کا دے رہے ہیں طعنہ وہ لوگ
جو ہم کو بیچ کر امیر ہو گئے

گلنار ابراہیم ——— جلالپور پیروالا

ایک زندگی تھی جسے جینے نکلے تھے
پھر روز مرے ہیں اس جینے کی خواہش میں

زرینا خان ——— مانسہرہ

انا بضد ہے کہ روٹھنے والے کو جانے دو
کوئی اندر سے کہتا ہے منا لیتے تو اچھا تھا

نادیہ رئیس ——— کراچی

بادشاہ گر کا گدا گر ہوں یہی کافی ہے
مجھ کو شاہوں کا ثنا خواں نہ بنایا جائے

پروین فضل ——— بہاولپور

سوچتا ہوں کہ غریبوں پہ ہی کیوں لازم ہے
زندہ رہتے ہوئے مرنے کی ریاضت کرنا
کاش ارباب سیاست کو نظر آ جائے
کھردرے ہاتھ سے مزدور کا محنت کرنا

شازیہ قاسم ——— میر پور خاص

ایک لمحے میں کٹا ہے مدتوں کا فاصلہ
میں ابھی آیا ہوں تصویریں پرانی دیکھ کر

مہ جبین ——— کراچی

میں عمر بھر نہیں رویا مگر ہنسا بھی نہیں
یہ دل کسی کا نہیں تھا مگر کسی کا رہا

مریم ناز ——— مانسہرہ

تاراج کر گیا، فصل بہار کو
موسم کی چار دن بھی گلوں سے بنی نہیں

رخ تاج حیدر ——— کراچی

کچھ جہد مسلسل سے تھکاوٹ نہیں لازم
انساں کو تھکا دیتا ہے سوچوں کا سفر بھی

فرخ ندیم ——— گجرات

شاید کسی لکیر میں لکھا ہو میرا نام
اے دوست اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے تو دے

یمنیٰ نور ——— حیدر آباد

آنکھوں سے نیند چھیننے والوں کو کیا خبر
کیسے گزارتا ہوں میں شب انتظار کی

شبانہ کوثر ــــــــ کہروڑپکا

تھک گیا ہے دل وحشی میری فریاد سے بھی
جی بہلتا نہیں اے دوست تیری یاد سے بھی
اے ہوا کیا ہوا جواب نظم چمن اور ہوا
صید سے بھی ہیں مراسم تیرے صیاد سے بھی

مصباح فضل ــــــــ کراچی

اے اجل ایک دن آخر کو تجھے آنا ہے
آج آتی شب فرصت میں تو احسان ہوتا

نازیہ افضل ــــــــ کراچی

اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے
جالب چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

نورین دیبا ــــــــ گجرات

اداس تھے سو تیرے در پر آ کر بیٹھ گئے
فقیر ہیں سو چلیں جائیں گے صدا کر کے

لاریب نور ــــــــ کراچی

مجھے احساس ہے سب کا میں سب کے کام آتا ہوں
مگر جو کینہ رکھتے ہیں میں ان رشتوں سے ڈرتا ہوں

عظمیٰ بشیر ــــــــ لاہور

ہوا کے لہجے میں سدا پیار کے جگنو چمکیں
تیرے ہونٹوں پر سدا دھیمی سی مسکان رہے

وقاص گل ــــــــ حافظ آباد

جو آنے والے ہیں موسم انہیں شمار میں رکھ
جو دن گزر گئے ان کو گنا نہیں کرتے
نہ دیکھا جان کر اس نے کوئی سبب ہوگا
اسی خیال سے ہم دل برا نہیں کرتے

انعم بروہی ــــــــ کوئٹہ

اک خوشبو کے روٹھ جانے سے
جہاں میں کچھ بھی باقی نہ رہا

اقراء رشید ــــــــ حیدرآباد

دشمنی رسم جہاں ہے، دوستی حرف غلط
آدمی تنہا کھڑا ہے ظالموں کے سامنے

ندا گلناز ــــــــ سرانوالی

زخم کھانے کی آرزو تھی ہمیں
آپ سے رسم و راہ کر بیٹھے

سعد لیاقت ــــــــ سرگودھا

بھر جائے گا یہ زخم بھی کیونکر فکرمند ہو
گہرا تو ہے ضرور مگر زخم ہی تو ہے

رمشا ملک ــــــــ تلہ گنگ

ہے یہ سچ کہ تیرے سامنے مجھے برسوں
کوئی رفیق کوئی کام بھی نہ یاد آیا
نہیں یہ جھوٹ بھی کہ کل جو تجھے میں نے دیکھا
تو کتنی دیر تیرا نام بھی نہ یاد آیا

اریشہ راج ــــــــ کراچی

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

محسن عزیز ــــــــ لاہور

ذرے جو گل ہیں وہ بن گئے بگولے
جو زینت چمن تھے وہ خاک رہ گزر ہیں
غم خانہ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری
اک ناشنیدہ اف ہیں اک آہ بے اثر ہے

ملیحہ کاشف ــــــــ ٹنڈوالہ یار

جو دل کو اچھا لگتا ہے اسی کو دوست کہتا ہوں
منافق بن کر رشتوں کی سیاست نہیں کرتا

......☆......

ثریا اقبال

کچن

بادامی قورما

اجزا

چکن (آٹھ ٹکڑے)	: ایک کلو
پیاز (تلی اور پسی ہوئی)	: آدھا کپ
خشخاش	: ایک کھانے کا چمچ
کھوپرا (پسا ہوا)	: دو کھانے کے چمچ
بادام (چھلے اور پسے ہوئے)	: دس عدد
تیل	: ایک کپ
مکس گرم مسالا	: ایک کھانے کا چمچ
ادرک لہسن کا پیسٹ	: ایک کھانے کا چمچ
نمک	: ڈیڑھ چائے کا چمچ
لال مرچ (پسی ہوئی)	: تین چائے کے چمچ
دھنیا (پسا ہوا)	: ڈیڑھ چائے کا چمچ
دہی	: ڈیڑھ کپ
جائفل (پسی ہوئی)	: آدھا چائے کا چمچ
جاوتری (پسی ہوئی)	: آدھا چائے کا چمچ
الائچی (پسی ہوئی)	: آدھا چائے کا چمچ
بادام (فرائی کیے ہوئے)	: گارنش کے لیے
کیوڑا	: تھوڑا سا

ترکیب: پہلے خشخاش، کھوپرا اور بادام کو ملا کر گرائینڈ کر کے پیسٹ بنائیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ اب ایک کپ تیل گرم کر کے اس میں مکس گرم مسالا، ادرک لہسن کا پیسٹ، چکن، نمک، پسی لال مرچ اور پسا دھنیا شامل کر کے اچھی طرح فرائی کر لیں۔ پھر تھوڑا پانی ڈال کر ڈھکیں اور دس منٹ کے لیے پکا لیں۔ اب اس میں دہی کے ساتھ تیار پیسٹ، جائفل، جاوتری، الائچی، گرم مسالا اور پیاز ڈال کر پندرہ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔ آخر میں کیوڑا شامل کر دیں۔ پھر فرائی کیے ہوئے بادام سے گارنش کر کے سرو کریں۔

چکن وائٹ قورما

اجزا

چکن	: ایک عدد (بارہ حصوں میں کٹا ہوا)
دہی	: دو کپ
پیاز	: تین عدد (بڑی کٹی ہوئی)
لہسن کا پیسٹ	: ایک کھانے کا چمچ
ادرک کا پیسٹ	: ایک کھانے کا چمچ
ثابت گرم مسالا	: دو کھانے کے چمچ
کیوڑا	: دو کھانے کے چمچ
نمک	: ایک چائے کا چمچ
ثابت لال مرچ (گول)	: بیس عدد
ہلدی پاؤڈر	: ایک تہائی چائے کا چمچ
ادرک (باریک کٹی ہوئی)	: تین کھانے کے چمچ
آئل	: ایک تہائی کپ
پانی	: حسب ضرورت

ترکیب: گول لال مرچ کو کاٹ کر اس کے بیج نکالیں اور چھلکا کسی دوسرے استعمال کے لیے رکھ لیں پھر بیج کو باریک پیس لیں۔ اب تیل گرم کر کے پیاز فرائی کریں۔ گولڈن براؤن ہونے پر پیاز نکال کر نچوڑ لیں اور باریک پیس لیں۔ اس تیل میں ادرک اور لہسن دو منٹ تک فرائی کریں۔ پھر مرغی ڈال کر تیز آنچ پر دس منٹ تک بھونیں۔ اس کے بعد ثابت گرم مسالا ڈال کر دو منٹ تک بھونیں۔ اب نمک، مرچوں کے پسے ہوئے بیج، ہلدی اور پانچ کپ پانی شامل کر کے ابال آنے پر ڈھکن رکھ کر دھیمی آنچ پر بیس منٹ تک پکائیں۔ ڈھکن ہٹا کر پھینٹا ہوا دہی شامل کر دیں اور تیز آنچ پر پانچ منٹ تک پکائیں۔ اب پسی ہوئی پیاز اور کیوڑا شامل کر کے مزید دس منٹ تک پکا کر اتار لیں۔ اوپر سے باریک کٹی ہوئی ادرک ڈال کر پیش کریں۔

والنٹ چکن

اجزا

چکن (بغیر ہڈی بوٹیاں) : دو سو گرام
اخروٹ کی گری : آدھی پیالی
نمک : حسب ذائقہ
چینی : ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ : حسب ذائقہ
سنگھاڑے (ابلے ہوئے) : دس بارہ عدد
شملہ مرچ کے کیوبز : آدھی پیالی
پیاز کے کیوبز : آدھی پیالی
چکن کی یخنی : ایک پیالی
سویا ساس : ایک کھانے کا چمچ
کوکنگ آئل : چار کھانے کے چمچ

ترکیب: کوکنگ آئل کو گرم کر کے اس میں اخروٹ کی گری کو فرائی کر کے نکال لیں پھر ابلی ہوئی چکن ڈال کر فرائی کریں اور ساتھ ہی سنگھاڑے، شملہ مرچ اور پیاز شامل کر دیں۔ تین سے چار سنگھاڑوں کو چار کھانے کے چمچ یخنی کے ساتھ بلینڈ کر کے رکھ لیں۔ علیحدہ پین میں یخنی، سویا سوس، نمک، کالی مرچ ڈال کر پکائیں۔ پھر چکن اور سبزیوں والا آمیزہ ڈال کر مکس کریں۔ سنگھاڑے کا تیار کیا ہوا مکسچر ڈال کر گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ تیار ہونے پر گرم گرم سرو کریں۔

سادہ پسندے

اجزا

پسندے : ایک کلو
پیاز بڑی : 1 عدد
لہسن پسا ہوا : ایک بڑا چمچ
دہی : ایک کپ
نمک، مرچ، دھنیا : حسب خواہش
گرم مسالا پسا ہوا : آدھا چائے کا چمچ
ادرک : ایک ٹکڑا کاٹ لیں
گھی : ایک بڑا چمچ
پانی : آدھا کپ

ترکیب: گھی گرم کریں۔ ایک پیاز پیس لیں اور گھی میں سرخ کر لیں۔ لہسن، نمک، مرچ، دھنیا، ادرک ڈالیں۔ پسندے ڈال کر پانی ملائیں خوب گل جائیں تو دہی ڈال کر بھون لیں۔ گرم مسالا ڈال کر اتار لیں، سادے بھنے ہوئے پسندے تیار ہیں۔

دودھ دلاری

اجزا

دودھ : ایک لیٹر
ونیلا کسٹرڈ پاؤڈر : دو کھانے کے چمچ
انناس : چار سلائس
چم چم : دس عدد (چھوٹے سائز میں)
رنگین سویاں : دو کھانے کے چمچے
جیلی (دو رنگ کی) : آدھا پیکٹ (الگ الگ کر لیں)

[illegible] : پچھتر گرام
[illegible] : چار عدد
[illegible] : دو عدد
[illegible] : آدھا پاؤ
[illegible] : دو عدد
تازہ کریم : آدھا پاؤ

ترکیب: سب سے پہلے جیلی کے آدھا آدھا پیکٹ الگ پکا لیں اور جمنے کے لیے رکھ دیں۔ چم چم کو گرم پانی میں ڈال کر اس کا شیرہ نچوڑ دیں۔ تمام فروٹس کو آدھے انچ کے سائز میں کاٹ لیں۔ دودھ کو ابال کر اس میں رنگین سویاں ڈال دیں اور پتیلی ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ سویاں گل جائیں تو کسٹرڈ پاؤڈر کو آدھی پیالی پانی میں گھول کر دودھ میں ملا دیں اور چینی بھی ڈال دیں۔ ابال آنے پر چولہے پر سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں۔ پھر اس میں تمام فروٹس چم چم، تازہ کریم اور جیلی بھی ملا دیں۔ فریج میں ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

کھویا ملائی کھیر

اجزاء

چاول (ابال لیں) : چوتھائی کپ
کھویا : آدھا کپ
بادام : دس سے بارہ عدد
کریم : ایک کپ
دودھ : ایک لیٹر
بادام : گارنش کے لیے
چینی : حسب ذائقہ

ترکیب: ساس پین میں دودھ ڈال کر پکائیں، ابال آجائے تو اس میں چاول ڈال کر مزید پکائیں، اتنی دیر تک پکائیں کہ دودھ کی مقدار آدھی رہ جائے۔ اس میں کھویا، بادام کا پیسٹ اور چینی ڈال کر پکائیں۔ کھیر گاڑھی ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں۔ ٹھنڈی ہو جائے تو کریم مکس کر کے سرونگ باؤل میں نکال کر فریج میں رکھ دیں۔ مزے دار کھویا ملائی کھیر تیار ہے۔ ٹھنڈی ہو جائے تو بادام سے گارنش کر کے پیش کریں۔

اخروٹ کا حلوہ

اجزا

اخروٹ (چھلے اور باریک کٹے ہوئے) : دو پیالی
تیل : ایک پیالی
چھوٹی الائچی : آٹھ عدد
کھویا : ایک پیالی
چینی : دو پیالی
سوجی : آدھی پیالی (بھنی ہوئی)
بادام پستے : حسب ضرورت

ترکیب: کڑاہی میں تیل گرم کر کے چھوٹی الائچی ڈالیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو اس میں اخروٹ شامل کر کے ہلکا سا بھون لیں۔ پھر کھویا، چینی اور سوجی ڈال کر مزید پانچ سے دس منٹ بھونیں۔ اس کے بعد تھالی میں چکنائی لگا کر حلوہ پھیلا دیں۔ اوپر سے تھوڑا کھویا، بادام اور پستے ڈال کر سرو کریں۔

کافی بنانا اسموتھی

اجزاء

کیلے (چھلے ہوئے) : دو عدد
دودھ : ڈیڑھ کپ
دہی : پانچ کھانے کے چمچ
کافی : ایک چائے کا چمچ
دار چینی : ایک چوتھائی چائے کا چمچ
برف (کٹی ہوئی) : ایک کپ
چینی : دو کھانے کے چمچ
کیلے : گارنش کے لیے

ترکیب: بلینڈر میں کیلے، دودھ، دہی، کافی، دار چینی، برف اور چینی ڈال کر بلینڈ کریں۔ آخر میں

سنگھار

شہلا مشتاق

آپ کے چہرے کا سب سے حساس حصہ آنکھوں کے اردگرد کا ہوتا ہے۔ آنکھوں کے گرد کی اسکن بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مختلف میک اپ واسکن کیئر مصنوعات آنکھوں کے قریب کی جلد کو نقصان پہنچا دیتی ہیں۔ آنکھوں کے گرد کی یہ جلد سرخ ہو جاتی ہے، میک اپ پروڈکٹس آنکھوں میں کھجلی ہو جانے، دانے ہو جانے یا آنکھوں سے پانی بہنے جیسے مرض کی وجہ بن رہی ہوتی ہیں۔ ان تمام مسائل کے بارے میں ایک مشہور ڈرمالوجسٹ ڈاکٹر ہرشنا بجلانی اور ایک آنکھوں کے ڈاکٹر زین خاطب نے کچھ اہم باتیں بتائی ہیں جن پر عمل کر کے آپ آنکھوں کو مختلف مسائل اور بیماریوں سے بچا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر خاطب کا کہنا ہے کہ جدید میک اپ پروڈکٹس میں ایسے کیمیکلز استعمال کیے جا رہے ہیں جو کہ آنکھوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال مسکارا اور آئی لائنرز ہیں۔ ان دونوں پروڈکٹس میں کاربن کا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسکارا اور آئی لائنر دونوں ہی آنکھوں کے پپوٹوں اور پلکوں پر استعمال کیے جاتے ہیں، اس لیے ان کے ذرات آنکھوں میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پلکوں کی جڑوں میں موجود آئل گلینڈز کو بند کر دینے کا باعث بھی بن رہے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ''ڈرائی آئیز''، یعنی آنکھوں کے خشک ہو جانے جیسا طبی مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مسکارا اور آئی لائنر میں موجود کیمیکلز آنکھوں میں جلن، کھجلی اور درد کا باعث بھی بن رہے ہوتے ہیں۔ مشہور ڈرمالوجسٹ ڈاکٹر ہرشنا بجلانی کا کہنا ہے کہ خواتین کو میک اپ واسکن کیئر پروڈکٹس خریدتے وقت ان کے اجزاء ضرور دیکھنے چاہئیں۔ ایسی مصنوعات جن میں الکوحل، اسٹر ائڈز، دھاتی اجزاء جیسے نکل اور کروم وغیرہ موجود ہوں، خواتین کو چاہیے کہ وہ ایسی مصنوعات خریدنے سے گریز کریں، کیونکہ بیوٹی ایکسپرٹس کے مطابق میک اپ پروڈکٹس میں موجود یہ تمام اجزاء آنکھوں کی مختلف بیماریوں کا باعث بن رہے ہیں۔

ڈاکٹر ہرشنا کا مشورہ ہے کہ کچھ پروڈکٹس میں پیرابینز اور بینز لکونیم کلورائیڈ موجود ہوتے ہیں، یہ دونوں کیمیکلز دراصل ان مصنوعات کو جلدی خراب ہونے سے بچاتے ہیں اور مصنوعات کے محافظ سمجھے جاتے ہیں تاہم یہ آنکھوں کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ہیں، اگر ان کے چند ذرات آنکھوں میں چلے جائیں تو آنکھوں میں جلن کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے آنکھیں لال ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح گلیٹر (چمک) والے آئی شیڈز بھی دھیان سے استعمال کرنے چاہئیں کیونکہ اس کے چھوٹے چھوٹے ذرات بھی آنکھوں میں جا کر کورنیل اپی تھیلیل ٹشوز کو نقصان پہنچا رہے ہوتے ہیں، یوں یہ چمکیلے آئی شیڈز استعمال کرنے والی خواتین کی آنکھوں میں انفیکشن ہو جاتا ہے، ان کی آنکھیں سوج جاتی ہیں، تاہم انہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ سب چمکیلے میک اپ آئی شیڈز کا کارنامہ ہے۔

کیلوں سے گارنش کر کے سرو کریں۔

کافی اینڈ وال نٹ آئسکریم

اجزاء

انسٹنٹ کافی پاؤڈر : ایک کھانے کا چمچ
گرم پانی : ایک کھانے کا چمچ
جیلاٹن : دو کھانے کے چمچ (گرم پانی میں حل کیا ہوا)
گاڑھی کریم : ڈیڑھ پیالی
کڑھا ہوا دودھ : ایک سو پچیس گرام
اخروٹ (کترے ہوئے) : آدھی پیالی
چینی : ایک سو پچیس گرام

ترکیب: کاڑھے ہوئے دودھ کو ہلکی آنچ پر ابالیں۔ کافی کو کھانے کے ایک چمچ گرم پانی میں گھول لیں۔ ابلتے ہوئے دودھ میں جیلاٹن، کافی اور چینی شامل کریں۔ مرکب کو جھاگ دار ہونے تک پھینٹ لیں۔ مرکب کو ٹھنڈا کر کے اس میں کریم شامل کریں۔ فریج میں ٹھنڈا کرنے کے بعد فریزر میں منتقل کر دیں۔ ایک گھنٹے بعد فریزر سے نکالیں اور خوب پھینٹ لیں۔ اخروٹ شامل کریں اور جمنے کے لیے فریز کر دیں۔

ڈرائی فروٹ ٹارٹ

اجزا

انڈے کی زردی : ایک عدد
مکھن : ایک سو بارہ گرام
میدہ : ایک سو آٹھ گرام
چینی (باریک پسی ہوئی) : چھپن گرام
ونیلا ایسنس : چند قطرے
انڈے : دو عدد
پستے (چوپ کیے ہوئے) : ایک کھانے کا چمچ
اخروٹ (چوپ کیا ہوا) : ایک کھانے کا چمچ
دار چینی : ایک چوتھائی چائے کا چمچ
کشمش : دو کھانے کے چمچ
کینو کے چھلکے (کھرچے ہوئے) : دو کھانے کے چمچ
بادام : دو کھانے کے چمچ
گلیزڈ چیریز : دو کھانے کے چمچ
کشمش (بڑی والی) : دو کھانے کے چمچ
جام : تین کھانے کے چمچ

ترکیب: ایک پیالے میں مکھن، چینی اور ونیلا ایسنس ڈال کر جھاگ اوپر آنے تک پھینٹیں۔ اس میں انڈے کی زردی شامل کر کے مزید پھینٹیں اور پھر میدہ ڈال کر لپیٹ لیں۔ اس آمیزے کو نرم گوندھیں اور پھر روٹی بیل لیں۔ گول کٹر کی مدد سے اس کو گول گول کاٹ کر ٹارٹ ٹرے میں رکھ دیں۔ پیالے میں کشمش، کینو کے چھلکے، اخروٹ، سرخ چیریز، ہری چیریز، بڑی کشمش، پستے، دار چینی، بادام اور انڈے ڈال کر ملائیں۔ ہر ٹارٹ میں ایک کھانے کا چمچ آمیزہ بھر کر ڈالیں۔ ٹارٹ کی ٹرے کو پہلے سے گرم اوون میں ایک سو اسی ڈگری پر بیس منٹ پکا کر نکال لیں۔ ہر ٹارٹ کے منہ پر جام لگائیں اور پستے چھڑک کر پیش کریں۔

ڈرائی فروٹ شیک

اجزاء

کھجور : چھ عدد
انجیر : چار عدد
بادام : چھ عدد
پستے : چھ عدد
کاجو : چھ عدد
گرم دودھ : آدھا لیٹر
براؤن شوگر : دو کھانے کے چمچ

ترکیب: پہلے کھجور، انجیر، بادام، پستے اور کاجو کو باریک کاٹ لیں۔ اب انہیں بلینڈر میں گرم دودھ اور براؤن شوگر کے ساتھ ڈال کر بلینڈ کر لیں۔ گلاس میں ڈال کر پیش کریں۔ ☆☆

کسی بھی فاؤنڈیشن کو آنکھوں کے گرد استعمال کرنا ہو تو پہلے اسے تھوڑا سا لگا کر چیک کر لیا جائے کہ کہیں اس کی وجہ سے آنکھوں کے گرد کی جلد لال تو نہیں ہو رہی یا اس کی وجہ سے جلد پر الرجی تو نہیں ہو رہی، اگر چیک کرنے کے بعد ایسا محسوس ہو کہ آپ کو اس فاؤنڈیشن سے الرجی ہو رہی ہے تو پھر اس فاؤنڈیشن کو ہرگز آنکھوں کے ارد گرد استعمال نہ کریں۔

یہ بات سب لڑکیاں جانتی ہیں کہ نقلی پلکوں کو چپکانے کے لیے "آئی لیش گلیو" کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس گلیو میں موجود فورملڈ یہائیڈ موجود ہوتا ہے۔ اب اگر نقلی پلکیں لگاتے وقت زیادہ لیش گلیو لگا لیا جائے اور وہ آنکھوں میں چلا جائے تو اس کی وجہ سے آنکھوں میں فوراً انفیکشن ہو سکتا ہے۔ اس لیے کوشش کریں کہ نقلی پلکوں کی سائیڈوں میں زیادہ اور درمیان میں تھوڑا کم گلیو لگائیں تاکہ اس گلیو کے آنکھوں میں جانے کے چانسز کم ہو جائیں۔ اگر نقلی پلکیں لگانے کے بعد آنکھوں میں جلن محسوس ہو رہی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس گلیو میں موجود اجزاء سے آپ کو الرجی ہو رہی ہے لہٰذا آپ کسی اچھے ڈرمالوجسٹ سے رجوع کریں اور میک اپ پروڈکٹس کے سلسلے میں اس سے مشورہ کر لیں۔ اس کے علاوہ اگر خواتین چاہیں تو مارکیٹ میں دستیاب میگنیٹک آئی لیشز استعمال کریں کیونکہ ان لیشز کو گلیو کی مدد سے چپکانا نہیں پڑتا، وہ مقناطیسی کشش کے باعث آنکھوں پر خود ہی چپک جاتی ہیں اور آرام سے اتر بھی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر خاطب کا کہنا ہے کہ لڑکیوں کو چاہیے کہ جب بھی وہ میک اپ پروڈکٹس خریدیں ان کی پیکنگ سنبھال کر رکھیں تاکہ انہیں مدت استعمال یاد رہے، کیونکہ زائد المیعاد میک اپ پروڈکٹس بھی آنکھوں کی مختلف بیماریوں کا سبب بن رہی ہوتی ہیں۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لڑکیوں کے میک اپ باکس میں موجود مسکارے اور آئی لائنرز سالوں اسی میں موجود رہتے ہیں۔ جب تک وہ ختم نہیں ہو جاتے لڑکیاں دوسرا مسکارا یا آئی لائنر خریدتی نہیں ہیں، جب کہ اس مسکارے کو استعمال کرنے کی مدت ختم ہو چکی ہوتی ہے اور لڑکیاں بے خیالی میں اسے ہی استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اس دوران انہیں کئی مرتبہ یہ شکایت بھی ہوتی ہے کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے لیکن وہ اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دیتیں کہ ایسا زائد المیعاد میک اپ پروڈکٹس استعمال کرنے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اپنی بہن یا کسی دوست کی پینسل وغیرہ استعمال نہ کریں۔ کئی مرتبہ میک اپ برشز کو نہ دھونے کی وجہ سے ان میں بیکٹریا جمع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بھی آنکھوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ کسی کو اپنی کاجل پینسل، آئی لائنرز اور مسکارا دیں۔ آئی پینسل کو چھیل کر استعمال کریں تاکہ اس کی نوک آنکھوں میں نہ چبھ سکے۔

ڈاکٹر خاطب کے مطابق اگر کسی کو میک اپ ریموور خریدنا ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ آئل ہیڈ یا کریم والا میک اپ ریموور خریدیں کیونکہ اس کی مدد سے آئی شیڈز وغیرہ آسانی سے صاف ہو جاتے ہیں اور پلکوں کے خلیات بھی بند نہیں ہوتے۔ بعض اوقات کاجل پینسل کی نوک پر موجود جراثیم آنکھوں تک منتقل ہو جاتے ہیں، ایسا بھی ہوتا کہ چہرے پر اگر فاؤنڈیشن لگا لیا جائے تو یہ ہی فاؤنڈیشن زیادہ لگانے کی وجہ سے آنکھوں کے قریب کی جلد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میک اپ ریموول جن میں ریٹینول موجود ہوتا ہے وہ آنکھوں کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہے ہوتے ہیں اور ان تمام چیزوں کی وجہ سے آنکھوں کو پہنچنے والے نقصان کے بارے میں خواتین کو پتا بھی نہیں چلتا۔

.....☆.....